سلسلۂ مطبوعات بہادر یار جنگ

سوانح

بہادر یار جنگؒ

از

نذیر الدین احمد بی۔او۔ایل (عثمانیہ)

ناشر

بہادر یار جنگ اکیڈمی

حیدر آباد۔ آندھرا پردیش (انڈیا)

8292

سلسلۂ مطبوعات بہادر یار جنگ (۳)

سوانح

بہادر یار جنگؒ

از

نذیر الدین احمد، بی۔او۔ایل (عثمانیہ)

ناشر

بہادر یار جنگ اکیڈمی

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش (انڈیا)

قیمت: ---- -/۶۰ روپیے

نام کتاب ـــــــــ سوانح بہادر یار جنگ جلد سوم

طبعِ اوّل ـــــــــ ۱۰۰۰ ہزار

تاریخِ اشاعت ـــــــــ جون سنہ ۱۹۹۰ء

کتابت ـــــــــ محمد عرفان عالم قاسمی

طباعت ـــــــــ گولڈن فوٹو آفسٹ پریس

سرورق ـــــــــ محمد جعفر آرٹسٹ مرحوم و مغفور

قیمت ـــــــــ -/۶۰ روپیے

ملنے کے پتے

حسامی بکڈپو مچھلی کمان حیدرآباد، فون: ۵۲۲۲۸۵

الکتاب میور کامپلکس گن فاؤنڈری۔ فون: ۲۳۷۸۶۴/۷

(ناشر)

بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد

ایوانِ عرفان A/8/1/37 4-6-13 ۔ بہادر یار جنگ کالونی
قادر باغ ۔ حیدرآباد ۸ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ ۔ آندھرا پردیش (انڈیا)

انتساب

زیر نظر کتاب "سوانح بہادر یار جنگ جلد سوم" کو قائدِ ملت کے شیدائی ڈاکٹر معین الدین خاں سانڈوزی صاحب کے نام معنون کرنے کی دلی مسرت حاصل کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کا پُرخلوص اصرار اور ان کے مالی تعاون کے بغیر ہماری اپنی خواہش کا یہ چراغ دِل ہی دل میں بُجھ گیا ہوتا۔

قائدِ ملت سے ان کی والہانہ عقیدت کی بنا پر انہوں نے مالی اور اخلاقی مدد کے ذریعے اس کام کے سِلسلے میں راہیں ہموار کیں۔ سچ ہی تو ہے کہ ؎

اہلِ دل بے وفا نہیں ہوتے

تب ہی تو:

یہ حاصلِ وفا ہے کمالِ ہنر نہیں

نذیر الدین احمد

سوانح بہادر یار جنگ سوانح نگار

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہار تشکر

بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد کی جانب سے نئے سلسلۂ مطبوعات کی تیسری کتاب سوانح بہادر یار جنگ جلد سوم الحمدللہ اب آپکے زیرِ نظر ہے، جلد اول و دوم کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور اردو اکیڈیمی حیدرآباد اور بہار اردو اکیڈیمی نے انعامات سے نوازا۔

محترم فضیل جعفری نے بلٹز (۱۰ ر ڈسمبر ۱۹۸۸ء) میں دو اہم کتابیں کے زیر عنوان تبصرہ فرماکر اپنے اس گراں قدر تبصرے کو اس جملہ پر ختم فرمایا کہ "اردو کے سوانحی ادب میں اس کتاب کی اپنی ایک انفرادی حیثیت ہے"۔ نواب عابد علی خاں صاحب (سیاست) کا تعارف میرے لئے موجبِ عزت افزائی ہے۔

جناب وقارالدین صاحب مدیر روزنامہ رہنمائے دکن نے سوانح بہادر یار جنگ کے ترجمے کیلئے دس ہزار روپئے کا گراں قدر عطیہ دیا، مولوی عبدالرحمٰن سعید، سعید صدیقی جیسی قابلِ احترام ہستی نے ترجمے کے کام کی ذمہ داری قبول فرمائی، بڑی حد تک کام تکمیل کی منزل میں ہے۔

پربھنی کے سرسید جناب رشید انجنیئر نے سوانح بہادر یار جنگ سے متاثر ہوکر پربھنی میں ۱۶ ر ۱۷ ر جنوری ۱۹۸۸ء کو راقم الحروف کی صدارت میں ایک یادگار جلسہ یومِ قائد ملت منعقد کیا اور بہادر یار جنگ لائبریری کی بنیاد رکھی، چن پٹن کے معروف بزرگ شخصیت غلام مہدی باپو بخاری (چن پٹن، بنگلور) نے ۲۷ ر مارچ ۱۹۸۸ء کو چن پٹن میں ایک یادگار عظیم الشان جلسہ منعقد کرکے اکابرین و عمائدین و وزراء کی موجودگی میں ۱۰ ہزار روپئے کیسہ زر پیش کیا، اور اس طرح میری عزت افزائی فرمائی۔ میرے استاد زادے جناب سید علی صاحب ید اللّٰہی نے حلقہ مشیرآباد میں اپنے اثر سے تقریباً پندرہ ہزار روپے کی کتابوں کی نکاسی فرماکر اس اہم قومی کام میں میری مدد فرمائی۔ گولڈن آفسیٹ پریس

اور حُسامی بکڈپو کے مالکان کی شخصی دلچسپی کارِ مشکل کو آسان بنانے میں معاون رہی۔

مولوی قادر خاں صاحب کی خصوصی دلچسپی اور معاونت از ابتدا تا انتہا شریکِ حال رہی آخر میں ہم حسب ذیل افراد اور اداروں کے ممنون ہیں جن کی مالی معاونت کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ ذَکَرَاللّٰہُ بِخَیْرٍ مَنْ ذَکَرَنِیْ۔ (جس شخص نے مجھے یاد کیا اللہ اس کو بھی بھلائی کے ساتھ یاد کرے)

ادارہ جات :- (۱) بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی ۲۰ ہزار (۲) مرکزی انجمنِ مہدویہ حیدرآباد ۵ ہزار (۳) بہادر یار جنگ ہال ٹرسٹی بورڈ ۵ ہزار (۴) صدر معلمہ صاحبہ درشہوار گرلس ہائی اسکول ایک ہزار پانچ سو (۵) کل ہند مرکزی تعمیر ملت حیدرآباد پانچ سو۔

جناب ڈاکٹر معین الدین خاں صاحب ساندوزی ۱۰ ہزار، جناب قادر خاں صاحب، جناب وحیدالدین خاں صاحب یوزئی، جناب فاروق سیف الدین صاحب۔ جناب راشد علی خاں صاحب امریکہ، جناب رفیق مہدی خاں صاحب فی کس ۵ ہزار جناب ارشد علی صاحب امریکہ دو سو ڈالر، جناب ذوالفقار علی خاں صاحب ۱۰۰ ڈالر، جناب نواب بہادر خاں صاحب ایک ہزار ایک سو، افتخار مہدی خاں صاحب، ڈاکٹر محبوب خاں صاحب، جناب عبدالوہاب خاں صاحب، جناب حیدر محمد خاں صاحب امریکہ، جناب ڈاکٹر محبوب علی خاں صاحب، جناب ڈاکٹر جعفر علی خاں صاحب، سید علی اکبر صاحب، سید حمزہ صاحب عنبر پیٹ پٹرول پمپ، جناب جسٹس سردار علی خاں صاحب، حور بانو صاحبہ فی کس ایک ہزار۔ جناب کرم علی خاں صاحب کنیڈا سات سو، نواب حیدر علی خاں صاحب، نواب امیر علی خاں صاحب مرحوم، جناب سردار محمد خاں صاحب، جناب ابو الخیر صدیقی ایڈوکیٹ مرحوم فی کس پانچ سو ——— بفضلِ تعالیٰ قائد ملت کی ایک مکمل سوانح حیات نصف صدی (۵۶ برس) کے بعد منظرِ عام پر آسکی۔

سَودائے جبیں سائی میرے سَر ہوا تو کیا
اس پائے کا جہاں میں کوئی آستاں نہیں

اسیرِ گیسوئے اُردو

حصولِ آزادی کے کچھ عرصہ قبل ہی سے یکایک ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت ہندوستانی تہذیب اور بیں التہذیبی پہلو کی حامل اردو زبان کی مخالفت میں ایک سیاسی محاذ قایم ہوگیا اور حصولِ آزادی کے بعد تو یہ سلسلہ عصبیّت کی علامت کے طور پر پوری طرح ابھرا اور اقلیتوں کے مطالبات میں اردو سے انصاف کا مطالبہ ایک مستقِل باب بن گیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تنگ نظر فرقہ پرست اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ کوئی جاندار زبان کسی کے بنائے کبھی بنی ہے اور نہ بن سکتی ہے۔ یہ قومی بدبختی ہے کہ ہندی اور اُردو کو تنگ نظر فرقہ پرست سیاستدانوں نے ایک دوسرے کا حریف بنا کر سیاست کے دنگل میں کھڑا کر دیا۔ اس خصوص میں قومی قاید اور مادری زبان کے محافظ کی حیثیت سے قایدِ ملّت نے اس زبان کی قومی حیثیت کو منوانے میں بھرپور حصّہ لیا۔ ویسے " اردو زباں و ادب پر حیدر آباد ہی نہیں ہندوستان (برصغیر) کے اس بے مثل و بے نظیر خطیب نے جو نقوش چھوڑے ہیں ان کی چکاچوند ابھی آنکھوں میں باقی ہے ——— الفاظ کی صنعت گری اور مطالب کی بلند پروازی کو وہ اپنی تقریروں میں عجیب ساحرانہ انداز سے سمویا کرتے تھے۔ اقبال کے اس فقیر بے نوا نے اپنی متاعِ عزیز کو یوں

بے غل وغش لٹایا کہ ادب و زبان کے گلچینوں کو تنگیٔ داماں کی شکایت رہ گئی۔"

(حوالہ: ہمارا قاید از مولوی محمد احمد خاں ص ۲۲)

اردو زبان سے ان کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہوں یا پرائے اگر کوئی ذرّہ برابر بھی اس بات سے بے اعتنائی برتتا تو ان کی طبیعت مکدر اور ان کا مزاج بے مزہ ہو جاتا اور ساتھ ہی ان کا قلم نوکِ نشتر بنجاتا۔ اس خصوص میں ان کے نوک نشتر کی جراحت کے یہ چند نمونے اردو کی رگ جاں سے ان کے تعلق خاطر کی گواہی دیتے ہیں۔

نائب معین امیر جامعہ کو ایک دعوت نامے کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "اردو زبان کے واحد علمی مرکز جامعہ عثمانیہ کے نائب معین امیر کا مغربی زبان میں لکھا ہوا دعوت نامہ علوم مشرقیہ کی کانفرنس کیلئے پہنچا۔ پڑھ کر سخت تکلیف ہوئی ؎ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل خط نمبر ۱۲۸ ص ۱۸۰)

اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ جامعہ عثمانیہ کے اطلاع نامہ جات اردو کے سوا کسی اور زبان میں شائع ہوں۔ مقررین اگر انگریزی میں تقریر کرتے ہیں تو ان کی یہ مجبوری معاف کی جاسکتی ہے لیکن جامعہ کی مراسلت بہرحال اردو میں ہونا چاہیئے۔

(مکاتیب بہادر یار جنگ ص ۵۰۷ خط ۴۹۴ جلد اوّل۔

سکریٹری مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن راولپنڈی کے جوابی خط میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"سب سے پہلے تو مجھے اس کی شکایت ہے کہ ہم سب کانگرس سے گلہ کرتے ہیں کہ وہ ہماری زبان اُردو کو ختم کرنا چاہتی ہے اور خود پنجاب سے مجھے ایک سات دریا پار کی زبان میں لکھے ہوئے خطوط پہنچتے ہیں جس کو اُردو کا مرکز کہنا چاہیئے۔"

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول خط نمبر ۲۱۴ ص ۲۵۱)

سردار اورنگ زیب خاں صدر اعظم صوبہ سرحد بھی نواب صاحب کے نوکِ نشتر سے نہ بچ سکے "آخر میں ایک چھوٹی سی شکایت ..... کہ لیگ کی ہائی کمانڈ کے ایک رکن اور لیگی وزارت کے ایک وزیر اعظم کا خط ایک اُردو کے خادم کی طرف انگریزی میں آنا، اُردو زبان کی ایسی توہین ہے جس کا دعویٰ آپ ہی کے اجلاس پر پیش ہونا چاہیئے۔

حوالہ: خط نمبر ۱۴۴ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل

قاید ملت اردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب کا بین التہذیبی پہلو خیال فرماتے جس کی حفاظت کو وہ مقصد اور فرض متصور کرتے۔

"وہ مرکز جہاں دو تہذیب، دو نصب العین، دو فرقوں یعنی ہندو اور مسلمان کو یکجا کرتے ہیں وہ اُردو ہے۔ میں اس بین التہذیبی پہل کی ہر ممکنہ حفاظت چاہتا ہوں۔ ہر ہندو اور مسلمان کو چاہیئے کہ اس مقصد کے لئے خود کو وقف کر دے۔

(حوالہ: بہادر یار جنگ کی سیاسی تقاریر از نذیر الدین احمد ص ۵۵۶، ۵۵۷۔)

مملکتِ حیدر آباد کی سرکاری زبان اُردو رہی۔ ۱۶ ضلعوں میں تعلیمی اداروں میں ابتدائے دسویں جماعت تک اور خود کالج اور جامعہ (جامعہ عثمانیہ) میں بھی اردو ذریعۂ تعلیم رہا۔ لیکن مراسلتِ دفتری میں انگریزی کاروائج چل رہا تھا۔ اس خصوص میں وہ سخت احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

میں اُردو کے کعبہ سے کہہ رہا ہوں —— پروفیسر ہاروں خاں شیروانی، جہاں آپ اُردو پڑھانے کیلئے آئے تھے وہاں اردو کے گلے پر چھری پھیری جارہی ہے۔ چند ایسے افراد جو پروردہ آغوش انگریزی

تھے ان کا قلم سیدھی طرف سے چلنے کے بجائے الٹی طرف سے چلنے لگا، گویا اُلٹی گنگا بہنے لگی۔ میں حکومت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی پیشانی سے اُردو کے قتل کا دھبّہ مٹائے اور اردو کو صحیح معنوں میں اردو بنائے۔

(بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقریریں از نذیرالدین احمد ص ۱۰۶، ۱۰۷)

نہ صرف امور دستوری، تعمیرات، صنعت و حرفت انتہا یہ کہ جامعہ عثمانیہ اور تعلیمات کے محکمہ جات میں بھی یہ سلسلہ چل رہا تھا، اس خصوص میں نواب صاحب اپنے ایک اہم سیاسی خطبہ میں بڑی سختی سے ارباب متعلقہ کو متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"زباں کو ہر ملک اور ملّت میں جو تہذیبی اہمیّت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، سلطنت حیدرآباد کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا ہے۔ یہ بات اب ملک میں نہایت بے چینی کے ساتھ محسوس کی جانے لگی ہے کہ محکمہ جات سرکاری جن کو حکومتی زبان کا سب سے بڑا محافظ ہونا چاہیئے اس کی تخریب اور تباہی کے درپے ہے۔ کتنے ہی ایسے محکمے ہیں جن کی زبان رفتہ رفتہ انگریزی ہوتی جارہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔

ع چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی! برٹش انڈیا کے سیولیں یا صوبہ سرحد کے فوجی عہدیداروں کی طرح وہ بقدر ضرورت اُردو سیکھ لیں اور کسی انگریز عہدہ دار کا انتخاب حیدرآباد کے عہدہ پر اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک وہ اُردو سے واقف نہ ہو جائیں۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب کہ حیدرآباد میں اُردو، مدارس کی کتابی زبان بن کر رہ جائے گی۔

(خطبات بہادر یار جنگ از نذیرالدین احمد ۱۳۰-۱۳۱)

مشترکہ کلچر کے مسئلہ میں اردو کے افادی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کا مسئلہ، ہندوستان کے مشترکہ کلچر کا مسئلہ ہے اس وسیع و عریض ملک میں جہاں دو مختلف مذاہب اور مختلف تہذیب رکھنے والی قومیں آباد ہیں، اُردو زبان ہی وہ نقطۂ اتحاد ہے جو ان دونوں قوموں کو تاریخ کے کسی دَور میں ایک مرکز پر جمع کر سکتا ہے ——— اُردو حیدرآباد کی سرکاری زبان ہے اور رفتہ رفتہ بین الاقوامی اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انگلستان، جرمن، جاپان اور ترکی کی لاسلکی مراکز جب ہندوستان کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو اردو زبان میں مخاطب کرتے ہیں لیکن اردو زبان کی اہمیت کو اگر کہیں گھٹایا جا رہا ہے اور دوسروں کے نہیں خود حیدرآبادی حکومت کے ہاتھوں گھٹایا جا رہا ہے۔ سر رشتہ تعلیمات نے جہاں تک دیہاتی مدارس میں ابتدائی تعلیم مادری[1] زبان میں رکھی ہمیں اعتراض نہ ہوا۔ لیکن اب بعض قیود اور بندشوں کے ساتھ ثانوی مدارس میں بھی مادری زبان کو رواج دینے کا رجحان روبہ ترقی ہے جس کو ہم قطعاً برداشت نہیں کر سکتے ——— اس سے بڑھ کر غضب یہ کہ صدر اعظم بہادر کے اُردو داں شرکار یعنی وزرائے حکومت

---

[1] (نوٹ) یہاں لفظ مادری زبان سے مراد تلنگی مرہٹی اور کنڑی زبانیں ہیں۔ مملکت حیدرآباد کے ۱۶ ضلعوں میں اُردو علاقائی زبان تھی لیکن ابنائے ریاست کے تلنگانہ علاقے میں رہنے والوں کی مادری زبان تلگو تھی مرھٹواڑہ میں رہنے والوں کی زبان مرہٹی، کرناٹک کے رہنے والوں کی زبان کنڑی تھی۔"

اپنی مادری زبان پر غیر زبان کو ترجیح دینا باعث افتخار سمجھتے ہیں ۔ اگر یہ کفر کعبہ اُردو ہی سے اٹھنے لگے تو پھر اُردو کا خدا حافظ ہے ۔

(خطبات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیرالدین احمد ص ۳۲۲-۳۲۴)

اُردو زبان کی حفاظت اور سرپرستی کے تعلق سے اپنے خطبہ صدارت میں نواب صاحب نے ارشاد فرمایا :-

"مجلس ان تمام ادبی اداروں کی سرپرستی میں اپنی اخلاقی اعانت کا وعدہ کرے جو زبان اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کر رہے ہیں" اس طرح اردو زبان کی ترویج و ترقی کا پروگرام مجلس کے مقاصد کا جز بنا، کیونکہ نواب صاحب اپنی سیاسی بصارت و بصیرت کی روشنی میں اُردو کے مسئلہ کو اسلامی تہذیب و سیاست کا ایسا سوال سمجھتے تھے جو کسی اور اہم مسئلہ سے کم اہم نہیں ۔

"میں اور مجلس ہندوستان میں اُردو کے مسئلہ کو صرف ایک زبان کا مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اسلامی تہذیب و سیاست کا ایسا سوال سمجھتے ہیں جو کسی اور اہم مسئلہ سے کم نہیں ، یہی وجہ ہے کہ مجلس کا کوئی اجلاس اور میرا کوئی خطبہ اردو زبان کی ترویج و حفاظت کی تائید سے خالی نہیں ہوتا حتی الامکان اردو زبان کی خدمت کرتا رہتا ہوں ۔ انجمن ترقی اردو کے کاروبار میں اگر میں نے عملی حصہ نہیں لیا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کبھی مولوی صاحب (عبدالحق) نے اس کی دعوت نہیں دی اور میں نے بے وجہ ان کے کام میں دخیل ہونا پسند نہیں کیا ۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے مجھ سے آل انڈیا اردو کانگرس کی سرپرستی قبول کرنے کی درخواست کی تو میں نے اس کو محض اُردو زبان کی خدمت سمجھ کر قبول کرلیا ۔ مولوی صاحب (عبدالحق) کے خط سے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہ اس کو بھی اپنے خلاف ایک محاذ تصوّر فرماتے

ھیں! ___________

خط نمبر ۶۰ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل۔

نواب صاحب اردو کی حفاظت و ترقی کو ایک مقدس فریضہ تصوّر فرماتے تھے کیوں کہ اس کا وسیع پس منظر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب سے وابستہ رہا ہے۔

"اردو زبان کی حفاظت و ترقی ہندوستان کا مقدس فریضہ ہے اسی کی حفاظت میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی حفاظت کا راز مضمر ہے، اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں اُردو ہی ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ بنے گی۔"

(حوالہ: خط نمبر ۲۹۳ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل)

ناگپور میں یومِ اردو میں اردو زبان کے افادی پہلو پر نواب صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی اس کے مطالعہ سے اس زبان۔ کے وجود میں آنے کے محرکات اور سماجی مضمرات جس سے اس زبان کے تہذیبی و تمدنی اثرات کے پہلو سامنے آتے ہیں قابلِ غور و قابلِ مطالعہ ہیں۔

"ساری تعریف اس خدا کو سزاوار ہے جس نے انسان کی صورت اور آواز کے ساتھ اس کی زبان کو بھی اپنی نشانی بنایا اور زبان کے اختلاف میں بہت سی حکمتوں کو پوشیدہ رکھا۔"

ہندوستان کی سرزمین جس پر مختلف قومیں آباد ہیں، جن کے مختلف تمدن ہیں۔ ہندوستان کی مختلف قومیں آج تک اپنی تہذیبوں اور کلچروں کو متحد نہ کر سکیں لیکن ہندوستان کسی مقام پر پہنچ کر اگر ایک ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ ایک ہی مقام ہے اور وہ اُردو زبان کا مقام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں اور ملّتوں کے اختلاف کو دُور کرنے اور دوسرے کے نقطۂ خیال کو سمجھنے کے لئے اُردو زبان عالمِ وجود

میں آئی ہے جو فاتحین بیرون ہند سے ہندوستان آئے ان کیلئے ہندوستانیوں کی بولی کو سمجھنا مشکل ہو رہا تھا اور اس مشکل کو حل کرنے کیلئے انہوں نے ایک اچھا طریقہ ایجاد کیا۔ اُردو زبان باہر سے لائی ہوئی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ہندوستان ہی میں ڈالی گئی ہے۔ اگر آپ اردو زبان کے الفاظ کو سامنے رکھیں اور غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان میں عربی، فارسی کے مقابلہ میں ہندی بھاشا کے الفاظ زیادہ ہیں۔ ہر زبان تین کلمات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسم، فعل، حرف، اگر ان تینوں کے لحاظ سے اردو زبان کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ اُردو زبان کے ایک ثلث سے زیادہ الفاظ ہندی بھاشا سے مشتق ہیں۔ اُردو زبان کے سرمایہ کا جب یہ حال ہو تو یہ کہنا کہ وہ باہر سے آئی ہوئی ہے کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔

ہندوستان کی تہذیبی و تمدنی خصوصیات کو اُردو زبان میں ادا کیا جاسکتا ہے یا نہیں، اس کے دیکھنے کے لئے پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی پریم چند کا لٹریچر دیکھنا چاہیئے ——— واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جس عمدگی اور خوبی سے ہندوستانی تہذیبی اور تمدنی رجحانات کو پیش کیا ہے وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اُردو زبان میں جتنی قوتِ جاذبہ ہے اور اس میں الفاظ کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی جو صلاحیّت ہے وہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ اُردو زبان کے دَروازے کو دوسری زبان کے الفاظ کے داخلہ کے لئے ہمیشہ کھلا رہنا چاہیئے۔"

حوالہ: اُردو زبان شائع شدہ ہماری کتابیں حیدرآباد
مارچ، اپریل ۱۹۴۳ء

"زبانِ اُردو مشترکہ تہذیب کی دوسری سب سے بڑی میراث ہے۔ زبانِ اُردو کو غیر ملکی زبان قرار دینا بیسویں صدی کی سب سے بڑی

دھوکہ دہی ہے"۔

"مسٹر گاندھی جیسے مدبر نے یہ بالکل درست کہا کہ حامیانِ اُردو کو چاہیے کہ ہندی سیکھیں۔ ایک دفعہ مسٹر گاندھی نے مجھے ہندی میں خط لکھا تھا جس کا میں نے اُردو میں جواب دیا"

حوالہ: بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقاریر ص ۱۰۱ تا ۱۰۶

مرتبہ نذیر الدین احمد

اُردو کا یہ محافظ آخر دم تک اردو کا نگہبان رہا۔ جب بھی لیلیٰ اُردو پر کوئی افتاد آئی یہ سینہ سپر ہو گئے۔ لیلیٰ اردو کے گیسوئے پریشاں کو اپنے دستِ حکمت سے سنوارا، پھر اپنے قلم، زباں و بیاں سے اس کی نوک پلک کو سنوارا، اور جی جان سے اس کی آن بان کا خیال رکھا۔ ہر قدم پر ہمقدم رہے۔

ان کے نگارخانہ تحریر و تقریر میں ہر سو لیلیٰ اُردو کے جلوے، نگارخانہ دل کو مایل بہ التفات کرتے ہیں اور نطق کی بیچارگی زباں کے بوسوں پر عقیدت کی آخری سانس لینے پر مائِل ہو جاتی ہے۔

خطوط نویسی

کاغذ کے وجود میں آنے سے قبل اور پتھر تانبے موم اور لکڑی پر اپنے مدعا کو تحریر کرنے کے زمانے سے خطوط نویسی کی دلچسپ تاریخ کاغذ کے عالم وجود میں آنے تک مختلف اَدوار سے گذری۔

مغلوں کے آخری دور سے جب لشکری زبان ترکی لفظ کا لبادہ اوڑھ کر اُردو کہلانے لگی تو اس زبان میں بھی بڑی کم مدت میں خطوط نویسی نے وہ جوہر دکھائے کہ اردو خطوط نویسی عرض سخن بھی بنی اور گنجینۂ فن بھی۔ اس کے ہر دو پہلو مقصدی رہے ہیں، ایک تو خطوط انسانی تہذیب کے ارتقاء کی اہم بنیاد ہیں اور دوسرے انسان کی بنیادی سماجی ضرورت بھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں پہلی بار ۱۸۵۴ء میں خط امیر و غریب ہر دو کیلئے فیض عام بنا اور اسی سن یعنی ۱۸۵۴ء میں ڈاک کے ٹکٹ بھی پہلی بار منظرِ عام پر آئے جسے ڈاک لیبل کہا جاتا تھا۔

غالبؔ سے پہلے خطوط میں استعمال کی جانے والی زبان "نثر میں نظم" ہوا کرتی تھی، ساتھ ہی القاب کی طوالت؛ ہجوم القاب میں مکتوب الیہم کا نام پڑھنا دشوار مسئلہ تھا۔ مروجہ طویل القاب میں سے "چند مختصر" کا یہ حال تھا:۔

دوست کے نام ۔ دوست مشفق و مہربان۔ محب دلنواز،

مجمع مکارم اخلاق و منبع محاسن اشفاق مخلص بہ اخلاص دوست بہ صفا۔

بیوی کے نام۔ محرمِ راز، ہمدم و ہمساز، انیس خاطر غمگین، تسکین بخش دل اندوہ گیں، سلامت باشں۔

اس خصوص میں مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا تھا:۔

"اکثر پر لطف القاب کے ہجوم میں نام کا پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔ بعض اوقات خطوط کے مطلب کو سمجھنے کے لئے صحاح اور قاموس کی ضرورت ہوتی تھی۔" (مقالات گارساں دتاسی ۱۸۷۰ء)

یہ غالب سے پہلے کے دور خطوط نویسی کا حال تھا۔ ابتدائی دور میں خطوط نویسی پر جو کتابیں لکھی گئیں اُن میں مکتوبات احمدی و محمدی، رقعات عنایت علی، انشاء اُردو (۱۸۶۳) ڈپٹی انسپکٹر مدارس لاہور میں بھی یہی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

۱۸۴۹ء سے غالب کی خطوط نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔

"میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصل کے مزے لیا کرو۔"

سرسید کے دور میں خط مضمون بن گیا۔ محسن الملک۔ وقار الملک شبلی حالی اور اکبر الٰہ آبادی تک یہی رنگ غالب رہا۔

۱۹۱۴ء سے داغ، امیر مینائی کے دور تک زبان کی چاشنی اور اختصار خط کی خصوصیات بن گئے۔

جنگ عظیم دوم کے بعد ذہن و فکر کے انقلاب نے خط نگاری کو بھی متاثر کیا۔ اس تاثر کو قبول کرنے والوں میں جوش، فراق اور شوکت تھانوی کے نام آتے ہیں۔

پھر جو دور جدید نے ترقی پسندی کا راستہ اختیار کیا تو بات

"زیرلب" آگئی، زیرلب، عزیرم کے نام، گویا دبستاں کھل گیا۔ یں سادگی، اظہار مدعا کی بے باکی، خط یں درمیان یں کہیں کہیں رنگینی نے اپنا رنگ جمالیا۔

ابوالکلام آزاد، اقبال، مہدی افادی، سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی کے دور میں فاضلانہ علمی شان کے زروجواہر سے خط کا دامن مالامال ہوگیا۔

علمی، ادبی، مذہبی، شخصیتوں سے قطع نظر سیاسی شخصیتوں کی خطوط نویسی کی تاریخ، ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور تحریک خلافت کی دین ہے۔

افق دکن پر ۱۹۳۱ء سے جو آفتاب خطابت اپنی سحر نواز تقریروں کے ذریعے افق سیاست پر پوری آب وتاب سے نمودار ہوا اس قائد ملت لسان الامت کو خدا نے اپنے کرم سے ایسی صلاحیتوں سے نوازا کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اس بہ عظمت انسان کی عظمت کا زبان حال سے معترف نہ رہا ہو، میدانِ سیاست کا یہ شہسوار خطیب بھی تھا اور ادیب بھی، شاعر بھی تھا اور نقیب بھی۔

۱۹۳۱ء سے ۲۵ رجون ۱۹۴۴ء تک کے عرصے میں اس مجاہد بہادر خاں کی زندگی شہادت تک اتنی برق رفتار تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے مسائل کے حل اور دکن کے مسلمانوں کی صیانت کیلئے ان کی زندگی کا ہر لمحہ قوم کی امانت بن گیا۔

اسی عوامی تعلق کی بنا پر ہندوستان کے بڑے سے بڑے سیاستداں عالم، ادیب، ارباب اقتدار، پیشوایان مذاہب، زعماء سے لے کر دوست احباب کے علاوہ ایک معمولی طالب علم اور اہل غرض تک کے سینکڑوں خطوط کا انہیں جواب دینا پڑتا۔

قدرت کو نواب صاحب کے ان گراں قدر خطوط کی حفاظت مقصود تھی
نواب صاحب کے یہ گراں قدر خطوط بھی امتداد زمانہ کی نذر ہو جاتے اگر ان کے مسودات کو محفوظ نہ کرلیا گیا ہوتا۔ نواب صاحب اپنے منشی غلام رسول صاحب کو خطوط کے جوابات املا کرا دیا کرتے تھے، یہ مسودات مجلد ضخیم کتاب کی صورت میں محفوظ رہے۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی نے دو جلدوں میں مکاتیب بہادر یار جنگ کے زیر عنوان نواب صاحب کے خطوط شائع کئے ہیں جن کا ماخذ یہی مسودات ہیں۔ "یہ[1] مکاتیب ایک ایسے زمانے کی یادگار ہیں جن میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری نتیجہ خیز اور حصول پاکستان کے لئے کی جانیوالی جد و جہد فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو رہی تھی۔ ان مکاتیب سے جہاں نواب صاحب مرحوم کی شخصی اور قومی وجاہت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اُن تحریکات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے سیاسی معتقدات کی نشان دہی کرتی تھیں۔

خط کی مختصر سی تختی میں اس بلا کی لطافت ہے کہ لکھنے والے کی کوئی پوشیدہ کیفیت ایسی نہیں رہتی جو اس میں جھلکتی نہ ہو۔ لکھنے والا اپنے ہاتھ سے اپنے جذبات و خیالات کا ایک آئینہ تیار کر دیتا ہے جس پر پردہ ڈالنا اس کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔

خط اس طرح لکھنا کہ مخاطب کے استعداد فہم سے بالاتر نہ ہو، اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو، اس کی افتاد طبع کے مطابق ہو، اسی کے محاورے اور زبان میں راہ سخن وا ہو اور اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اپنا پیغام مخاطب کے دل کی گہرائی تک پہونچے بغیر نہ رہے بہت دشوار کام ہے' یہ وہی کرسکتا ہے جسے خدا نے حضرت خواجہ گیسو دراز' کے الفاظ میں "سخن"

---

[1] بحوالہ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی۔
بہ عنوان "پیشِ لفظ" از مولوی صمدانی نقوی۔

کے لئے مخصوص کرلیا ہو:"

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ تک ساری سیاسی معاشی ادبی اور ثقافتی تحریکیں رونما ہوئیں اور اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان عمل میں آئیں، نواب مرحوم نے اپنے مکاتیب میں غیر ارادی طور پر ایک بے لاگ مؤرخ کا بھی فرض انجام دیا ہے اور اس لحاظ سے نواب مرحوم کے مکاتیب اس دور کا اھم تاریخی ماخذ ہیں" (حوالہ "مکاتیب سے پہلے" ۳۱ تا ۵۹ از صمدانی نقوی مشمولہ بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

نواب صاحب کے ان خطوط میں سیاسی، معاشی، اقتصادی، مذہبی موضوعات پر مکتوب الیہم میں ملکی قائدین، علماء و مشائخین، سیاسی مفکرین اور علمی و ادبی دنیا کی مشہور انام شخصیتوں کی علاوہ عام آدمی اور ان کے احباب کی ایک تفصیلی فہرست ملتی ہے۔

ان کے خطوط میں برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی، ادبی، سیاسی جدوجہد .... کے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں، ان خطوط کا افادی پہلو یہ ہے کہ اس دَور کی جدوجہد اور اجتماعی زندگی کے خدوخال اس مکتوبی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گئے جو ان کے خطوط کی صورت میں بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی اور بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدر آباد سے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ (مخفی مباد ابھی کئی سو خط ایسے ہیں جو شائع شدنی ہیں)

نواب صاحب کے خطوط نہ صرف ادب کا عظیم سرمایہ ہیں بلکہ تاریخ سیاست و تمدن کا یہ قیمتی ماخذ ہیں اور اس طرح یہ ایک اہم عہد کی تاریخ ہیں اور خود نواب صاحب کی سیرت نگاری کے سلسلے میں بھی ان کے خطوط سے سوانح نگار کو بڑی حد تک مطلوبہ مواد .... مل جاتا ہے، ان کے خطوط کے آئینے میں ان کی سیاسی بصیرت، سیاسی جدوجہد کا ایک واضح خاکہ اور ان کی شخصیت کی مکمل تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے۔

اس بیان کی صداقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ

"غالب نے خط کو مکالمہ بنا دیا تھا اور بہادر خاں نے مکاتیب کو خطابت کا جامہ پہنا دیا۔" (مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم ص ۲۴ مولوی محمد احمد خاں میر مجلس بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

نواب صاحب کے تقاریر و مضامین کی طرح ان کے خطوط بھی تین خانوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ مذہبی، سیاسی، ادبی، خالص مذہبی قسم کے خطوط کی تعداد بہت کم ہے۔ سیاسی خطوط میں بھی فکر مومن کی فکر و دانش، ہر خط میں "آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی" کی آئینہ دار ہے۔ اپنے ایک بے تکلف دوست خواجہ نواب کو دعوت کے جواب میں اسلام کی دعوت کے مدعا کو کس درد مندی سے بیان فرماتے ہیں۔

"دنیا کارگہ عمل ہے اس کو بھی تم نے عزلت گزینی ہی میں گذار دیا تو اللہ میاں کے سوال کا کیا جواب کہ زندگی میں کیا کر آئے، اللہ حجروں کی چار دیواری کے اندر نہیں، آفاق کے ذرہ ذرہ میں، بیکسوں کی آہ و بکا میں بے وسیلوں کے نالہ و شیوں میں، مظلوموں کی کراہ میں، داد خواہوں کی تڑپ میں، اس کے راستے میں رسوائیوں اور ذلت میں ملے گا۔

باہر نکلو اور دیکھو کہ اشرف المخلوقات انسان، حامل بار امانت انسان، خلیفۃ اللہ انسان کس طرح ذلیل و خوار ہو رہا ہے اس کی سر بلندیوں کا سامان کرو کہ یہی اصل عبادت اور یہی اصل دین ہے۔"

نواب صاحب نے ایک خط کے جواب میں حالات و واقعات کی روشنی میں مستقبل کے حیدر آباد کا جو نقشہ سپرد قلم فرمایا تھا وہ ان کی سیاسی بصارت و بصیرت، ان کے تڑپتے ہوئے قلب اور نظر کلیمی کا مظہر ہے۔

"دل چاہتا ہے کہ جذبات قلب کو صفحۂ قرطاس پر نہ لاؤں۔ احتیاط

گریباں گیر ہے لیکن سنئے کہے دیتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ حکومت میری نہیں ہے
میں جانتا ہوں کہ اس کو اسلامی حکومت کہنا اسلام کے لئے باعث ننگ و عار ہے
مجھے اعتراف ہے کہ خاک حجاز اقبال کے الفاظ میں خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی
ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری ساری امیدوں کا مرکز اور ساری آرزوؤں
کا ٹھکانہ مجبور اور دوسروں کے اشارے کا محتاج ہے۔ میں اس کو بھی سمجھتا
ہوں کہ بالآخر مجھ کو شکست ہوگی، حیدرآباد کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے
جائے گی اور ہندوستان کے سمندر میں حیدرآباد بھی ایک موج کی طرح
لہرائے گا۔ دو سو برس کے حاکم ازلی اور ابدی غلام بن جائیں گے۔ یہ بھی دیکھ
رہا ہوں کہ یہ سب کچھ بے وجہ نہیں ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی عدم
جمعیت، خلاف ورزیِ قوانین الٰہی، سستی عیش پسندی اور کاہلی کی وجہ
سے اپنے آپ کو اس تمام عذاب الٰہی کا مستحق بنالیا ہے اور خیر اسی میں
ہے کہ اگر وہ پھر سے مسلمان نہیں بن سکتے تو کفر ہی کو اپنا دوست بنالیں
خدا کے نہیں ہو سکتے تو شیطان ہی کو اپنا کرلیں۔ لیکن کیا کروں، اِن سب
باتوں کو جاننے کے باوجود طبیعت ادھر نہیں آتی۔ اسلامی سلطنت کے
تصور میں جی رہا ہوں، اسلامی سلطنت کو پیدا کروں گا یا اسی تصور میں ہمیشہ
کے لئے دنیا سے آنکھ بند کرلوں گا۔ اس کو طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ جن
پر چھ سو برس سے حکومت کی ہے ان کے سامنے سرِ اطاعت خم کردوں
کریلا ہوں اور نیم چڑھا۔ پٹھانوں کے محفوظ خون نے خلقت و جبلت میں
آزادی بھردی تھی۔ اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے مطالعہ نے اس کو
جلادے دی۔ یہ خیال نہ کیجئے کہ صرف مندر کے سامنے جھکنا گوارا نہیں ہے
کلیسا کے اقتدار کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ آپ بجا طور پر سوال کرسکتے ہیں کہ
اقتدار کلیسا کے مقابلے میں کیا کر رہا ہوں معاف کیجئے اس کے مینار و کلس
ڈھلے ہوئے نظر آرہے ہیں، کاخ و ایوان کی اینٹوں کو جھڑتا ہوا دیکھ رہا

ہوں۔ بنیادوں کا تزلزل محسوس کر رہا ہوں۔ واقعات یقین دلا رہے ہیں کہ باپ بیٹا روح القدس کی بجائے وہاں برہما، وشنو اور شیو کی مورتیاں کھڑی ہونے والی ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں خلیج بنگال سے امنڈتے ہوئے طوفان کو چھوڑ کر بحیرۂ عرب کے پھٹتے ہوئے بادلوں کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ دیکھنے والی آنکھ منع کر رہی ہے اور سوچنے والا قلب روک رہا ہے۔ رائے کا اختلاف ہے۔ شاید آپ اتفاق نہ فرمائیں لیکن میرا اگر بس چلے تو شاید بھاپی لے کر اپنی زندگی کی خاطر اور مسجد کے مضبوط ہونے تک کلیسا کی دو چار اینٹوں کو مضبوط کر دوں۔ (حوالہ مولوی غلام احمد وکیل نظام آباد ۲۴ر مئی ۱۹۳۸ء ص ۱۲۶ تا ۱۲۸ مکاتیب بہادر یار جنگ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی۔ کراچی)

ایک اور خط جو یوم ظفر کی یاد منانے والوں کی دعوت کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا تھا اس خط میں بھی اس مرد مؤمن کے نفسِ گرم کی تپش سے اللہ کی برہان کا تصور تازہ ہوتا ہے۔

"یوم ظفر کا دعوت نامہ پہنچا۔ فرزندان تیمور اور بابر کی بیداری میرے نزدیک طلوع صبح ایشیا کے برابر ہے۔ میں اس حرکت پر مبارکباد عرض کرتا ہوں اور شاہانِ مغلیہ کے عقیدت مند کی حیثیت میں یہ عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ فرزندانِ تیمور نے جس دن شمشیر و سنان کو چھوڑا اور چنگ و رباب سے دوستی کی، وہی دن ان کی تباہی و بربادی کا تھا۔ آج آپ ظفر کی یاد منا رہے ہیں۔ ان کی ذاتی خوبیوں میں کسی کو کلام نہیں لیکن شاہانِ مغلیہ کے آخری اور شمشیر بردار نہیں، بلکہ شعر گو بادشاہ کی حیثیت میں، ان کی یاد منانے کو فرزندانِ تیمور کا اپنی شکست، اپنی ذلت، اپنی رسوائی اور اپنی بربادی کی یاد منانا سمجھتا ہوں۔ مجھے اس بزمِ ادب کی شرکت سے معاف فرمائیے جس سے اندیشہ ہے کہ کہیں بابر و تیمور کی عظمت کو میرے دل سے نہ مٹا دے، اس دن کی تیاری کیجئے جس دن آپ تیمور صاحبقرانی، بابر فاتح

ہندوستان شہنشاہ اکبر اور شہنشاہ عالمگیر کی صحیح معنوں میں یاد منانے کے قابل ہو جائیں۔ آنکھوں سے چلتا ہوا آؤں گا اور اپنے عقیدت کے بوسوں سے آپ کے دست و پا کو رنگین کر دوں گا۔ حاشا و کلا جو کچھ کہا گیا وہ آپ کی تنقیص کیلئے نہیں بلکہ قلب میں سلگتی ہوئی آگ کی چند چنگاریاں تھیں جو بے ساختہ نکل پڑیں، معاف کیجئے۔ آپ کے دُکھے ہوئے دلوں کو اور دکھانا مقصود نہیں ہے بلکہ مُردہ دلوں میں جو شراب ادب سے موت سرمدی کا سامان کر رہے ہیں حیاتِ ابدی کیلئے تڑپ پیدا کرنا مقصود ہے۔

آپ کا مخلص اور فاتحین مغلیہ کا عقیدت مند

بہادر

(حوالہ: خط نمبر ۱ بنام جناب فرخ مرزا ڈسمبر ۱۹۳۷ء ص ۶۳ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

متذکرہ بالا خطوط کے اقتباسات میں سوز دروں، پلکوں پہ ستارے ایمان کی حرارت، سوز و ساز رومی اور فلسفۂ رازی کے جلوے ملے، اب نواب صاحب کے خطوط میں نالۂ نے میں سرورِ مے کا مزہ بھی دیکھئے۔ تمباکو اور نے پہونچی، مولانائے روم نے نے کی زبان سے شکایت کروائی تھی لیکن جب سے آپ کا تمباکو پی رہا ہوں، میرے حقہ کی نے سے نغمہ ہائے تشکر نکل رہے ہیں، کمرہ معطر ہے، میں مسرور ہوں اور میری زبان سے پھول اور قلم سے موتی نکل رہے ہیں۔" (حوالہ: مولوی سیّد تقی الدین صاحب نائب معتمد امور دستوری خط نمبر ۱۴۲ ص ۲۷۲، مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

اُن کے خطوط میں محبوبانہ ہمنوائی کی جھلک بھی ملتی ہے:

"آپ کی بارگاہِ محبت کا ایسا سخت مجرم ہوں کہ خط کے ذریعہ بھی آنکھ ملاتے شرم آ رہی ہے" (مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ص ۹۴۷۔ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

اب کی دفعہ تو خط کے لفافے میں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا دل ملفوف ہے۔

(۵۷ مکاتب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

بعض خط ایسے بھی ہیں جن میں الفاظ کی رنگینی سے مضمون میں رنگ بھر جاتا ہے اور ایسے خطوط لفظی بازیگری سے نہیں رعایت لفظی سے معنویت کے حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

"شربتِ بہار کے دو شیشے پہونچے، دلِ شکریہ قبول فرمائیے، اللہ آپ کے گلشن حیات کو ہمیشہ پُر بہار رکھے اور آپ کے دوستوں کی مشام جاں ہمیشہ شربتِ بہار کی خوشبو سے معطّر رہے۔ میں جب کبھی شربتِ بہار پیتا ہوں دل کی کلی پھول بن جاتی ہے اور اُن سے آپ کے اخلاص کی خوشبو آنے لگتی ہے۔

جَزاکمُ اللہ اَحسَنَ الجزاءِ۔

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم خط نمبر ۱۷۹ نواب حکیم فخر الدین خاں ۲۱ر مئی ۱۹۴۲ء)

آم پہونچے۔ گو ان کی شیرینی آپ کی یاد کی مٹھاس سے کم اور ان کا مزہ آپ کے لطف صحبت کے مقابلے میں ہیچ تھا جس کی مدتوں سے تمنّا ہے۔ (حوالہ: ص ۳۰۸ خط نمبر ۲۸۲ امین الدین خاں، مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

ان کے خطوط میں کوئی بات زیر لب بھی آجاتی تو بام یار کے جلووں کا سماں بندھ جاتا ہے، الفاظ کانوں میں رس گھولتے ہیں، مخاطب ان کے خلوص کی شہد آگیں سانسوں کا مزہ لیتا اور الفاظ کے پھول اسکی شام جاں کو معطّر کرتے ہیں

انکے خطوط میں انکی ادیبانہ شان کے ساتھ ساتھ خطیبانہ انداز تخاطب کی جھلک بھی انکے خطوط کے مزے کو دو آتشہ بنا دیتی ہے، انکا ہر خط نئے لہجے اور نئے اسلوب کا حامل ہوتا تب ہی تو ہر خط زبانِ حال سے یہی کہتا ہے ؎

ہمارا جو کوئی مکتوب ہوگا ∴ نیا لہجہ نیا اسلوب ہوگا

خوش مذاقی

ظرافت، خوش بیانی کا دوسرا نام ہے۔ زبان پر قدرت ہو اور مزاج میں شگفتگی اور طبع رواں تو یہ لطفِ سخن کا عنوان بنجاتی ہے۔

ظرافت کا مدعا، انبساطِ خاطرِ احباب بھی ہے اور صنفِ ادب کا باب بھی۔ نواب صاحب کی فصاحت آمیز ظرافت کی جھلکیاں اگرچہ ان کی تقریر و تحریر میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں لیکن نجی محفلوں میں ان کی خوش مذاقی سے محفلیں زعفران زار اور احباب کی محفلیں باغ و بہار بنجاتی تھیں۔

ظرافت دراصل ایک نفسی انبساط ہے جو ہمارے ذہنی اور تخیّلی عناصر کو دعوتِ مسرت دیتی ہے۔ یہ انبساط کی لہر دل سے اٹھتی ہے اور دل و دماغ سے پیامِ مسرت کی یہ سوغات، دیباچۂ قلب کا عنوان بن جاتی ہے، چہرہ کھِل اُٹھتا ہے، اور مزاج میں فرحت و تازگی کے آثار ہویدا ہو جاتے ہیں۔

Thackeray (تھیکرے) کی نظر میں خوش مذاقی، ظرافت اور محبت کے مجموعہ کا نام ہے ——— تھیکرے نے خوش مذاق انسان کی جو تصویر بنائی ہے وہ بڑی دلچسپ اور مکمل ہے، وہ کہتا ہے "خوش مذاق شخص کا دل انسانی ہمدردی اور کائناتِ عالم کی محبت سے لبریز ہوتا ہے"، اس مختصر تمہید کے ساتھ اَب بیسویں صدی کے عظیم انسان، محمد بہادر خاں، جن کی زندگی اگرچہ سیاست کی پرخار وادیوں میں گذری، مگر ان کی بذلہ سنجی و خوش مذاقی کے واقعات بابِ لطفِ سخن و خوش مذاقی کے حسن کا حسین عکسِ جمیل ہیں۔

میں اور میرا خدا

بلاد اسلامیہ کے دورے میں ایران میں کرایہ کی موٹر درکار تھی، موٹر ڈرائیور نے پوچھا کہ کتنے آدمی ہو۔ نواب صاحب نے (جو واحد تھے) فرمایا ہم دو ہیں ڈرائیور نے کہا فی کس اتنے لوں گا، نواب صاحب کو مذاق سوجھا فرمایا کرایہ تو ایک ہی شخص کا دوں گا لیکن چلیں گے دو لوں، اس نے کہا میں تو نہ لیجاؤں گا۔ نواب صاحب نے فرمایا میں تو ضرور جاؤں گا اور صرف اپنا ہی کرایہ دوں گا۔ اس تیز مزاج ایرانی کو بہت غصہ آیا تب نواب صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ میں اور میرا اللہ ہم دو ہیں، ڈرائیور یہ سن کر فوراً ہنس پڑا۔ نواب صاحب نے فرمایا، تم نے مجھے تنہا دیکھا پھر بھی تم نے پوچھا آپ کتنے آدمی ہیں، میرے ساتھ کون شخص تھا جو تم نے پوچھا آپ کتنے ہیں، وہ راستہ بھر نواب صاحب کی خوش مذاقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

قرآن مجید کا ترجمہ

نواب صاحب جامعہ ازہر کے شیخ الجامعہ کے پاس مدعو تھے، شیخ الجامعہ نے دورانِ گفتگو طنزاً فرمایا کہ سنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں۔ نواب صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "ترجمہ نہیں ترجمانی کرتے ہیں۔ اور اس میں کیا قباحت ہے" شیخ الجامعہ نے ہنستے ہنستے فرمایا کہ "آپ نے بچا لیا"۔

میں اور میرا لباس

بلاد اسلامیہ کی سیر کے سلسلے میں ساحل اٹلی سے گذر رہے تھے۔ مرحوم کے ایک اٹالین دوست (جن سے جہاز کی دوستی تھی) بھی ساتھ سفر کر رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ شام ہوتے ہی یہ شخص (نواب صاحب) صرف شیروانی اتارتا ہے اور سو جاتا ہے، صبح اٹھتا ہے تو پھر ان ہی کپڑوں پر شیروانی پہن لیتا

ہے۔ اس بیچارے سے رہا نہ گیا کہنے لگا "ہندوستانی واقعی بہت (BACK-WARI) ہیں ان کو لباس کا استعمال تک معلوم نہیں اور نہ ان کا لباس موزون ہوتا ہے، نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اچھا تم ہی بتاؤ کہ اچھے لباس کیلئے کیا شرائط ضروری ہیں اس سوال پر وہ سٹپٹایا اور کہنے لگا آپ ہی فرمائیے۔ نواب صاحب نے فرمایا لباس ایسا ہو (۱) جو موسمی اثرات سے محفوظ رکھے (۲) اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں سہولت رہے (۳) ساتھ ہی بھدا نہ ہو بلکہ خوش وضع ہو اس لحاظ سے دیکھو تو میری شیروانی جو گلے سے گھٹنوں کے نیچے تک ہے موسمی اثرات سے پورا پورا تحفظ کرتی ہے۔ میرا پاجامہ میرے اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مزاحم نہیں ہوتا اور میرا لباس خوش وضع بھی ہے۔ البتہ اسمیں ایک نقص ہے جو تمہارے لباس میں نہیں ہے وہ یہ کہ اس لباس میں انسانی جسم کی فطری تراش خراش ظاہر نہیں ہوتی"۔ (بحوالہ قاید ملت از مولوی غلام محمد۔)

جانب راست

اب نواب صاحب کے قلم کی زبانی ایک لطیفہ سنئیے:

اعلیٰ حضرت نادر شاہ، وزراء سلطنت وغیرہ کے ہمراہ فوجی سپاہیوں کے جمناسٹک کے کرتب ملاحظہ فرما رہے تھے، دوران مظاہرہ جب رسی کشی شروع ہوئی، اعلیٰ حضرت نے مجھ سے استفسار فرمایا کہ "کونسی جماعت جیتے گی میں نے جانب راست کی پارٹی کی نسبت اپنا خیال ظاہر کیا، تمام مصاحبین سے استفسار کے بعد فرمایا، نواب صاحب بجانب راست نیست، میں نے کہا "راستی موجب رضائے خداست" فرمانے لگے "کیا کھیل کود میں بھی" میں نے کہا "ہاں"۔

سوئے اتفاق سے بائیں طرف کی جماعت جیت گئی، اعلیٰ حضرت نے میری طرف مسکرا کر دیکھا، میں نے کہا، اعلیٰ حضرت یہ خلاف توقع نہیں ہے کیوں کہ آج کل معاملہ میں راستی مخالف سمت میں حرکت کر رہی ہے، حاضرین اور اعلیٰ حضرت میرا یہ جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے۔

(حوالہ ۱۸۱، ۱۸۲ سفرنامہ بلاد اسلامیہ مرتبہ نذیرالدین احمد)

اینٹ سے اینٹ بجا دی

۱۲ اگست ۱۹۳۱ء کو (دوران سفر بلاد اسلامیہ) نواب صاحب سامرہ قدیم کے آثار دیکھنے تشریف لے گئے، بیت الخلفہ المتعصم باللہ دیکھ رہے تھے (بیت الخلفہ دجلہ کے کنارے واقع ہے) یہ عمارت دور دور تک گری ہوئی بصورت کھنڈر ہے، مزدوران کی اینٹیں نکال کر بیچتے ہیں، ایک بوڑھا مزدور اسی کام میں مصروف تھا، نواب صاحب نے اس سے مخاطب ہوکر طنز سے فرمایا خلیفہ کے محل کی تو نے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑا، ۔ (منقول سفرنامہ بلاد اسلامیہ مرتبہ نذیرالدین احمد۔)

دال ہضم کر ڈالی

ان کی بذلہ سنجی کا ایک اور واقعہ سن لیجیے، ایک دن ان ہی کی ڈیوڑھی میں حسب معمول درس اقبال ہو رہا تھا، ایک جگہ ایک لفظ "د" کے بغیر چھپ گیا تھا اور وہ لفظ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، مختلف اصحاب نے اس لفظ کو سمجھنے اور پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر قائد ملت نے کتاب ہاتھ میں لی۔ ایک دو منٹ غور سے اس لفظ کو دیکھتے رہے اس کے بعد ہنس کر کہنے لگے کہ

یہاں "د" کا حرف ہونا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب کے گھر اس روز دال، پکی نہ تھی اس لئے اس نے بھوک کے مارے دال ہضم کر ڈالی" یہ سن کر حاضرین کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

(حوالہ ہمارا قاید از مولوی محمد احمد خاں صاحب ص ۱۵۸.)

مولانا کی دال خوری

اتحاد المسلمین کے ایک مشہور لیڈر جو مولانا تھے نواب صاحب کو خط لکھا جس میں اتحاد المسلمین کی بجائے اتحا المسلمین لکھا، درمیان سے دال غائب تھا. نواب صاحب نے جواباً استفسار فرمایا کہ "مولانا — ! یہ دال خوری آپ نے کب سے شروع کردی؟"

برق کی زندگی

آغا محشر حشری نے بمبئی سے برق ہفتہ وار جاری کیا اور برق کی زندگی کیلئے امداد چاہی — نواب صاحب نے سالانہ خریدی قبول فرمالی اور جواب میں لکھا "خرمن دل منتظر ہے۔ برق بھیجدیجئے۔ آپ نے برق کی زندگی کیلئے مجھ سے امداد چاہی ہے — جس کو قدرت نے حیات طویل نہ بخشی ہو اس کی زندگی کا ساماں میں بے چارہ کیا کرسکتا ہوں.

(بحوالہ خط نمبر ۷۹، ص ۱۳۳، مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل
شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

خلیفہ پروفیسر ہو جاتے ہیں

پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ نواب صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے، بے تکلفی کے باعث دونوں میں اکثر فقرہ بازی ہوا کرتی تھی۔ ایک دن پروفیسر صاحب نے نواب صاحب کی قوت خطابت پر لطیف سی چوٹ کی کہ :۔

نواب صاحب "جھوٹے کی زبان بڑی چلتی ہے" نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "جی ہاں" تب ہی تو خلیفہ پروفیسر ہو جاتے ہیں[1]۔

ہڈی ٹوٹ نہیں سکتی

جناب نصیر الدین ہاشمی مرحوم دکن کی تاریخ اور ادب کے مستند عالم تھے، ملنسار اور منکسر المزاج، کئی کتابوں کے مصنف، کسی دُبلے آدمی کے تصور کا آخری خاکہ جو آپ کے ذہن میں آئے، بس اتنے ہی دُبلے، نواب صاحب بڑے جسیم آدمی تھے نواب صاحب کے سامنے سمجھئے وہ اعشاریہ کے مانند تھے۔

اس تمہید کے بعد یہ واقعہ اور بھی لطف دے گا، خود نصیر الدین صاحب ہاشمی کی زبانی اس واقعہ کو سنئے۔

"جب کبھی جہاں کہیں یعنی اکثر مجالس میلاد یا کسی دعوت کی تقریب یا عیدین کی نماز وغیرہ میں ملاقات ہوتی رہی اور بہادر خاں نہایت خلوص اور پرتپاک طریقہ پر ملتے تھے، خصوصاً عید کی ملاقات میں گلے ملتے ہوئے فرماتے تھے کہ " مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں آپ کی ہڈیاں نہ ٹوٹ جائیں

---

[1] یوپی، دھلی، لکھنؤ میں مسلمان حجام (اصلاح ساز) خلیفہ کہلاتے ہیں۔
حوالہ دیگرہ وغیرہ اخبار جنگ ابراہیم جلیس۔

میں غالباً (گھبرا کر) جواب دیا کرتا کہ خلوص کی ملاقات میں ہڈی ٹوٹ نہیں سکتی۔

(حوالہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں ص ۳۲۰ مطبوعہ بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

قاضی

سماجی اور عوامی زندگی میں خاطر احباب بھی کوئی چیز ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی برائے خاطر احباب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

ایک نوجوان ملازمت کا متلاشی جس کو یہ معلوم ہوا کہ آبکاری میں کوئی ملازمت تقرر طلب ہے، نواب صاحب کی وساطت سے ناظم آبکاری تک رسائی کا راستہ ہموار کیا، اس وقت کے ناظم آبکاری ایک خاندانی قاضی تھے، جن کا نام قاضی زین العابدین تھا۔ قاضی کے لفظ کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواب صاحب نے سفارشی خط لکھا:

"آبکاری میں مسلمان کو بھیجنا مجھے خود پسند نہیں ہے لیکن جب ایک قاضی نظامت پر ہو تو مسلمان کی شرکت جائز ہو جاتی ہے"۔

(حوالہ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی۔ خط نمبر ۵۷ ص ۴۸۸)

پیٹ پرورش

نواب صاحب کی فقرہ بازی کی زد سے ان کی بیگم صاحبہ تک محفوظ نہیں رہیں۔ نواب صاحب اپنی بیگم صاحبہ کا یہ واقعہ اکثر دوستوں کو سناتے تھے.... اور خود بھی لطف اٹھاتے تھے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب دولت خان نے ایک دن اپنی بھاوج (بیگم بہادر یار جنگ) سے کہا کہ "بھائی سے کہہ کر مجھے کسی پیڈ پروبیشنری....

——— (PAID PRABATIONERNY) کی جائیداد پر

مامور کرادیجئے۔ بیگم صاحبہ نے پیڈ پروبیشنری کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا۔ چنانچہ انہوں نے نواب صاحب سے کہا "آپ دولت خاں کی پیٹ پرورش کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے؟۔ نواب صاحب ہنستے ہوئے فرماتے تھے کہ پیڈ پروبیشنری کا ترجمہ پیٹ پرورش سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

(حوالہ وغیرہ وغیرہ از اخبار جنگ ابراهیم جلیس۔)

ہمّت عالی

حکیم محمدؐ یوسف نیّر نے اپنی شادی کی اطلاع بذریعہ خط نواب صاحب کو دی۔ نواب صاحب پیری میں شادی پر حیران ہوئے اور محظوظ بھی۔ اسی موڈ میں دعوت نامے کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

"آپ کی ہمت عالی پر رشک آتا ہے اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ہم نوجوانوں کو آپ کی پیری نصیب کرے۔

(حوالہ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی خط نمبر ۲۲۰ ص ۱۶۸۔)

سر اکبر حیدری کو پانچ سلام

حیدرآباد میں تحریک اصلاحات پر نواب صاحب تقریر فرما رہے تھے (ان دنوں سر اکبر حیدری وزیر اعظم مملکت آصفیہ حیدرآباد تھے۔ ان کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور قوم دشمنی کی کارستانیوں پر نواب صاحب بیحد برہم تھے۔ اس بت خود سر کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں) جب دورانِ تقریر سر اکبر کا ذکر آیا۔ تاب ضبط کی حدیں ٹوٹ گئیں۔ اندرونی جذبہ بیرونی علامت کے

ذریعے اظہار مدعا کا طلبگار تھا، نواب صاحب نے جھکتے ہوئے اپنے ہاتھ کو اپنے قدموں تک پہنچاتے ہوئے فرمایا، جی چاہتا ہے کہ سر اکبر حیدری کو پاپنچ (پیر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) پھر سیدھے ہو گئے اور فرمایا سلام کروں۔ مقصود پاپنچ سلام نہ تھے، سامعین اس سلام کے مدعا کو سمجھ گئے اور سارا مجمع ہنس پڑا۔

(حوالہ ۹۴، ... ماخوذ رموز خطابت از نذیر الدین احمد)

میرے محسن

نواب بہادر یار جنگ عمر میں مجھ سے دو سال بڑے تھے اور بہت محبت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ سالانہ جلسہ کے سلسلے میں نواب ورنگل تشریف لائے تھے، دوپہر کے کھانے کا انتظام مولوی سید غزل حسین صاحب ایڈوکیٹ کی جانب سے تھا۔ دسترخوان کے ایک سرے پر نواب صاحب اور دوسرے سرے پر میں بیٹھا تھا۔ میرے قریب جو اصحاب بیٹھے تھے وہ میری باتوں پر ہنس رہے تھے۔ کھانا ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ نواب صاحب کے یہ الفاظ ہمارے کانوں میں پڑے، آپ لوگوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ شکور بیگ صاحب میرے محسن ہیں۔ انہوں نے تشریف لاکر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے، لوگ مجھے دیکھنے لگے اور میں حیرت سے نواب صاحب کا منھ تکنے لگا کہ آخر وہ کیا احسان ہے جس سے میں بھی واقف نہیں۔

نواب صاحب نے فرمایا، بھئی بات یہ ہے کہ میری پیدائش کا سن ۱۹۰۵ء ہے اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۹۰۷ء میں شکور بیگ صاحب پیدا ہوئے۔ وہ عمر میں دو سال چھوٹے ہیں مگر ہیں میرے محسن۔

میں نے کہا نواب صاحب کی بات پھر بھی صاف نہ ہوئی۔

فرمایا — پیدا ہوئے ۱۹۰۷ء میں اور موسیٰ ندی کی طغیانی آئی

۱۹۰۸ء میں اور اسی طغیانی نے حیدر آباد میں جو تباہی مچائی اس کی داستان آپ لوگوں نے سنی ہوگی ـــــــــ بہرحال اگر شکور بیگ صاحب پیدا نہ ہوتے تو حیدر آباد والے کہتے کہ نصیب یاور جنگ کے یہاں ایسا منحوس بچہ پیدا ہوا کہ یہ طغیانی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اب مجھے کوئی نہیں کہے گا۔ شکور بیگ صاحب نے پیدا ہو کر مجھے گالیوں سے بچالیا۔ اب نحوست ان کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ مجھے کوئی منحوس نہیں کہہ سکتا" تو کہئے یہ میرے محسن ہوئے کہ نہیں"۔

سب ہنسنے لگے میں نے کہا نواب صاحب میرے بعد بھی تو طغیانی تک کوئی پیدا ہوا ہوگا تو فرمایا اسے تلاش کرنا آپ کا کام ہے، میں نے تو اپنے محسن کو پالیا۔ اس پر بھی خوب ہنسی ہوئی۔ (ماخوذ مضامین شکور بیگ)

دو بچھڑوں کی لڑائی

تجویز قیام پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے گاندھی جی نے پرارتھنا سبھا میں کہا تھا" ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دینا" گاؤ ماتا کے دو ٹکڑے کر دینا ہے" اور ہندو مہاسبھا اور آریہ سماجی لیڈروں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں اور بیانات میں کہا کہ" ہندوستان

(نوٹ) مولوی الحاج مرزا شکور بیگ اپنے وقت کے مشہور وکیل، جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر سپوت، حضرت قائد ملت کے دوست اور شیدائی، مزاحیہ شاعری میں اکبر ثانی، سیاسی دنیا میں قدم رکھا تو یم' ایل، اے ہوئے فیضانِ محبت کی منزلوں سے گذر چکے' اب تقریباً چالیس سال سے ان کی زندگی ذکرِ حبیبِ کے سہارے محبت کی معراجی منزلوں میں ہے' عشقِ رسولؐ کی محبت سے ان کا دل مالا مال ہے۔ ہر سال دربارِ حبیب کا یہ گدا، اپنے آقا کے حضور حاضر رہتا ہے' ان کی نعتیں تجدیدِ ایمان کا وسیلہ ہوتی ہیں۔

گائے ہے جس کو مسلم لیگی کاٹنا اور بانٹنا چاہتے ہیں"

نواب صاحب نے اس اشتعال انگیز خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا :-

اگر ہندوستان ایک گائے ہے تو اس گائے نے دو بچھڑے دیئے ہیں اور ان میں تصادم اور ٹکرؔ ہونے لگا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان بچھڑوں کو لڑنے سے روکنے کے لئے ان کے تھان بدل دیئے جائیں۔ اس بچھڑے کو اِس تھان (ہندوستان) میں اور دوسرے کو اُس تھان (پاکستان) میں رکھا جائے۔

(ماخوذ ملّت کا درخشاں ستارہ از سیّد شرف الدین پیرزادہ
۲۷ جون ۶۴ء حریت کراچی۔)

گاندھی جی کے دو سیب

مولوی بہادر خان مرحوم، گاندھی جی سے ملنے سیواگرام گئے۔ گاندھی جی نے کہا میں نے سنا ہے کہ تم مولانا آزاد سے بھی اچھی تقریر کرتے ہو۔ مجھے تم سے ملنے کی خواہش بہت تھی۔ اس وقت گاندھی جی کے درشن کیلئے لوگ آرہے تھے۔ چرن چھوتے، پھول رکھتے اور چلے جاتے۔ ایک معتقد نے بجائے پھول کے دو نفیس کشمیری سیب گاندھی جی کی خدمت میں پیش کئے۔ گاندھی جی نے اس کو قبول کرلیا۔ گاندھی جی ایک سیب بہادر خاں مرحوم کو دینا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر مرحوم نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ایک ساتھ جوڑ کر کھول دیں تاکہ سیب لیں۔ ان کشادہ اور شفاف ہتھیلیوں کو دیکھ کر گاندھی جی نے دونوں سیب یہ کہہ کر رکھ دیئے کہ میں آپ کو ایک ہی سیب دینا چاہتا ہوں مگر اتنی بڑی ہتھیلیوں کو دیکھ کر دونوں سیب دینے کو طبیعت چاہتی ہے۔

بہادر خاں مسکراتے ہوئے کہنے لگے اب جب کہ آپ نے کشادہ دلی کے ساتھ ہمیں یہ عطیہ دیا تو ہم نہیں چاہتے کہ سب کچھ لے لیں۔ اس لئے آئیے ہم تقسیم کریں۔ یہ کہہ کر ایک سیب گاندھی جی کو دیدیا، پاکستان کی طرف لطیف اشارہ محسوس کرکے گاندھی جی کچھ دیر تک مسکراتے رہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ انہوں نے اس سے قبل گاندھی جی کو اتنا مسرور نہیں دیکھا تھا۔

(حوالہ چند سیاسی لطیفے از عزیزالرحمٰن ص ۲۲۰ جلد ۲۰ شمارہ ۲،۱ مجلہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد۔)

بہادر یار جنگ کو بہادر یار جنگ کس نے بنایا؟

ریاست حیدرآباد دکن کے ایک جاگیردار راجہ پرتاب گیر جی کی کوٹھی میں کوئی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں نواب صاحب بھی مدعو تھے۔ اس تقریب میں نواب صاحب کی آمد سے قبل حاضرین کا موضوع بہادر یار جنگ ہی تھے۔ مجلس اتحادالمسلمین حیدرآباد کے ایک سرگرم رکن ابوالبیان خواجہ بہاؤالدین حاضرین سے کہہ رہے تھے "پہلے یہ دیکھئے کہ بہادر یار جنگ کو بہادر یار جنگ کس نے بنایا۔ اگر میں بہادر یار جنگ کو متعارف نہ کرواتا تو آج بہادر یار جنگ کو کون جانتا"، بہاؤالدین صاحب کا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ نواب صاحب رونق افروز ہوئے۔ ایک نے نواب صاحب کو سلام اور مصافحہ کے درمیان مخاطب کرکے بہاؤالدین صاحب کا جملہ دہرادیا اور پوچھا "نواب صاحب "کیا یہ سچ ہے کہ بہادر یار جنگ کو ابوالبیان خواجہ بہاؤالدین نے بنایا ہے۔

نواب صاحب بہت ہنسے اور فرمایا ابوالبیان خواجہ بہاؤالدین صاحب نے مجھے بنایا ہو یا نہ بنایا ہو البتہ انہوں نے آپ سبھوں کو بنایا ہے۔ یہ سن کر سب بے اختیار ہنس پڑے اور خود خواجہ بہاؤالدین صاحب

بھی اس پرلطف لطیفے کا مزہ لے کر ہنسنے والوں میں شامل تھے۔

سپاہی کا وار

نواب رحمت یار جنگ کوتوال بلدہ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں کی حاضری سے فارغ ہوکر دفتر کوتوالی بلدہ آرہے تھے جب ان کی موٹر عابد کے چوراستہ پر پہونچی تو کسی عرب سپاہی نے جس کو ان سے کچھ شکایت تھی ان پر گولی چلادی، مگر حسنِ اتفاق سے وہ بچ گئے، گولی موٹر کی باڈی کو چاٹ کر گذر گئی۔

حسبِ روایت کئی حضرات نے نواب رحمت یار جنگ کے بنگلہ پر پہنچکر اس حادثہ سے سلامتی پر انہیں مبارکباد دی۔ قائد ملّت کی عادت نہ تھی کہ وہ کسی امیر یا عہدہ دار کے بنگلہ پر تشریف لے جاتے۔ حادثہ کے چند روز بعد کسی دعوت میں رحمت یار جنگ سے ملاقات ہوئی تو ان کو مبارکباد دی۔ مگر فرمایا کہ نواب صاحب ایک خلش رہ گئی۔

رحمت یار جنگ نے حیرت سے دریافت کیا وہ کیا ہے؟ تو قائد ملّت نے فرمایا کہ:

"ایک سپاہی کا وار خالی گیا"

تبصرہ اتنا پُرلطف تھا کہ رحمت یار جنگ بھی اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ (حوالہ: مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید سعید صدیقی)

آہ ——— !

نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا،

فضائلِ نفس

"فضائلِ نفس" وہ نعمت ہے۔ جو خدا کے ان برگزیدہ بندوں کو عطا ہوتی ہے جو قرآن کی زبان میں صالحین کہلاتے ہیں۔ اور ارشاد فرمایا دو جہاں کے سردار آقائے نامدار صلعم نے :

اللہ کی رحمت، صالحین کے ذکر کے وقت نازل ہوتی ہے۔

فقیری و درویشی، سادگی، جود و سخا، اہلیت کی شان از مہد تا لحد ان کی زندگی کا جزء لاینفک رہی ——— اور ان کی یہ قلندری سکندری سے کم نہیں تھی۔

۱— ایک عمر رسیدہ بزرگ جو حج کے لئے تشریف لے جانا چاہتے تھے نواب صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے (اس وقت نواب صاحب کی عمر ۲۰، ۲۱ سال کی تھی) اور فرمایا "میرے پاس صرف چار سو روپے ہیں اور میں حج کو جانا چاہتا ہوں۔ رقم جمع کرانے کا آج آخری دن ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا آپ تشریف رکھیں، میں ابھی حاضر ہوا، کچھ ہی دیر میں نواب صاحب شخص مذکور کی مطلوبہ رقم لے کر حاضر ہوئے۔ مطلوبہ رقم کے طالب نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ نواب صاحب نے اشک بار آنکھوں اور تھرائی ہوئی آواز میں بڑی لجاجت سے فرمایا :

میری یہ مجال و طاقت نہیں کہ میرے ہاتھ کسی مسلمان بھائی کے

ہاتھ سے اونچے ہوں۔ اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر دیئے۔ شخص مذکور کے رخصت ہو جانے کے بعد نواب صاحب اس درجہ متاثر رہے کہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ہم احباب بھی دیوڑھی سے رخصت ہو گئے۔

بحوالہ: انٹرویو نواب صاحب کے بچپن کے دوست مولوی بہادر خاں صاحب سرخیل زلی مرحوم حیدر آبادی)

مندرجہ بالا واقعہ کے ساتھ ہی حضرت ابو سہل سعلوؒ کے بارے میں حضرت شیخ علی ہجویری کی روایت یاد آتی ہے۔

حضرت ابو سہل سعلوؒ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ صدقہ وخیرات کبھی کسی محتاج کے ہاتھ پر نہ رکھتے بلکہ زمین پر رکھدیتے کہ محتاج خود اُسے اٹھالیں۔ مُریدوں نے آپ سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا ہاتھ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اونچا اور اس کے اوپر ہو اور نہ درہم و دینار کو میں ایسی باعظمت شئے سمجھتا ہوں کہ کسی مسلمان کا ہاتھ ان کے نیچے ہو۔

(حوالہ: کشف المحجوب از حضرت شیخ علی ہجویری مترجم میاں طفیل احمد ص ۳۲۱۔

۲۔ زبان بندی کے زمانہ میں مصطفےٰ بازار کے عظیم الشان جلسہ میں نواب صاحب نے تقریر فرمائی، حیدری حکومت نے جواب طلب کیا کہ حکم کی خلاف درزی کیوں کی گئی۔ اس کا جواب مرتب کرنے کے لئے تنہائی کی ضرورت تھی مجھے ساتھ لے کر عنبر پیٹ کے بنگلہ پر پہنچے۔ (اور وہاں جواب مرتب کیا گیا کہ تقریر کی نوعیت سیاسی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی، پابندی صرف سیاسی سرگرمیوں پر ہے۔ مذہبی تقاریر اس حکم کے دائرۂ اثر سے خارج ہے)

عنبر پیٹ کے اس واقعہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب اپنی جیب میں عادتاً پیسہ نہیں رکھتے وہ ہمیشہ ان کے ملازم خاص سیّد حسین کے پاس ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ (سید حسین) ساتھ نہ تھا۔ جب باورچی نے آکر کھانا تیار کرنے کے لئے پیسے مانگے تو نواب صاحب کی جیب خالی تھی۔

مجھ سے پوچھا کہ جیب میں کچھ ہے۔ میرے پاس اس وقت صرف چار روپئے تھے
بس اسی سے کام چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے میں سید حسین ہانپتے کانپتے سیکل پر
عنبر پیٹ آگئے اور کھانا تیار ہوا۔ قاید ملت کی زندگی کا ہر ایک پہلو سبق آموز ہے
(حوالہ: مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

۳۔ نواب صاحب کے آوردہ میں ایک خاں صاحب تھے۔ ۹ بجے سے کچھ پہلے آئے، صورت اتری ہوئی تھی، حال بے حال تھا۔ ان کی ڈیوٹی ڈیوڑھی میں ہر گھنٹے پر گھنٹہ بجانا تھا۔ نواب صاحب نے مزاج پرسی فرمائی، فوراً بیٹھ جانے کو کہا، اسی دوران ۹ بجے، نواب صاحب نے خود اپنے دستِ مبارک سے گھنٹہ بجایا۔ انہیں اٹھنے نہ دیا۔ سواری کا انتظام کرکے انہیں رخصت کیا اور تاکید فرمایا کہ مکمل صحت یابی تک وہ آرام لیں۔

(بحوالہ: مولوی بہادر خاں صاحب سرخیل زلی مرحوم)

۴۔ اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اصلاحات کی مہم کا زمانہ تھا اور میں بھی کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ نواب صاحب سے میرے گہرے مراسم کی ابھی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ ایک روز ایک صاحب کے ذریعہ نواب صاحب نے بلا بھیجا۔ میں وقت مقررہ کے کچھ دیر بعد پہنچا۔ ورانڈے میں بہت سے لوگ جمع تھے اور نواب صاحب ان سے مصروفِ گفتگو۔ ابھی میں ورانڈے میں قدم ہی رکھا تھا کہ نواب صاحب معاً اٹھے۔ اندر ڈرائنگ روم میں گئے۔ ایک کرسی اٹھائی۔ لاکر میرے قریب رکھ دی اور بیٹھنے کی فرمائش کی۔ میں اپنے دل میں شرمندہ ہوا ـــــ ان کی عظمت کا یہ پہلا نقش تھا جو میرے دل پر آج تک باقی ہے۔

۵۔ ایک اور دلچسپ واقعہ بھی سُن لیجئے۔ ایک دفعہ میں ان کے پاس بیٹھا ہوں۔ کمرہ میں بعض بڑے عہدہ دار ہیں۔ اتنے میں میلے کپڑے پہنے ایک چھوٹی لڑکی کھیلتے کھیلتے وہاں آگئی۔ دیکھتے ہی فوراً اٹھے، چمکار کر اپنے گود

میں اٹھالیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگے اور اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر جُھلانے لگے اور تتلی زبان میں بچّوں سے کہتے جاتے تھے :

میں چھیدّ کی بیٹی امّو ہوں   چھر کار کی لاٹج دُلاری ہوں
بیدّم کے دل تی پیاری ہوں   میں چھوٹی چھوٹی امّو ہوں

میں حیران سوچ رہا تھا کہ لڑکی کون ہے۔ بعد میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ قاید ملّت کے ملازم سیّد حسین کی لڑکی ہے۔

(حوالہ: ہمارا قاید از مولوی محمد احمد خاں صاحب ص ۱۶۰، ۱۶۱) سچ ہے ؎
نہیں ہے منھ کا نوالہ کچھ آدمی بننا ∴ بہت صفات ہیں درکار آدمی کیلئے

۶- اسی طرح ایک اور واقعہ پیش آیا جب کہ ڈاکٹر سیّد عبداللطیف اپنی بعض مخالف لیگی مصروفیات کے باعث قائداعظم کے مورد عتاب ہوئے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر لطیف کو ناگپور میں مسلم لیگ کی طلب کی ہوئی پاکستانی کانفرنس کا خطبۂ صدارت پڑھنا تھا، قایداعظم کی ناراضگی کا ناگپور والوں کو علم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت اور پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دیدی، غالباً یہ معاملات اس وقت طے پائے تھے جب قائد ملّت بہادر خاں قائدِاعظم سے ملاقات کر کے حیدرآباد سے واپس ہوتے ہوئے ناگپور ٹھہرے تھے۔ ڈاکٹر لطیف کو اس کا علم تھا۔ واپسی کے فوراً بعد ہی ملاقات میں نواب صاحب نے مجھے پس منظر سے آگاہ کر دیا تھا۔ دوسرے دن اورینٹ پریس میں ڈاکٹر لطیف پہنچے اور انہوں نے وہ بیان دیا جس میں قائداعظم کی روش اور بہادر خاں کے کردار پر بھی کچھ چھینٹے ڈالے تھے، یہی وہ بیان تھا جس سے ڈاکٹر لطیف کے زوال کا آغاز ہوا۔ میں تمام حالات سے واقف تھا لیکن ڈاکٹر صاحب سے کہنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد میں نے

۱؎ سیّد ۲؎ بیٹی ۳؎ سرکار ۴؎ راج ۵؎ بیگم ۶؎ کی۔

نواب صاحب کو بیان پڑھ کر سنایا۔ میں اپنی دانست میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے سنسر...... کرانے کی کوشش کریں گے لیکن فراخدلی اور صحافتی آداب ملاحظہ فرمائیں کہ نواب صاحب نے مشورہ دیا کہ من وعن مقامی پریس کو بھی دیں اور باہر بھی ضرور بھیجیں۔

(حوالہ: بہادر یار جنگ میری نظر میں از سلطان احمد ص ۶۲، ۶۳
مشاہیر وطن کی نظر میں، مرتبہ نذیر الدین احمد)

۷۔ نواب صاحب کا ایک ملازم تھا جو جاگیر کے عملے سے متعلق تھا۔ دیوڑھی میں ان کی نوکری تھی۔ ملازمین کی تنخواہ کا دن تھا۔ مکندن مصدی تنخواہ تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔ اس دوران نواب صاحب نے سنا، زور زور سے بحث و تکرار کی آوازیں آرہی ہیں۔ نواب صاحب اس جانب تشریف لے گئے۔ مصدی سے ملازم کی وجہ تکرار دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ شخص مذکور کی غیر حاضری کی تنخواہ کا بھی وہ طالب ہے اور تنخواہ کے علاوہ مزید رقم چاہتا ہے۔ نواب صاحب نے ملازم مذکور سے غیر حاضری اور مزید رقم کی ضرورت کے بارے میں استفسار فرمایا۔ ملازم مذکور نے کہا سرکار بچّی ہوئی ہے۔ بیوی بیمار ہے اور مجھے چھ بچّیاں ہیں۔ غیر حاضری کی تنخواہ، ایک ماہ کی زائد تنخواہ کا مصدی کو حکم دیا، اور اپنی جیب سے مزید ایک سو روپئے دیئے۔ حاجت مند دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

۸۔ (مولوی محمد عمر مہاجر مرحوم ایک جادو بیان خطیب تھے۔ غالب کے فارسی خطوط کا اُردو ترجمہ ان کا شاہکار ہے۔ زبان و بیان اور طرز ادا سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود غالبؔ نے اپنے فارسی خطوط کا اُردو ترجمہ کیا ہو۔)

بہادر خاں میرے دوست نہیں تھے لیکن میں نے ان کے لاکھوں عقیدت گذاروں کی طرح ان کو دور سے اور قریب سے دونوں طرح سے

دیکھا ہے، دور سے دیکھنے والے ان کو عظیم انسان سمجھتے تھے۔ قریب سے دیکھنے والے ان کو عظیم تر جانتے تھے۔ یہ بڑائی ہر شخص کو نہیں ملتی۔ یہ صرف اسی کا حصّہ ہوتی ہے جو محبوب خلق ہوتا ہے اور اسی وسیلے سے خدا کا محبوب بھی ہوتا ہے۔

میں حیدرآباد کے ایک کالج کے تقریری مقابلے میں اپنے کالج کی نمائندگی کر رہا تھا، دورانِ تقریر میں نے سامنے کی صف میں ایک باوقار، وجیہہ اور شاندار شخص کو دیکھا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی مسکراتی آنکھیں اور اس کا دلنواز انداز مجھے تقریر کی داد دے رہا ہے۔ مقرّر اور سامع میں یہ ربط پنہاں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے مگر جب ایک بار یہ ربط قائم ہو جاتا ہے تو جنم جنم کے فاصلے اور بیگانگی سب مٹ جاتے ہیں۔ تقریر ختم ہونے کے بعد جب میں اپنی نشست پر واپس ہوا تو وہ نگاہیں پھر ایک مرتبہ مجھے داد دیتی محسوس ہوئیں میرے برابر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے مجھے بتایا کہ "یہ نواب بہادر خاں ہیں جو ابھی بلادِ اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آئے ہیں"۔

میں دیر تک انہیں دیکھتا رہا، اس لئے نہیں کہ خواجہ حسن نظامی اور دوسرے مشاہیر کی رائیں میں نے پڑھی تھیں۔ بلکہ میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسے انسان کو دیکھا تھا جس سے براہِ راست رسمی تعارف کے بغیر بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ روح اس سے برسوں سے آشنا ہے۔ جلسہ کے اختتام پر سب لوگ ان سے مصافحہ کرنے لگے، میں بھی بڑھا مگر مصافحہ نہ ہو سکا۔ بہادر خاں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے گھر پر ملوں"۔

اس واقعہ کے چند دن بعد شہر حیدرآباد میں میلاد النبیؐ کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ یہیں میری دوسری بار ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مجھ سے کہنے لگے "آپ میرے گھر تشریف نہیں لائے"۔

اور تاکید کی کہ دوسرے دن تین بجے اُن سے گھر پر ملوں۔ دوسرے دن

بیت الامت پہنچا (جو ان دنوں مہدوی منزل کہلاتا تھا) اور بہت سے ملاقات کے آرزومند کمرۂ ملاقات میں بیٹھے تھے۔ میں نے بھی اپنا کارڈ بھیجدیا، کوئی دس منٹ انتظار کیا اور اُٹھ کر چلا آیا۔

ہمارے محلّہ میں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ میری اکثر شامیں احباب کے ساتھ وہیں گذرتی تھیں۔ اس واقعہ کے کوئی تین چار دن بعد شام کے وقت اسی چائے خانے میں ہم سب جمع تھے۔ علی اختر مرحوم اور جوش ملیح آبادی کی شاعری زیر بحث تھی۔ ایک صاحب جھوم جھوم کر جوش صاحب کے رندانہ اشعار پڑھ رہے تھے اور دوسرے صاحب کہہ رہے تھے :۔

"رندی اور سرمستی کی ان ہی روایات نے ہماری شاعری کو ڈبو دیا ہے"

اچانک چائے خانے میں کچھ ہل چل سی محسوس ہوئی۔ چائے خانے کے مالک خوشی سے ہانپتے ہوئے یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے۔ "یہاں بیٹھے ہیں"

ہماری نظر ادھر اٹھی ان کے ساتھ بہادر خاں کھڑے تھے۔ وہی متبسم چہرہ، وہی دلنواز نظریں؛ لیکن اس دفعہ نظروں میں معذرت کی ایک جھلک بھی تھی، مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے :۔

"آپ آئے اور چلے گئے۔ میں اس وقت حمام میں تھا اَب اس کی تلافی کیلئے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"

میری اور ان کی نسبت آفتاب اور ذرّے کی بھی نہیں تھی، میں اس خلوص اور وسعت قلب کو دیکھ کر حیران رہ گیا، یہ میری اور بہادر خاں مرحوم کی ملاقات کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ میری طرح سینکڑوں عقیدت کیش ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ہر شخص اپنی جگہ یہی سمجھتا تھا کہ لطف خاص صرف میرے لئے ہے۔

ان ملاقاتوں میں مسلمانانِ حیدرآباد، مسلمانانِ ہند اور عالمِ اسلام کے

ملّی مسائل موضوع گفتگو رہتے تھے۔ تاریخ اسلام اور فرنگی استعماریت کے موضوعات پر بہادر خاں کی گفتگو سُن کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ غور و فکر کی سینکڑوں نئی راہیں روشن ہو گئی ہیں۔ ان کا اندازِ فکر ملّتِ اسلامیہ حیدر آباد کی اجتماعی فکر میں مرکوز تھا۔

بڑے آدمیوں کی صحبت اکثر آدمی کو کمتری کے احساس میں مبتلا کر دیتی ہے مگر بہادر خاں کی صحبت خود اعتمادی کی دولت بخشتی تھی۔

(حوالہ: ایک شخصیت ایک مطالعہ از مولوی محمد عمر صاحب مہاجر مرحوم بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، کراچی ص ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷)

"عمدہ کام، صحیح ایمان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مگر جب تک عمدہ کام نہ کئے جائیں صحیح ایمان قائم نہیں رہ سکتا چہ جائے کہ زیادہ ہو۔" سمرو

(مشمولہ کفایت شعاری از سیمو اسمائلز ۱۹۱۱ء
شائع کردہ کارپردازاں پیسہ اخبار)

۹۔ چودھری غلام عباس مرحوم صدر کشمیر مسلم کانفرنس، نواب صاحب کے فضایل نفس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر نہایت ہی مؤثر اور رُلا دینے والی تقریر کے بعد وہ جب بیٹھے تو میں ان کے ساتھ کی کرسی پر تھا۔ میں ان کی تقریر سے بے حد متأثر اور وارفتہ ہو گیا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا۔ لیکن سادہ مزاجی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود اسے چوما اور بعد میں میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اتنی عظیم المرتبت شخصیت اور لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ اور یہ اخلاق، خدا کی دَین ہے وہ جسے چاہے سرفراز کرے۔

(پیکر خلق و انکسار از چودھری غلام عباس صاحب
ص ۲۴۸، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

۱۰۔ صدر اعظم حکومتِ نظام سر اکبر حیدری نے قائد ملت کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ انتہا یہ کہ نواب صاحب کو گرفتار کر کے جیل کی سزا دلانے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر وہ اپنے منصوبوں میں ہزار کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے، جب یہ انتقال کر گئے تو خواجہ حسن نظامی نے نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ سر اکبر کو معاف کر دیں ـــــــــــــــــــ

اس وسیع القلب قائد کا جواب تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی تفسیر ہے۔

"تلک الایام نداولہا بین الناس" حیدری صاحب مر گئے اور ایک دن ہم سب، مر جائیں گے۔ خدا ایسی زندگی عطا کرے کہ لوگ ہمارا ذکر اچھے الفاظ میں کریں۔ جو مر گیا، اس سے رنج کیا، میں نے خدا کی طرف توجہ کر کے اکبر حیدری مرحوم کو دل سے معاف کیا اور ان کی مغفرت کے لئے دعا کی۔

(حوالہ: خط نمبر ۲۰۶ ص ۲۴۶، موسومہ خواجہ حسن نظامی
مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل)

۱۱۔ ایک چپراسی صاحب، بہادر خاں کے بڑے اعتماد کے کارکن تھے۔ ایک دفعہ جب وہ ملنے گئے اور کمرے میں بلائے گئے تو بیچارے ٹھٹھک سے گئے کیوں کہ اس وقت ان کے ناظم صاحب مصروفِ تکلم تھے۔ بہادر خاں نے بات کو تاڑ لیا اور کہا کہ آپ چپراسی ہوں گے دفتر میں۔ میرے پاس تو سب برابر ہیں بلکہ آپ تو میرے رفیق ہیں،

یہ کہہ کران کو اپنے بازو صوفے پر بیٹھالیا۔

(مولوی سیّد جلیل اللہ حسینی مضمون کیا پوچھتے ہو کسے کھودیا) ———————

۹

دنگ تھے سب اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ کمال
وہ تھی باطن کی تجلی وہ تھا چہرے کا جمال

تعلیم، تعلیمی مسائل اور طالبِ علموں سے قائدِ ملّت کی دلچسپی

قائدِ ملت نے ملت کے مسائل کے سلسلے میں چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو بھی کبھی نظر انداز نہیں فرمایا، تعلیمی مسائل اور طالب علموں سے تو انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی اس خصوص میں وہ خود فرماتے ہیں:۔

"تعلیم قوموں کی تعمیر میں بنیاد کا درجہ رکھتی ہے اور جب تک بنیاد مضبوط نہ ہو قوموں کی اصلاح ممکن ہی نہیں۔ ذرا تنظیم سے فارغ ہو جاؤں تو انشاء اللہ سب سے پہلے تعلیمی مہم ہی کو اپنے ہاتھ میں لوں گا۔

(حوالہ: مکتوب ۲۳۲ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی)

وائس پرنسپل جاگیر کالج کو اپنے ایک خط میں طالب علموں کے تابناک مستقبل کی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اب یہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ وہاں سے ملک کے ایسے سپوت پیدا ہوں جو ہمارے تاریک مستقبل کو اپنے خلوص وعمل کے نور سے جگمگا دیں۔"

(حوالہ: خط نمبر ا۴ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ)

تعلیم کے وسیلے سے ان میں زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا ان کا مطمح نظر تھا، ایک غریب طالب علم کی قاضی محمد حسین نائب امیر جامعہ کے نام سفارش کرتے ہوئے کس دردمندی کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

"خاکِ دکن میں ایسے کتنے جواہر ریزے ہوں گے جن کو غربت چمکنے

نہیں دیتی، آپ کے دستِ شفقت کی ایک ادنیٰ حرکت ان کو منجلی کر سکتی ہے۔"

حیدرآباد سے پنجاب اور لاہور جاکر طلبہ علوم شرقیہ کے امتحانات میں شرکت کیا کرتے تھے جو طلبہ شریک امتحان ہوتے تو ایک تو انہیں مالی اعتبار سے زیر بار ہونا پڑتا، دوسرے دروغ بیانی کا سہارا لے کر ایک صداقت نامہ حاصل کرنا پڑتا کہ طالب علم مذکور نے دہلی، پنجاب یا لاہور کے کسی ادارہ میں تعلیم حاصل کی ہے (منشی کا امتحان، حیدرآباد میں میٹرک کے مماثل حقوق کا حامل تھا) اس خصوص میں قائدِ ملت نے اس امر کی کوشش کی کہ یہ امتحانات ملک کی قدیم علوم مشرقیہ کی جامعہ، جامعہ نظامیہ میں ہوں، قائد ملت کی مساعی سے علوم شرقیہ کے امتحانات جامعہ نظامیہ کے تحت حیدرآباد میں ہونے لگے (جامعہ نظامیہ فضیلت جنگ مولوی انوار اللہ خاں صاحب جیسے ذی علم، عالم دین کا قائم کردہ ہے۔ اس جامعہ کے بارے میں قائد ملت نے تحریر فرمایا تھا کہ جامعہ نظامیہ ملک کی قدیم درسگاہ ہے اس کے فرزندوں نے ملک کی جو خدمت کی اور اہل ملک کے لئے جو سامان بیداری مہیا کیا وہ ہم سب کے تشکر کا باعث ہے)

طالبات کے لئے علیگڈھ میٹرک کے سلسلے میں قائد ملت کی کوششوں سے حیدرآباد میں مرکز قائم ہوا۔ یہ امر موجب سہولت ہوگیا کہ وہ حیدرآباد ہی میں امتحان دیں۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر علیگڈھ نے نواب صاحب کی کوششوں کو اپنے تعاون سے ثمرآور بنایا۔ اس طرح طالبات سفر کی صعوبتوں اور اخراجات بیجا سے بچ گئے۔

مجلس اتحاد المسلمین کے تحت اور دینی درسگاہوں میں دی جانے والی علوم شرقیہ کی تعلیم سے بھی نواب صاحب کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں، وہ چاہتے تھے کہ طلبہ و طالبات علوم شرقیہ کے دریائے علم سے سیراب ہو کر چمن اسلام کی سرسبزی کا باعث بنیں اور اخلاص و صداقت کے ساتھ قوم کی

خدمت کریں۔ علوم شرقیہ کے امتحانات کے سلسلے میں مولوی عبدالقدیر صاحب صدیقی کے نام اپنے ایک خط میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جو طالبعلم علم تفسیر میں ممالک محروسہ سرکار عالی میں بدرجہ اول کامیاب ہو اس کو میری طرف سے ایک تمغہ (طلائی) بطور انعام دیا جائے گا تاکہ طلبہ میں تفسیر کا شوق پیدا ہو۔" (حوالہ: مکتوب نمبر ۵۶۳ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ)

اُردو کی ترویج اور اردو ذریعہ تعلیم کی جامعہ، جامعہ عثمانیہ کی مادری زبان میں تعلیم کے پروگرام کی اشاعت میں نظام کالج ایک متوازی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اس خصوص میں قائدِ ملّت نے اپنے اہم سیاسی خطبہ میں جو انہوں نے صدر مجلس اتحاد المسلمین کی حیثیت سے دیا تھا، اس خصوص میں اپنے تعلق خاطر کا اظہار جس انداز میں فرمایا اس سے ان کے تعلیمی نظام سے خصوصی تعلق خاطر کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"میں حکومت کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہر سمجھدار فرزندِ ملک جامعہ کے مستقبل کے متعلق اس وقت بے چین ہے اور اس کی اس بے چینی سے واقف ہونا حکومت کا فرض ہے، مجلس اتحاد المسلمین بھی چوبیس لاکھ مسلمانوں کی آئندہ نسل کے متعلق اظہار رائے کا حق رکھتی ہے اس وقت اپنی قطعی اور تفصیلی رائے کے اظہار سے قاصر ہے جب تک کمیشن کی پوری رپورٹ اسکے سامنے نہ ہو۔

نظام کالج کا مسئلہ جامعہ عثمانیہ سے کچھ کم اہم نہیں ہے، جامعہ کے قیام کے بعد سے نظام کالج اصحاب فکر کے نزدیک ایک معمہ بنا ہوا ہے، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب حیدرآباد نے ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیکر ایک مستقل جامعہ اپنے یہاں قائم کرلی اور جب کہ یہ جامعہ تجربہ کے تمام ادوار سے گذر چکی اور ہندوستان کے مختلف مکاتیب خیال کے زعماء نے اس تجربہ کو کامیاب پایا اور بلا اختلاف اظہار استحسان کیا جس میں مشہور کانگریسی زعیم راجہ گوپالا چاری

اور مشہور مفکر رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو بھی شامل ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ملک میں نظام کالج کے ذریعہ ایک متوازی طریقہ تعلیم کو جاری رکھا جائے اور اس کا الحاق ایک بیرون ملک کی جامعہ سے باقی رکھا جائے، ہمارے اپنے ملک کے ہندو لیڈرز میں سے مسٹر نرسنگ راؤ جیسے صاحب فکر اور مخلص کارکن نے میکنزی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے اس کالج کے جامعہ عثمانیہ کے ساتھ الحاق کو پسند کیا تھا، میکنزی کمیٹی کے سامنے ان کی رائے کو انفرادی حیثیت دی جاسکتی ہے لیکن مجھ سے حیدرآباد کی ساری ہندو قوم کے معتمد علیہ نمائندہ کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے نظام کالج کے جامعہ عثمانیہ سے الحاق کو منظور کیا اور ان کی یہ منظوری حیدرآباد کی ساری ہندو قوم کی منظوری ہے کیوں کہ ان کو اس گفتگو کے وقت حیدرآباد کے سارے ہندو زعمار کا خط اعتماد حاصل تھا۔ مجھے معتبر ذرائع سے یہ اطلاع ملی کہ نظام کالج کو طلبار فراہم کرنے والے تمام مدارس فوقانیہ کو ہمارے سررشتہ تعلیمات نے اُردو میں تعلیم دینے کی ہدایت کر دی تھی لیکن مجھے یہ سُن کر افسوس و استعجاب ہوا کہ پھر سررشتہ کی پالیسی متزلزل ہو رہی ہے اور ان احکام کو واپس لیا جارہا ہے۔ میں سررشتہ تعلیمات سے مطالبہ کرتا ہوں کہ نظام کالج کو بعجلت ممکنہ جامعہ عثمانیہ سے ملحق کرے اور ملک کے تعلیمی اداروں کی اس دوعملی کو مٹائے۔"

(حوالہ: خطبات قائد ملت، مرتبہ نذیرالدین احمد، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی۔ حیدرآباد)

"انجمن ترقی طلبہ حیدرآباد" کے نام سے "مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن کے طلبار کی ایک تنظیم تھی جس کا قیام ۱۹۳۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس تنظیم کو قائد ملت بہادر یار جنگ کی سرپرستی حاصل تھی اور انہوں نے اس کے قیام اور استحکام میں ذاتی دلچسپی لی تھی، اس کے جلسوں اور دیگر

تقاریب میں وہ نہ صرف شرکت فرمایا کرتے تھے بلکہ دامے درمے مدد بھی فرماتے تھے اور دیگر اہل خیر کو بھی اس کی امداد کی طرف متوجہ فرماتے تھے اس انجمن نے تقریباً دس سال تک طلبہ برادری کی پرخلوص خدمت کی، ان میں علمی وادبی ذوق پیدا کیا اور اس کی جانب سے تقریری وتحریری مقابلوں کے علاوہ مذاکروں اور مشاہیر علم وادب اور دانشوروں کی تقاریر کا سالانہ پروگرام نہ صرف مرتب ہوا کرتا تھا بلکہ اس پر سختی سے عمل بھی ہوتا تھا، اس انجمن میں اگرچہ ہندو مسلم طلباء شامل تھے تاہم اس کی یہ سرگرمیاں اور بالخصوص قائد ملت کی سرپرستی کے باعث یہ تنظیم آریہ سماجی طلباء کے دلوں میں خار بن کر کھٹکنے لگی اور انہوں نے وفاق طلباء سے ایک علیحدہ انجمن کی بنیاد ڈالی۔

اس طرح ہندو مسلم طلباء میں نفاق کا بیج بویا جو آگے چل کر برگ و بار لایا اور اسی ہندو طلباء تنظیم کی شہ پر ہندو طلباء کی ایک خاص تعداد نے ۱۹۳۹ء میں جامعہ عثمانیہ کا بائیکاٹ کیا اور ناگپور یونیورسٹی میں داخلہ لیا، لیکن ان کی یہ مہم ناکام ہوگئی اور بالآخر انہیں واپس جامعہ عثمانیہ میں آنا پڑا۔

اگرچہ مادر جامعہ نے انہیں بخوشی اپنے آغوش میں لے لیا تھا، تاہم ہندو طلبہ کا یہ گروہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا اور اس نے یہ مہم چلائی کہ جامعہ عثمانیہ کا نام اور مانوگرام (انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابہا) یونیفام نیلی شیروانی بدل دیا جائے اور شعبۂ دینیات (اسلامیات) کو ختم کر دیا جائے۔ انجمن ترقی طلباء نے ان کی اس شرارت کا مقابلہ کیا۔ اس طرح ستمبر ۱۹۴۸ء تک جامعہ عثمانیہ کا اسلامی کردار برقرار رہا۔"

(حوالہ: مکاتیب بہادر یار جنگ ص ۲۵۱، حواشی از مولوی محمد احمد خاں صاحب)

جامعہ عثمانیہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، ندوۃ العلماء، جامعہ نظامیہ اور دیگر تعلیمی اداروں سے ان کی وابستگی اور دلچسپی آخری دم تک باقی

و برقرار رہی اور جس کی ترقی و ترویج میں انہوں نے ہمیشہ امکانی تعاون فرمایا۔

بلوچستان میں ایک ہائی اسکول کے قیام میں مدد کے سلسلے میں جب نواب صاحب سے ارباب متعلقہ نے ربط پیدا کیا تو اس خصوص میں انہوں نے ارباب حکومت اور صدر اعظم باب حکومت سے اس خصوص میں جو نمائندگی فرمائی اس کا حال سُن کر حیرت ہوتی ہے کہ ۸ کروڑ مسلمانوں کا قائد جس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا ایک معمولی ہائی اسکول کی مدد کے لئے کس قدر کوشاں تھا۔

نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری صدر اعظم دولتِ آصفیہ
حیدرآباد

جناب مکرم و محترم! بلوچستان کے گذشتہ دورہ میں مجھے اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ کے معائنہ کا موقع ملا۔ بلوچستان کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت خراب ہے اور یہ ہائی اسکول ان کا واحد تعلیمی ادارہ ہے۔ گذشتہ زلزلے نے اس کی عمارت کو تباہ و برباد کر دیا تھا، اب قاضی محمد عیسیٰ خاں صاحب اس عمارت کی تعمیر اور مدرسہ کے استحکام کی فکر میں ہیں۔ مدرسہ کی مختصر رپورٹ جو میری معلومات کے لئے مرتب کی گئی تھی رشتہ دوز کر رہا ہوں، جس کے ملاحظہ سے آپ پر تمام حالات روشن ہوں گے، بلوچستان کے مسلمان نہایت مفلس ہیں اور ان کی اقتصادی حالت بہت پست ہے اس لئے اس ادارے کے کارکن ہندوستان کے رؤسا کی خدمت میں دست سوال دراز کر رہے ہیں چنانچہ ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال نے اس مدرسہ کے لئے ۱۲ ہزار روپیہ کا عطیہ مرحمت فرمایا۔ قاضی صاحب جب گذشتہ دفعہ حیدرآباد آئے تھے تو انہوں نے آپ کی خدمت میں بھی سلطنتِ آصفیہ کی طرف سے سرپرستی و اعانت کی درخواست کی تھی، دولتِ آصفیہ کا دستِ کرم مشرق کے ہر گوشہ پر دراز ہے اور کوئی تعلیمی ادارہ ایسا نہیں جس کی یہاں سے سرپرستی نہیں کی گئی ہو، دارالعلوم دیوبند، ہندو

یونیورسٹی بنارس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، شانتی نکیتن، مدرسہ عالیہ فرنگی محل، آندھرا یونیورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور اور ایسے پچاسوں ادارے ابر کرم آصفی سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں، میں بلوچستان کے مدرسۂ اسلامیہ کو ان سب سے زیادہ مستحق سمجھتا ہوں اور اس کی طرف جناب کی توجہ مبذول کراتے ہوئے دل سے متمنی ہوں کہ اس کے لئے سلطنت اسلامیہ آصفیہ کے شایان شان امداد منظور فرمائی جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ کی وجہ سے خزانۂ آصفی پر آجکل بہت بار ہے لیکن "بر کریما کارہا دشوار نیست"۔ امید کہ جناب اس طرف بعجلتِ ممکنہ اپنی توجہ خاص مبذول فرمائیں گے۔

(حوالہ: مکتوب نمبر ۴۴۳ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی)

اسی طرح بلوچستان میں کالج کے قیام کے سلسلے میں نواب صاحب نے سر احمد سعید خاں آف چھتاری کے نام جو باب حکومت دولت آصفیہ کے وزیر تھے، قاضی محمد عیسیٰ خاں بیرسٹر معتمد انجمنِ اسلامیہ کوئٹہ بلوچستان کی جانب سے ایک درخواست خود مرتب فرمائی اور حکومت میں پیش کی۔

جناب مکرم و معظم!

آپ جیسے وسیع النظر شخص کی نگاہوں سے یہ امر ہرگز پوشیدہ نہ ہوگا کہ بلوچستان اپنی ہر جہتی حیثیت کے اعتبار سے ہندوستان کا سب سے زیادہ بدبخت صوبہ ہے۔ یہاں تقریباً تمام آبادی مسلمانوں کی ہے جو مالی حیثیت سے انتہائی فلاکت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں، تعلیمی اعتبار سے یہاں کا اوسط تمام صوبہ جات سے گھٹا ہوا اور نفی کے برابر ہے۔ گذشتہ قیامت خیز زلزلوں نے اس ملک کو تباہی کے انتہائی حدود تک پہنچا دیا، بحمد اللہ یہاں کے باشندوں میں اپنی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہو گیا ہے، لیکن عام افلاس اور معاشی پستی نے اُن کے احساسات کی تکمیل کے تمام راستے مسدود کر رکھے ہیں۔ بلوچستان

کے مخلص قومی کارکنوں نے اور تمام خرابیوں کے دور کرنے کے لئے کامل غور و فکر کے بعد یہ واحد علاج تجویز کیا ہے کہ بلوچستان کی تعلیمی ترقی پر سب سے پہلے توجہ دی جائے۔ اور خدا کے فضل و کرم اور مسلم رؤسائے ملک کی امداد و اعانت کی توقع پر ایک کالج کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس کی عمارت کے لئے مبلغ.... روپے کے اخراجات کا اندازہ کیا جارہا ہے اور جس کا سالانہ متوالی خرچ تقریباً ـــــــ روپے ہوگا، میں اس امر کے اظہار پر مسرت محسوس کرتا ہوں کہ مسلم رؤسائے ہند نے ہماری اس تجویز پر توجہ کی، چنانچہ ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال نے ۱۲ ہزار روپے کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا۔

سلطنت اسلامیہ آصفیہ کے بذل و نوال کا دریا ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو سیراب کررہا ہے۔ آندھرا یونیورسٹی، شانتی نکیتن، ہندو یونیورسٹی بنارس، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اسی کے دامنِ فیض میں پرورش پارہے ہیں۔ ابھی دو سال قبل جلالت الملک سلطان دکن کی فیض بخشی سے ہمارے ہمسایہ صوبہ سرحد کا اسلامیہ کالج بہرہ اندوز ہوچکا ہے لیکن ہم باشندگانِ بلوچستان جو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اس سلطنت اور اس کے تاجدار کی عقیدت کا بے پایاں جذبہ رکھتے ہیں اور اس سلطنت کی بقا کے لئے قربان ہونے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، آج تک محروم ہیں۔ اب جب کہ ہم نے انتہائی نیک مقصد کے لئے عزم صمیم کرلیا ہے اور ایسا عزم کرلیا ہے جس کی تکمیل حضرت سلطان العلوم کی دستگیری کے بغیر ممکن نہیں، ہماری درخواست ہے کہ اس صوبہ کے غیور اور بہادر باشندوں کی تعلیم کے لئے سلطنت آصفیہ سے ہماری شایانِ شان امداد فرمائی جائے جو ہم کو اس عالم دار و گیر میں ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچائے، تعمیر عمارت کے لئے یک مشت امداد کے علاوہ ایسی

سالانہ امداد منظور فرمائی جائے جو اس کالج کے بقاء و استقلال کی ضامن ہو۔

"میں ہوں آپ کا مخلص"

(حوالہ: مکتوب نمبر ۱۹۷ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی)

اس طرح مسلم تعلیمی اداروں کی مدد کو وہ قومی ضروریات کی اساسی اہمیت کی حامل ضرورت سمجھتے تھے۔

جناب شیخ احمد سی آئی ایس سابق اسپیشل سینئر کرسس پاڈ نٹ آل انڈیا ریڈیو جموں وکشمیر اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

"میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا انوار العلوم میں پڑھتا تھا۔ مولوی علی شبر ہاشمی صاحب مالکِ کتاب خانہ سائنس ٹیچر تھے، ان کے ہمراہ ڈیوڑھی گیا۔

دورانِ گفتگو میں حضرت قائد ملت نے قرآن شریف کی تلاوت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر گھر میں قرآن شریف کا کسی نمایاں مقام پر رکھا ہوا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے، نواب صاحب نے سمجھایا کہ قرآن شریف اگر کسی نمایاں مقام پر رکھا رہے تو ایک ایک دن اس کی تلاوت کی توفیق ضرور حاصل ہو گی۔

نواب صاحب نوجوانوں سے ربط کے سلسلے میں نوجوانوں کو بلاتے اور ان سے دینی اور عوامی مسائل پر باتیں کرتے اور ان کا ذہن بناتے تھے۔

ملک گیر شہرت کے حامل ڈاکٹر معین الدین خاں ساندوزی رقمطراز ہیں کہ:

"راقم الحروف ہائی اسکول کا طالب علم تھا، جب ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی دن تعطیل کریں گے اور قلعہ گولکنڈہ اور قطب شاہی مقبروں کو تفصیل سے دیکھیں گے تو ناظم آثار قدیمہ اور مددگار ناظم جوان دنوں خواجہ حمید احمد اور خواجہ محمد احمد صاحب تھے ان کو گائیڈ بنا کر خود ڈرائیوری کرتے ہوئے پورا

دن اسلامی فن تعمیر کی تفصیلات کی اسٹیڈی کرتے ہوئے گذارا۔ طالب علموں کی مدد کرنا، ان کے ساتھ مباحث میں حصّہ لے کر ان کے دماغوں کی الجھنوں کو دور کرنا اور ان کی ذہنی تعمیر کرنا انہوں نے اپنا مشن بنا رکھا تھا۔

(حوالہ: بہادر یار جنگ چند یادیں از ڈاکٹر معین الدین خاں ساندوزی مشمولہ روزنامہ سیاست حیدر آباد۔ ۹ر جولائی ۱۹۸۴ء)

عثمانیہ یونیورسٹی میں قیام کے دوران دو سال تک نواب بہادر یار جنگ سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ہر تقریب میں طلبہ برادری نواب بہادر یار جنگ کو شرکت کی دعوت دیتی تھی۔ مختلف اقامت گاہوں کی تقریبات میں بھی نواب صاحب شریک ہوتے تھے۔

راقم الحروف بی ہاسٹل میں رہتا تھا، نواب صاحب بی ہاسٹل کی متعدد تقریبات میں تشریف لائے، جس تقریب میں نواب صاحب موجود ہوتے طلبہ برادری ان سے تقریر کی گذارش ضرور کرتی تھی، جامعہ کے سالانہ جلسے میں نواب صاحب ضرور تشریف لاتے تھے، ڈنر کے بعد ان کی تقریر لازمی ہوتی تھی۔

بہادر یار جنگ اپنی تقریر میں لسانیات کا جوہر دکھاتے اور فکر و نظر کی بہار لٹاتے تھے، تقریر کیا ہوتی موتی رولیتے تھے۔ سامعین ان کی تقریر سن کر جھوم اٹھتے، مسرور اور متکیف ہو جاتے، ان کی گفتگو سے محفل کشت زار زعفران بن جاتی تھی۔

(حوالہ: نواب بہادر یار جنگ، ایک نفسیاتی جائزہ ص ۱۶۲۔ از مولوی محمد انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ)

بُلبلِ ہند

سروجنی نائیڈو

سرزمین دکن کی قابلِ فخر بیٹی سروجنی نائیڈو (۱۹۴۹ — ۱۸۷۹) دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بچپن ہی سے ان کا مزاج شاعرانہ تھا، ۱۱ سال کی عمر میں انہوں نے پہلی نظم لکھی اور اسی دن سے انکی شاعری کی ابتداء ہوئی، ان کی ذہانت غیر معمولی تھی، بارہ برس کی عمر میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۶ سال کی عمر میں (GIRTON) کالج کیمبرج میں داخلہ لیا، صحت کی خرابی کے باعث وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں اور لندن سے تبدیلی آب و ہوا کیلئے اٹلی چلی گئیں، آب و ہوا کی یہ تبدیلی راس آئی۔ ۱۸۹۸ء میں وہ وطن واپس ہوئیں جب کہ ان کی عمر ۱۸ سال تھی، اسی سال ان کی شادی ڈاکٹر گوبند راجلو نائیڈو سے قرار پا گئی۔ لیکن ان کا ادبی ذوق پروان چڑھتا گیا۔ ۲۰ سال کی عمر میں گولڈن تھریڈ شو ولڈ (THE GOLDEN THRE SHOLD) کے نام سے ان کا پہلا دیوان شائع ہوا، ادبی دنیا میں پہلی بار وہ پورے آب و تاب کے ساتھ سامنے آئیں، اس دیوان کے کئی اڈیشن شائع ہوئے اور بنگالی زبان میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہوا (ان کے جملہ چار دیوان اور نثر میں دو کتابیں شائع ہوئیں) شاعری سے ان کی دلچسپی روز افزوں رہی، وہ زندگی بھر پیار کے نغمے گاتی رہیں، شاعری سے ان کی رغبت اور دلچسپی کا اظہار خود ان کے اس خیال سے ہوتا ہے کہ "شاعری ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے

میں اپنے جذبات قلبی کی ترجمانی کر سکتی ہوں"؛

اگرچہ ابتدائی شاعری میں وہ مغربی طرز، مغربی افکار و خیالات پر تلتی رہیں لیکن اڈمن بوس نے انہیں ہندوستان کے بارے میں اور ہندوستانی طرز پر لکھنے کا مشورہ دیا، اس مشورے کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ہندوستانی طرز فکر کو اپنا کر انگریزی زبان میں ہندوستانی تہذیب کو سمودیا اور اس طرح ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی نظموں میں مشرق و مغرب کا خوشگوار امتزاج ہے، شری امر ناتھ جھا آنجہانی نے ان کی شاعری کے متعلق لکھا تھا:-

" مدھر کوتیاوں کی خالق کی حیثیت سے ان کا شمار ہندوستان کے بہت ذہین اور باکمال شعراء میں ہوتا ہے، ان کے الفاظ بدیسی ہیں۔ عروض کا سانچہ انگریزی لیکن خواب اور تصورات سب ہندوستانی ہیں"؛

اسی شاعرہ کی تصویر کے دو رُخ اور بھی ہیں، ایک سماجی خدمت دوسرے سیاسی خدمات، انہیں اپنے وطن حیدر آباد دکن سے محبت نہیں عشق تھا۔ اہل حیدر آباد کی سماجی خدمت گذاری کا ایک عظیم پس منظر ان کی ان خدمات کا معترف ہے۔ ۱۹۰۸ء میں جب حیدر آباد میں طغیانی آئی تھی۔ اس وقت انہوں نے مصیبت زدگان کی جو مثالی خدمت انجام دی جس پر انہیں حکومتِ برطانیہ نے خطاب سے نوازا تھا۔

۱۹۱۴ء میں وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملیں اور اسطرح ۱۹۱۴ء سے وہ سیاسی طوفانوں کے ساتھ ہو گئیں' اینی بسنت ہوم رول تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جائنٹ سلکٹ کمیٹی کے سامنے ۱۹ر خواتین کی کمیٹی کی نمائندہ کی حیثیت سے نمائندگی کی۔ جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل سے پہلے وہ کانگریس کی صدر چنی گئیں، گاندھی جی کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر کی حیثیت سے افریقہ

بھیجی گئیں۔ ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی کے ساتھ جیل بھی گئیں۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑدو تحریک کے ضمن میں ان کو گرفتار کیا گیا۔ وہ کانگریس کے عظیم مجاہد رہنماؤں میں سے ایک تھیں جنہوں نے جنگ آزادی میں جان کی بازی لگادی۔ آزادی کے بعد وہ ۱۹۴۷ء میں گورنر بنائی گئیں اور دم آخر تک اس عظیم عہدے پر فائز رہیں۔

سروجنی نائیڈو کے خطابت کا شہرہ بھی ہر سو تھا۔ وہ خطیب بے بدل تھیں، ان کی شخصیت کے اس مختصر تعارف کے بعد قائد ملت سے ان کے تعارف اور تعلق کے بارے میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۲۷ء تک نواب صاحب سے ان کا شخصی تعارف بھی نہیں تھا، البتہ ان کی علمیت اور خطابت کی شہرت سے نواب صاحب واقف تھے اور پہلی بار ۲۲ راکتوبر ۱۹۲۷ء کو بطور خاص ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر سننے کیلئے نواب صاحب تشریف لے گئے، اس تقریر کا حال نواب صاحب نے اپنی ڈائری میں قلمبند فرمایا تھا وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ٹھیک ۶ بجے ٹاؤن ہال کو واپس آیا، اسٹیج کے قریب اچھی جگہ مل گئی، طلبا و اساتذہ جامعہ عثمانیہ اور دیگر عہدہ داران و علم دوست حضرات کا بڑا مجمع تھا، مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب صدر کلیہ عثمانیہ نے صدارت کی، مسٹر سروجنی نائیڈو نے ہندو مسلم اتحاد کے عنوان پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس عورت کی قوت خطابت کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، تقریر ایسی مسلسل اور مرتب تھی کہ ایک سکنڈ کے لئے بھی کسی نے اس کو خاموش ہوتے نہ دیکھا اور ایک جملہ بھی ایسا نہ تھا جو بھرتی کا ہو اور اس روانی کے ساتھ۔ فصاحت کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا شعر پڑھ رہی ہیں۔

(حوالہ: بہادر یار جنگ کی ڈائری، مرتبہ: نذیرالدین احمد
ص ۲۷ - ۲۲ راکتوبر ۱۹۲۷ء)

جب بھی ان دو عظیم ہستیوں کا تعارف ہوا، یقیناً وہ یادگار لمحات ہیں۔ بعد کی روئیدادوں سے جو تفصیلات ملتی ہیں۔ اس سے اس تعلق و نسبت پر مسرت ہوتی ہے، قائدِ ملت، بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کو ماں کہتے تھے اور بلبلِ ہند انہیں اپنا بیٹا۔ ماں کے دل میں اپنے اس آتش بیان، شعلہ نوا، صاحب علم و فضل بیٹے کی کس قدر محبت جاگزیں تھیں، اس کا اندازہ، گنیش اتسو کے جلسے میں نواب صاحب کے بارے میں ان کے گراں قدر ارشادات سے ہوتا ہے۔

۲۶ راگسٹ ۱۹۴۱ء کو حشمت گنج میں سروجنی نائیڈو کی صدارت میں "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" کے زیر عنوان بہادر یار جنگ نے تقریر فرمائی تھی۔ تقریر سے قبل سروجنی نائیڈو نے اپنی فصیح و بلیغ تقریر میں نواب صاحب کا تعارف کروایا، جس کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا کہ:

"صدر محترمہ نے میرا تعارف کراتے ہوئے جو جملے استعمال کئے ہیں، اس کا میں شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ چوں کہ میں ان کو ماں کہتا ہوں اس لئے انہوں نے میری نہیں بلکہ خود اپنی تعریف کرلی۔

نواب صاحب کی اس یادگار تاریخی تقریر کے بعد سروجنی نائیڈو نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا" ایسی تقریر کے بعد میری کیا مجال ہے، جو کچھ بیان کروں صرف اتنا کہتی ہوں۔

؎ بلبل کو گل مبارک، گل کو چمنِ مبارک
رنگین طبیعتوں کو رنگین سخنِ مبارک

سروجنی نائیڈو کی ذات، انسانیت کے اعلیٰ جذبات کا پیکر تھی، جیسے کہ خود انہیں اس حقیقت کا احساس تھا جو مبنی برحقیقت ہے کہ" خدا نے کسی مقصد کے تحت مجھے غیر جانبداری کے منفرد انعام

......کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔"

جس وقت سروجنی نائیڈو کو بہادر یار جنگ کی روح کے قفس عنصری سے پرواز کر جانے کی اطلاع ملی تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئیں، بلبل ہند کی زبان گنگ ہو گئی۔ آنکھوں سے اشک رواں چلے، کئی دن تک وہ اس المناک حادثے کے اثر سے متاثر رہیں، جب کچھ سنبھلیں تو نظم میں اپنے بیٹے بہادر خاں کو خراج عقیدت کے آنسو جو سلک گہر تھے، پیش کئے۔ اس نظم میں قائد ملت کی شخصیت کی جو تصویر ملتی ہے، وہ اس خاکدان ارضی میں ... ان کی حیات جاوید کی دیدہ و شنیدہ تصویر ہے۔ اور اس نظم میں ایک عظمت خاتون کے تاثرات قلبی کا مقناطیسی جذب اور جذبہ اندرون کا کرب بھی پوری طرح نمایاں ہے ـــــــــــــــ

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو آنجہانی کا نالۂ شیون

اپنی حرماں نصیبی کے نشتر اول سے گھائل ہو کر چوں کہ ہم ابھی اندوہ غم کے سیلاب میں غوطے کھا رہے ہیں اس لئے اس ملی نقصان کا صحیح صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے، جو ایسی ہستی کی بے وقت موت کی وجہ سے عائد ہوا ہے، جس نے اپنی زندگی ہی میں وہ عظیم المرتبت حیثیت اختیار کر لی تھی جس کی نظیر صرف ماضی کی داستانوں میں ملتی ہے۔

اس نوجوان دلیر افغان سپاہی کی ذات جو سب کو اس درجہ محبوب اور ہر دلعزیز تھی جسے شباب کی عین فصلِ بہار میں موت کے پنجہ نے نہایت المناک طریقہ پر ہم سے جدا کر دیا، جس کی مفارقت پر ملک کے وسیع طول و عرض میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔

اس کی ذات کہیں زیادہ ان صفات سے متصف تھی جو اس کی

اپنی بہادر اور شجیع نسل کی ممتاز خصوصیات ہیں، فطرت نے اس کو جسم، دماغ اور سیرت کے مؤثر اور نمایاں محاسن اس محیر العقول فیاضی کے ساتھ عطا کئے کہ ساری دنیا اس کی گرویدہ ہو چکی تھی، اس کی ذات، جرأت، حسن باطن، اخلاص، سادگی، پرجوش اور عالی ہمت انسانیت سے متصف تھی جس نے مختلف مذہب اور مسلک کے بے شمار انسانوں کو وابستۂ دامن الفت بنا لیا تھا۔

اس کی خطابت کی سحر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حسن و کمال سے ان گنت قلوب کے اندر ہیجان پیدا کر دیا، حریت کی راہ میں اس کا جذب دروں ناقابل شکست اور ان تمام مقاصد کے لئے جس کی اس نے اَن تھک جوش و سرگرمی کے ساتھ حمایت کی اس کا جذبۂ اشتیاق بے باک تھا۔ ان تمام نعمتوں کے منجملہ خدا داد مسلمہ قیادت کی سب سے بڑی نعمت جو قوموں کی زندگی میں بہت کمیاب ہوتی ہے اس مردِ مجاہد کو حاصل تھی۔ اگر اس کی عمر وفا کرتی تو زمانہ کا امتداد اس نعمت کے حسن کو دوبالا کر دیتا اور تجربہ کی پختگی اس کو ملت کی ایسی گراں مایہ متاع کی صورت میں تبدیل کر دیتی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم اسلام کی مذمت کے لئے مفید ثابت ہوتی۔ لیکن بہادر خاں جیسے انسان درحقیقت فنا نہیں ہوتے بلکہ ان بے شمار افراد کی مساعی کی بدولت اپنی تمناؤں، آرزوؤں اور خوابوں کی تعبیر پاتے ہیں جس کو انہوں نے اپنے مقناطیسی جذب دلکش سے متاثر کیا تھا، دنیا کی بہت سی با اقتدار ہستیوں کے لئے ان لاکھوں ابنائے وطن کا والہانہ خراج عقیدت بجا طور پر قابلِ رشک ہو سکتا ہے جو اسکے جنازے کے جلوس کے موقعہ پر المناک لیکن پُرشکوہ مناظر کی شکل میں ادا کیا گیا۔ یہ اسکی سب سے بڑی فتح اور اس خاکدان ارضی میں اسکی حیات جاوید کا درخشاں تاج ہے۔

ترجمہ از مولوی عبد الرحمٰن سعید (سعید صدیقی)۔

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ء ۔ ۱۹۴۱ء) کو بچپن سے شاعری سے دلی لگاؤ تھا، سات سال کی عمر میں انہوں نے پہلی نظم لکھی، ثقافت و تمدن سے متعلقہ علوم، ڈرامہ رقص، مصوری سے ان کا تعلق ان کی فطری دلچسپیوں کا آئینہ دار تھا، وہ فطرت پسند انسان تھے انہوں نے نظمیں گیت اور غنائیہ لکھے۔ ۱۹۰۹ء میں پہلی بار ان کی گیتوں کا مجموعہ گیتان جلی شائع ہوا۔ اور ۱۹۱۳ء میں انہیں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ یہ ایشیا کے پہلے ادیب تھے جنہیں اتنا بڑا اعزاز ملا۔ ٹیگور نے نوبل پرائز کی ساری رقم شانتی، نکیتن کو دے دی۔ ان کے گیت وطن پرستی سے سرشار قومی گیت ہیں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی اتحاد، وطن دوستی سے مملو جذبات پر مشتمل ان کا کلام ایک پوری نسل کے خیالات میں نمایاں تبدیلی، کا وسیلہ بنا۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں رابندر ناتھ ٹیگور کے قلم نے احساس آزادی کے جذبوں کو ابھارا۔ ان کے احساس کے... جذبوں پر مشتمل کلام..... صفحہ قرطاس سے قلوب کی دنیا میں ہلچل پیدا کرنے کا مؤثر وسیلہ ثابت ہوا۔ ٹیگور کا یہ ایقان تھا کہ دنیا کی تہذیب، کے عناصر تہذیب کو صحیح خطوط پر مجتمع کریں۔ نیشنلزم کا نعرہ ہی کافی، نہیں، اپنے اس نظریے کو حقیقت میں بدلنے کیسے انہوں نے شانتی

نکیتن کا قیام عمل میں لایا اور اس ادارے کیلئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔ شانتی نکیتن تحصیل علم کا ایک بڑا مرکز بن گیا ۱۹۱۸ء میں یہ اسکول یونیورسیٹی میں متبدل ہوگیا۔ اس یونیورسیٹی نے نو آبادیاتی تعلیمی نظام کے مقابلے میں انسانی وسائل کے فروغ کے لئے، تحصیل علم کا ایک نیا نظام مہیا کیا۔

یہ عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔ اگرچہ کہ گاندھی جی سے، ان کے مراسم گہرے تھے، ٹیگور ہی نے گاندھی جی کو مہاتما کا خطاب دیا تھا اور گاندھی جی ٹیگور کو گرودیو کہا کرتے تھے۔ سیاست سے دوری کے باوجود اپنے وطن سے ان کی گہری عقیدت، ان کے حساس قومی جذبات کی پاسباں تھی۔ جلیاں والا باغ کے المناک حادثے سے متاثر ہوکر انہوں نے وائسرے کو ایک سخت خط لکھا تھا اور ساتھ ہی سر کے خطاب سے دست بردار ہوگئے تھے۔ اس عظیم مفکر اور شاعر کے ... جذباب واحساسات قومی بنیادوں پر استوار تھے ٹیگور کو ہندو۔ مسلم، اختلاف پر بڑا دکھ تھا۔ نئی نسل میں وہ بھائی چارگی پیدا کرنے کے ... آرزومند تھے۔ ان کی نظمیں ان کے گیت اور غنائیہ ہندوستان کا ادبی قومی سرمایا ہیں جس پر قوم کو بجا طور پر ناز ہے ٹیگور عملی سیاست سے دور رہ کر ادب کی وساطت سے سیاست کی شعوری منزلوں میں شامل رہے۔ اس عظیم شاعر کی موت شعر، وموسیقی کی دنیا میں ایک جاں سوز حادثہ ثابت ہوئی۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی نواب صاحب سے پہلی ملاقات

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں ... حیدرآباد تشریف لائے تھے اور سروجنی نائیڈو کے مہمان تھے۔

اس عظیم شاعر کی دکن میں بڑی پذیرائی ہوئی اہل علم و فن، امراعظام کی محفلوں میں انہیں مدعو کیا گیا اور حیدرآباد کی سیر کروائی گئی۔۔
ایک دن جب ٹیگور سیر سے واپس ہوئے تو سروجنی نائیدو، نے پوچھا گرودیو آپ نے حیدرآباد دیکھ لیا۔ کہا ہاں پوچھا بہادر یار جنگ کو دیکھا (وہ پریشاں ہوئے کہ یہ کوئی عمارت کا نام ہے۔ یا یا کسی تفریحی مقام کا) کہا نہیں، تب سروجنی نائیدو نے کہا کہ پھر تو، آپ نے حیدرآباد دیکھا ہی نہیں۔ ٹیگور کا اشتیاق بڑھا پوچھا یہ، کیا چیز ہے۔ تب نواب صاحب کی شخصیت اور ان کی جادو بیانی، کا ذکر کیا گیا، ٹیگور ان کی تقریر سننے کے مشتاق ہوئے۔ نواب صاحب کو اطلاع دی گئی، کہ ٹیگور آپ کی تقریر سننے کے متمنی ہیں سرائیں جنگ کی دیوڑھی میں محفل منعقد ہوئی۔ ٹیگور نواب صاحب کی تقریر سے حد درجہ متاثر ہوئے قاید ملت کو شانتی نکیتن بلایا اور اپنا۔۔ مہمان رکھا، اور دم آخر تک نواب صاحب سے ٹیگور کی محبت قائم رہی۔ حیدرآباد کے قدیم علمی و ادبی۔ ماہنامہ شہاب ستمبر ۱۹۴۱ء میں رابندرناتھ ٹیگور کے انتقال پر منعقدہ جلسہ میں قاید ملت کی تقریر شائع ہوئی، اس تقریر کی روئیداد سے پہلی۔۔ مرتبہ اس بات کا علم ہوا کے نواب صاحب اور گرودیو کے تعلقات کی ابتدا کیسے۔۔ ہوئی، انہوں نے شانتی نکیتن میں کیا دیکھا اور قاید ملت کے دل میں رابندرناتھ ٹیگور کی عزت و احترام کی وجہ کیا تھی، نواب صاحب کی وہ شاہکار تقریر ہدیہ ناظرین ہے جس کے مطالعہ کے بعد کسی، مشاطیگی کی حسن معنی کو ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آہ ٹیگور

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ عالم کی موت عالِم کی موت ہوتی ہے
اور یہ اس لئے صحیح ہے کہ عالم کا دماغ فکر و تصور کی ایک دنیا ہوتا ہے اور
اسکی موت اس دنیا میں قیامت بن کر آتی ہے۔

ڈاکٹر ٹیگور اصطلاحی شاعر نہ تھے جو آج کل ہر گلی کوچہ میں پائے
جاتے ہیں وہ اصلی معنیٰ میں شاعر تھے جن کو تلامیذ الرحمٰن کہا گیا،
ہے۔ ایسا شاعر فطرت کائنات کا سب سے بڑا عالم ہوتا ہے وہ قدرت
کے رخ سے نقاب اٹھاتا اور رموز اسرار فطرت اپنی آنکھوں سے
دیکھتا اور دنیا کی آنکھوں پر آشکار کر دیتا ہے۔ شاعر تفکر و تعقل،
کے سمندر کا وہ غواص ہوتا ہے جس کے سامنے صدف اپنی ....
ہتھیلیاں کھول دیتے ہیں اور موتی اپنے آپ کو خود پیش کرتے ہیں
اور ان کے دریائے معانی کو چنتا اور اپنی نظم کی مالا میں پرو کر فطرت
کے گلے کی زینت بناتا ہے فطرت سے اس کا تعلق اتنا گہرا، اتنا مستحکم،
اور اتنا قریبی ہوتا ہے۔ کہ وہ فطرت میں گم ہوتا ہے۔ فطرت اس کی
آنکھوں سے دیکھنے اور اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے، وہ مسکراتا
ہے تو ہوائیں گنگنانے لگتی ہیں، درخت تالیاں بجاتے ہیں ...
سورج کی کرنیں ناچتی ہیں اور ساری کائنات متبسم بن جاتی ہے ..
جب اس کے ابرو پر بل پڑتے ہیں تو بادل رجز پڑھنے لگتے ہیں۔
چاند میں بجلیاں بھر جاتی ہیں۔ سورج آگ برسانے لگتا ہے۔

اور ساری کائنات ایک میدان کارزار بن جاتی ہے۔ پھول اس کے ہاتھ میں آکر کبھی نظر فریب بن جاتا ہے اور کبھی نظارہ سوز، وہ کبھی رگ گل سے بلبل کے پر باندھتا ہے اور کبھی لالے کو شعلہ طور بنا کر عشق کی دنیا کو خاکستر بنا دیتا ہے۔

دو فطرت شناس

ہندوستان نے انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں دو بڑے فطرت شناس اور قدرت آشنا شاعر پیدا کئے ایک شمال مغرب میں دوسرا شمال مشرق میں ایک نے سوتوں کو جگایا، جاگتوں کو کھڑا کیا، اور کھڑے ہوؤں کو چلایا، اور چلنے والوں کو دوڑنے کی تعلیم دی۔ دوسرے نے امن و شانتی کا راگ الاپا۔ کپٹ کی چتا میں جلنے والوں کو پریم جل کے چھینٹے دیئے اور دنیا کو دیکھنے اور سننے کے لئے ایک مجسمہ نغمہ جس میں اقبال کے "پیام مشرق" اور ٹیگور کی "گیتان جلی" میں بھی دو خصوصیتیں پاتا ہوں

گذشتہ جنگ عظیم سے یورپ کی دنیا تھک چکی تھی تکاپوئے دمادم اور میدان رستخیزی سرگرمیوں نے ان کے اعضا کو نڈھال کر دیا تھا وہ پیغام امن کے بھوکے تھے، پیغام مشرق کی طرف متوجہ نہ ہو سکے اور گیتان جلی نے ان کے نگاہوں کو جذب کر لیا۔

یہ ہے ٹیگور کے نوبل پرائز کی حقیقت جس پر آج ہم سب ہندوستانی بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

نواب سر امین جنگ کی محفل

آج سے آٹھ سال قبل، مجھے مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کے سامنے یا دا گوئی کے مظاہرے کا موقع ملا تھا۔

نواب سر امین جنگ بہادر کی روایت ہے کہ شاعر کو اردو

کی اچھی تقریر سننے کی تمنا تھی نہ معلوم کیوں نظر انتخاب مجھ ہیچمدان پر پڑی
میرے لئے جو تقریر و خطابت کو ایک کھیل سمجھتا ہے فی الحقیقت وہ ،
دن ایک آزمائش کا دن تھا میں نے بہت کم اپنی کسی تقریر سے پہلے
سوچا ہے کہ مجھے کیا کہنا چاہئے لیکن اس دن مجھے نہ صرف سوچنا
بلکہ تیار ہونا پڑا۔ شاعر کی بڑائی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ...
دوسروں کی ہمت افزائی کر کے اور ان کو بڑا بنا کر خوش ہوتا ہے۔ یہی
خوبی ڈاکٹر ٹیگور میں تھی انہوں نے نہ صرف میری موجودگی میں بلکہ میرے
غیاب میں بھی اس مختصر تقریر کو بہت پسند کیا۔ آج کی محترم صدر مسز،
نائیڈو سے انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکے کی روانی اور انداز بیاں
اس کو ہر زبان کا اچھا مقرر بنا سکتا ہے۔ اگر یہ انگریزی میں مشق کرے تو
یہ کامیاب مقرر ہوگا میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیوں نہ اس کی کوشش
کروں۔ ممکن ہے شاعر کی یہ پیش گوئی اس کی روحانی قوتوں سے مل
کر پوری ہو جائے۔ ان کی یہ محبت آخر تک قائم رہی۔

شانتی نکیتن۔ میں اپنی زندگی کے ان لمحات کو فراموش نہیں
کر سکتا۔ جبکہ مجھے شاعر کے ساتھ شانتی نکیتن میں دو دن گذارنے کا موقع
ملا تھا۔ یہ اڑتالیس گھنٹے میرے صفحہ دماغ پر ہمیشہ مرتسم رہیں گے وہ ،
دور دور تک پھیلے ہوئے سرخ میدان مشہور عالم درسگاہ، مشرق
میں وہ آموں کے بڑے بڑے پیڑ، ان کے نیچے پوتی ہوئی صاف زمین
جس پر بیٹھ کر تشنگان علم سادگی اور پرکاری کا درس حاصل کرتے
ہیں۔ جا بجا طلبائے فن لطیف کے بنائے ہوئے مجسمے دیواروں پر ،
ان کی مصوری کے شاہکار ہر چیز میں مشرق کی راندہ اور ٹکرائی ہوئی
تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش نمایاں۔ وہ عظیم الشان کتب خانہ
جس میں بیٹھ کر ریسرچ اسکالرس اپنے مقالے تیار کرتے ہیں

اور میرے لئے سب سے زیادہ جاذب توجہ وہ شعبۂ اسلامیات جو، حضور شاہ دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے عطیہ سے شاعر نے اس جامعہ میں قائم کیا تھا ان سب کی ایک ایک تفصیل آج بھی میری نگاہوں میں پردہ سیمیں کی تصویروں کی طرح پھرنے لگتی ہے۔

میں اپنی ان ملاقاتوں کے بنا پر تصدیق کرتا ہوں کہ شاعر فرقہ وارانہ تصورات سے بالا تر تھا وہ خوبیوں کا متلاشی تھا چاہے جہاں سے اس کو حاصل ہوتے۔ وہ موحد تھا اور اس کا کیش بقول غالب ترک رسوم تھا اور وہ ملتوں کے مٹ جانے ہی کو اجزائے ایمان کی تیاری تصور کرتا تھا۔

سیاست اور ٹیگور:۔ اگر ہندوستان کی زمام سیاست ٹیگور جیسے مخلص بے ریا اور حقیقی معنٰی میں ہندوستان پرست لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی، شاید ہندوستان میں وہ تحریکیں پیدا ہی نہ ہوتیں۔ کاش آج بھی بڑی جماعتوں کی رہبری کرنے والے، ٹیگور کے نقش قدم پر چلیں اور چھوٹی جماعتوں کی بےچینی کو دور کر سکیں۔

طاعت و بندگی۔ مجھے ڈاکٹر ٹیگور آنجہانی کی وسعت قلب کو ظاہر کرنے کے لئے اجازت دیجئے کہ اپنے دو روزہ قیام .. شانتی نکیتن کا واقعہ بیان کردوں۔ میں شاعر کے اس کمرے میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا جو سر سے پاؤں تک مجسم شعر تھا شاعر نے مجھ سے لفظ "اسلام" کے معنٰی پوچھے جب میں نے بتایا کہ اسلام، اطاعت اور بندگی کو کہتے ہیں۔ تو انہوں نے فوراً سوال کیا کہ مسلمانوں نے اس لفظ کو اپنے مذہب کے لئے کیوں پسند، کیا۔ میں نے ذرا تفصیلی طور سے توضیح کی کہ قرآن مجید اسلام کو،

کائنات عالم کا فطری مذہب قرار دیتا ہے، جہاں کہیں خدا کی طرف سے کوئی آواز بلند ہوئی اور جس کسی نے خدا کے بندوں کو خدا کا راستہ دکھایا قرآن کی ؛ اصطلاح میں اس نے اسلام کے سوا کوئی اور چیز پیش نہیں کی، چاہے وہ ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحٰق کی آواز ہو، جو شوریہ اور فلسطین میں گونجی اور جس کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے یا وہ زرتشت وہ کنفیوشش اور گوتم بدھ کی ہو جو ایران وچین، اور ہندوستان میں بلند ہوئی، چونکہ قرآن میں اس کا تذکرہ نہیں ہے اسلئے مسلمان ان کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن قرآن کے ارشاد لکل امۃ رسول و ان امت من خلا فیہا نذیر کے مطابق یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ رب العلمین نے مشرق کے ان عظیم الشان ممالک کو اپنی ہدایت سے ہمیشہ محروم رکھا ہوگا۔

مسلمان تنگ نظر نہیں ہے

شاعر نے میری گفتگو کو نہایت توجہ سے سنا اور فرمانے لگے، کہ تمہارا بیان تو، اس الزام کی تردید کرتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو تنگ نظر کہہ کر لگا دیتے ہیں اور پھر پوچھا کہ موجودہ اختلافات کی حقیقت کیا ہے، میں نے کہا کہ موجودہ اختلافات اصل کی خرابی نہیں نظر کی دوری کا نتیجہ ہے۔ جیسے جیسے معلمین ..، قانون فطرت سے زمانہ دور ہوتا گیا، لوگوں نے ان کے مطلب کو سمجھنے میں غلطیاں کیں شریعتیں بدلیں، لوگوں نے ان کو دین کی تبدیلی سمجھ لیا اور آپس میں لڑ پڑے، پھر شاعر نے باوجود اپنے انتہائی علم و فضل کے مجھ سے دین و شریعت کا فرق دریافت کیا۔

میں اس گفتگو میں آپکا زیادہ وقت نہیں لوں گا مجھے جو چیز بتانی تھی وہ یہ کہ شاعر لیلائے علم کا دیوانہ تھا۔ اور جدھر ناقہ لیلیٰ سے نشان قدم پاتا ادھر چل پڑتا تھا یہاں تک۔ کہ اس میں نجد عراق کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی .. یہی راز اس کی بڑائی کا ہے۔ اور یہی پہلو اس کی زندگی کا قابل تقلید ہے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی حکومت حیدرآباد (علاقہ نظام) کے ضلع اورنگ آباد میں ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے (یہ قائد ملت سے عمر میں صرف دو[۲] سال بڑے تھے۔ اورنگ آباد کے ایک بزرگ حضرت قطب الدین قبلہ مودودی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں اور اسی نسبت کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ مودودی لکھا کرتے تھے، مولانا کی زندگی کا نصف سے زیادہ حصہ حیدرآباد میں بسر ہوا۔

۱۱ سال کی عمر میں مولانا نے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد سے مولوی کا امتحان کامیاب کیا، اپنے ذاتی مطالعے اور خداداد صلاحیتوں سے علمی دنیا میں نام پیدا کیا۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۷ء تک صحافت سے وابستہ رہے جن اخبارات ورسائل سے ان کا تعلق رہا ان میں مدینہ، بجنور، تاج جبل پور، مسلم اور الجمعیۃ دہلی کے نام شامل ہیں۔

علمی دنیا میں ان کا قلم ان کے تعارف کا وسیلہ بنا، پردہ، تنقیحات، تفہیمات، رسالہ دینیات، تجدید واحیاء دین اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے ان کی شہرت روز افزوں رہی، اور ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" نے (جو ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد سے جاری ہوا) ان کی بے پناہ علمی و مذہبی صلاحیتوں کا اہل علم سے لوہا منوایا۔

یہ بات اگرچہ بڑی عجیب سی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ مولانا

کی پہلی تصنیف کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے جیساکہ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا کی پہلی تصنیف "الجہاد فی الاسلام" ہے۔ مولانا کی پہلی تصنیف "دولتِ آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے دوصد سالہ تعلقات" نامی کتاب ہے اور دوسری تصنیف تاریخ دکن ہے۔

مولانا کا منفرد اسلوب، ادبی چاشنی، منطقی استدلال اور دلنشیں انداز بیان ان کے مدعا کی تفہیم کا انداز، علمی حلقوں اور عوام میں یکساں مقبولیت کا باعث بنا۔

۱۹۳۴ء میں ترجمان القرآن کے ذریعہ جماعت اسلامی کی دعوت کے مشن کا آغاز ہوا، مولانا کے ۱۵۰ عقیدتمندوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ ۱۹۴۱ء سے جماعتِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور مولانا امیر جماعتِ اسلامی کی حیثیت سے عالمِ اسلام کے سامنے آئے اور ہزاروں قلوب کو اپنے پیام سے متاثر کیا۔ نواب بہادر یار جنگ ان کے ہمعصر تھے، بہادر یار جنگ سے ان کی ملاقات اور ان کا تعارف حسنِ اتفاق سے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس (۱۹۲۹ء) میں نواب صاحب کی تقریر سے ہوا اس پہلے تعارف کا حال ان کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو ۱۹۳۹ء میں انہوں نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا جب کہ یہ تعلق دوستی میں متبدل ہو چکا تھا ــــــــــــــــ

مولٰینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن لاہور کے تاثرات

مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور

مؤرخہ ۱۲ ارشعبان ۱۳۵۸ھ
م ۲۶ ستمبر ۱۹۳۹ء

مکرمی و محترمی!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مؤرخہ ۱۹ ستمبر ملا، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے

مجھے اپنے محترم دوست نواب بہادر یار جنگ کے متعلق اپنے تاثرات کے اظہار کا موقع بخشا۔

نواب صاحب سے میں سب سے پہلے اس وقت واقف ہوا جب ۱۹۲۹ء میں مجھ کو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسہ میں شریک ہونے کا موقع ملا، نواب صاحب اس وقت تقریر فرما رہے تھے اور میں ان کے نام تک سے ناواقف تھا، تھوڑی دیر تقریر سنتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں عام مقررین سے مختلف ایک شخص سے دوچار ہوں جو خطابت کیلئے پیدا کیا گیا ہے، سلجھے ہوتے خیالات، مرتب اور مربوط بیان الفاظ کا صحیح انتخاب اور برمحل استعمال، جملوں کی صحیح نشست اور ان میں ادب کی لطیف چاشنی، ان سب چیزوں نے مل جُل کر مجھے مقرر کی شخصیت سے فوراً متاثر کیا اور ہم نشینوں سے دریافت کرنے پر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ نواب بہادر خاں صاحب حیدرآباد کے ایک جاگیر دار ہیں تو مجھ کو اور زیادہ حیرت ہوئی، کیوں کہ میں حیدرآباد کے جاگیردار طبقہ سے جو واقفیت رکھتا تھا اس کی بناء پر مجھے توقع نہ تھی کہ ایسا اچھا خطیب اور ایسے پاکیزہ خیالات اور وسیع معلومات رکھنے والا شخص اس طبقہ میں پیدا ہوگا۔

اس کے کچھ ہی مدت بعد مجھے نواب صاحب سے شخصی تعارف حاصل ہوا اور چھ سات سال میں متعدد مواقع ایسے پیش آئے جن میں نواب صاحب کے اخلاق، ان کی سیرت، ان کے خیالات اور ارادوں اور ان کی ذہنی صلاحیتوں سے مجھے کافی گہری واقفیت حاصل ہوئی اور میں نے یہ رائے قائم کی کہ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ شخص آگے چل کر ایک نمایاں مرتبہ حاصل کرنے والا ہے، الحمدللہ کہ اب میری وہ توقعات پوری ہو رہی ہیں اور میں یہ دیکھ کر نہایت خوش ہوں کہ حیدرآباد کے مسلمانوں کو ان کی تاریخ کے اس نازک مرحلہ پر ایک ایسا لیڈر مل گیا ہے جو لیڈرشپ کے

لے، ہر طرح موزوں ہے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نواب صاحب سے مسلمانان دکن کی کوئی یادگار رہ جانے والی خدمت لے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

(حوالہ آفتاب دکن از حمید اللہ خان شیدا ۱۰،۱۱)

متذکرہ خط میں جیسے کہ مولانا نے ارشاد فرمایا اس کے کچھ ہی مدت بعد نواب صاحب سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو شخصی تعرف حاصل ہوا قاید ملت، مولانا مودودی کی علمیت اور ان کی تصانیف کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے مولانا کے عالم دین ہونے کے باعث بے حد تعظیم و تکریم فرماتے مولانا مودودی قاید ملت سے ملنے کے لئے بیت الامت بھی تشریف لایا کرتے۔

اگرچہ دستیاب خطوط کی روشنی میں مولانا ابواعلیٰ مودودی کے موسومہ خطوط کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں ہے، مگر قاید ملت اور مولانا ابواعلیٰ کی مراسلت بہر حال اتنی مختصر ہو نہیں سکتی، مطلوبہ خطوط میں پہلا خط ۴ر ستمبر ۱۹۳۶ء کا لکھا ہوا ہے یہ خط مولانا نے قاید ملت کے نام تحریر فرمایا تھا اور دست بدست روانہ فرمایا تھا اس خط میں خاکسار تحریک سے متعلقہ لٹریچر کی فراہمی کی نواب سے خواہش کی گئی تھی، مولانا کا یہ خط اور اس کا جواب ہر دو سے قریبی ربط و تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

محترمی و مکرمی نواب بہادر یار جنگ!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ

ہمارے پاس متعدد اصحاب کے خطوط آئے ہیں جس میں تحریک خاکساراں کے متعلق اظہار رائے کا مطالبہ کیا گیا مگر میں اس تحریک کے پورے لٹریچر کا غائر مطالعہ کئے بغیر کسی رائے کا اظہار مناسب نہیں سمجھتا اس لئے تذکرہ کا مطالعہ کیا ہے اور وہ میرے پاس موجود ہے، لیکن علامہ مشرقی کی تازہ تحریریں اور ان کی تحریک کے اصول و مقاصد اور ان کا دستور العمل دیکھے بغیر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اگر آپ کے پاس یہ

چیزیں موجود ہوں اور آپ کچھ مدت کے لئے مجھے مستعار دے سکیں تو میں ان کو حاصل کرنے کی مشقت سے بچ جاؤں گا لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں کہ لٹریچر کہاں سے مل سکتا ہے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

مولانا ہی کے کرم نامے کی پشت پر جواب کے زیر عنوان نواب صاحب نے جو جواب تحریر فرمایا تھا۔ درج ذیل ہے۔

جواب تحریر خاکساراں سے متعلق کی کتابیں ارشادات اور قول فیصل مرسل ہیں اور ان ہی کو تحریک سے متعلق کہا جا سکتا ہے، بہت اچھا ہوا کہ لوگوں نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کی ضرور ملاحظہ فرمائیے اور اپنی رائے کا اظہار فرمائیے۔ اس وقت اس تحریک پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ عنایت اللہ خاں المشرقی سے نسبت رکھتی ہے، خاں صاحب کئی مرتبہ اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ اس تحریک کو ان کی کتاب تذکرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے ہر مذہب و ملت کے لوگ اس تحریک میں شریک ہو سکتے ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ ان کے ہم خیال ہوں۔

کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ان کتب کے مطالعہ کے بعد اپنے خیالات کے شائع کرنے سے قبل .... ایک مرتبہ آپ مجھ سے ملاقات فرمالیں میں آپ کی اطلاع کا منتظر رہوں گا۔

(حوالہ یہ خط کسی مکاتب کے مجموعہ میں شریک نہیں ہے)، قلمی غیر مطبوعہ۔
شرح دستخط آپ کا مخلص
نواب بہادر یار جنگ ؏

دوسرا خط جو ہمیں ملتا ہے وہ ۱۹ / مئی ۱۹۳۸ء کا ہے ۸ / مارچ ۱۹۳۸ء علامہ اقبال کے مشورے پر مولانا مودودی حیدرآباد سے پنجاب منتقل ہوئے اور ادارہ دارالاسلام پٹھان کوٹ کی بنیاد ڈالی حیدرآباد سے روانگی سے چند روز قبل مولانا مودودی نواب صاحب کی ڈیوڑھی کے سامنے سے گذر رہے

تھے لیکن قاید ملت سے وداعی ملاقات کیلئے تشریف نہیں لائے جس کا نواب صاحب کو بڑا ملال ہوا اس خط میں مولانا کو دیکھنے کے بعد قاید ملت کے اشتیاق دید کی پیاس کے بڑھ جانے کا ذکر بھی ہے کہ "چہرہ میں مبارک تبدیلی کے ساتھ دیکھا جس کے بعد بے اختیار دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا"

نواب صاحب نے تو شیطان کے استرے کو عنفوان شباب سے نفرت کی نظر سے دیکھا تھا انہیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ان کے دوست مولانا ابو اعلیٰ مودودی نے دیر سے سہی مگر شیطان کے استرے سے دوری اختیار کر کے اپنے علم اور تقویٰ کے تقاضوں کی تکمیل فرمائی۔

مولوی ابو الاعلیٰ مودی

مدیر ترجمان القرآن۔ دار الاسلام۔ پٹھان کوٹ پنجاب

مکرمی زادت الطافکم!

آپ کی حیدرآباد سے روانگی کے چند روز قبل اپنے محلے میں آپ کو دیکھا تھا اور چہرہ میں اس مبارک تبدیلی کے ساتھ دیکھا تھا جس کے بعد بے اختیار دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا لیکن افسوس کے آپ نے جاتے ہوئے ملاقات کرنا بھی گوارہ نہ کیا بہرحال دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو خوش رکھے، اور اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔ ترجمان القرآن یقین ہے کہ جاری ہوگا۔ شوال کے پرچے کے بعد مجھے اب تک کوئی پرچہ نہیں ملا سنا تھا کہ ذی قعدہ کا نمبر آپ کے ارشادات کا مجموعہ ہے اور خاص نمبر بن کے نکلا ہے۔ لیکن اب تک اس کے مطالعہ سے محروم ہوں اگر میرا چندہ ختم ہو چکا ہو تو وی۔ پی۔ روانہ فرما کر وصول کر لیجئے اور مجھے ترجمان القرآن سے تو محروم نہ کیجئے؟

شوال کے پرچے میں آپ نے جو دارالاسلام کا نقشہ کھینچا ہے اس نے اشتیاق دید کو بڑھا دیا ہے۔ خدا کرے کسی روز آؤں اور وہاں کے بندگان حق پرست کو دیکھوں اور استفادہ کروں۔ والسلام۔

آپ کا مخلص۔
بہادر خاں

(حوالہ خط نمبر ۴۹ ص ۱۲۳ مشمولہ… مکاتیب بہادر یار جنگ مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۳۸ء)

نواب بہادر یار جنگ کے مزید دو خط جس میں ایک ۱۹۴۱ء کا ہے اس خط کا ایک حصہ مولانا کی کتاب دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے دو صد سالہ تعلقات کے معاوضہ سے متعلق ہے۔ صرف اسی حصہ کو نقل کیا جا رہا ہے اور خط کا دوسرا حصہ جماعت اسلامی سے متعلق ہے۔ اسے مولانا، ابو اعلیٰ صاحب کے ایک نزاعی خط کے تذکرہ میں اسی باب میں نقل کیا گیا ہے۔

مولانا ابو اعلیٰ مودودی صاحب

ایڈیٹر ترجمان القرآن" لاہور

مکرمی زادت الطافکم!

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے آپ کی کتاب دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کی دوبارہ اشاعت کی اجازت چاہتی تھی۔ حیدر آباد کی عبد الحق، اکاڈمی نے اس کو دوبارہ شائع کیا اور اس پر جو نوٹ ناشر کی طرف سے لکھا گیا اس میں آپ کی ہدایت کے بموجب یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہ آپ کی ایک پُرانی تالیف ہے۔ میں نے ناشرین سے آپ کا حقِ تالیف ایک سو پانچ کلدار آپ کی منظوری کی امید پر طے کر لیا تھا جو علٰحدہ منی آرڈر کے ذریعہ مرسل خدمت ہے قبول فرما کر ممنون فرمائیے۔

(حوالہ خط نمبر ۱۸۰ مکاتیب بہادر یار جنگ)

۳۱ / مئی ۱۹۴۲ء کے خط میں عہد اسلامی سے سقوط سلطنت، قطب شاہی اور آصف جاہ سادس کے عہد تک کی تاریخ جو مولانا مودودی نے مرتب فرمائی تھی اس کی اشاعت اور دولت آصفیہ اور

حکومت برطانیہ کے تیسرے ایڈیشن کے معاوضہ روانہ کیے جانے کا ذکر مذکور ہے (جماعت اسلامی کے بارے میں آخری سطر، اگلے صفحات پر جماعت سے متعلقہ تحریر کے باب میں درج ہے)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر ترجمان القرآن۔ لاہور

مکرمی! مولوی اقبال سلیم صاحب مہتمم دارالاشاعت سیاسیہ سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ نے ابتداء عہد اسلامی سے سقوط۔۔، سلطنت قطب شاہیہ تک دکن کی تاریخ مرتب فرمالی ہے اور اس کے بعد سے آصفجاہ سادس کے عہد تک کی تاریخ کے نوٹس بھی مرتب فرما لئے۔ دارالاشاعت سیاسیہ کے لئے آپکی اس تاریخی کاوش کا شائع کرنا باعث مسرت و افتخار ہوگا۔ جس قدر کام مکمل ہے وہ بغرض اشاعت ارسال روانہ فرما دیجئے اور اس کے معاوضہ کا بھی تعیّن فرما دیجئے تاکہ اشاعت شروع کر دی جائے اور جو کام تکمیل طلب ہے اس کے لئے اگر ضرورت ہو تو، میں کسی قابل نوجوان کو آپ جب فرمائیں آپ کی امداد کے لئے لاہور، روانہ کر دوں "دولت آصفیہ و حکومت برطانیہ" کے دوسرے ایڈیشن کا معاوضہ روانہ کر چکا ہوں، تیسرے ایڈیشن کا انشاء اللہ ماہ جون کے ختم تک حاضر خدمت کر دوں گا۔

(حوالہ خط نمبر ۲۹۵ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل)

اس طرح ان خطوط میں مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ" کے دوصد سالہ تعلقات کی اشاعت اور اس کے معاوضہ کے سلسلے میں اور تاریخ دکن کے تعلق سے نواب صاحب کی دلچسپیوں کا اظہار ہوتا ہے اور شخصی تعلقات جو علمی بنیاد پر قائم تھے اس کی جھلک بھی نمایاں ہے ایک علمی اور مذہبی پس منظر سے مولانا

ابوالاعلیٰ کی شخصیت ابھری اور بارہ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور اسکے بعد مولانا جماعت اسلامی کے امیر منتخب ہوئے (مخفی مباد قیام پاکستان کے نظریئے کی مخالفت کے باوجود مولانا نے اسلامی نظام حکومت کا خاکہ تیار کرنے کے لئے مسلم لیگ کی کمیٹی میں بھی شرکت فرمائی) اب مولانا ابوالاعلیٰ کی فکر و نظر کا حامل ہی وہ مسلمان تھا جو ان کا مطلوب انسان تھا۔

تفصیلات سے قطع نظر کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا کی سیاسی سرگرمیاں، انتخابات میں جماعت اسلامی کا حصہ، مولانا کو سزائے موت کا حکم جمہوریت کی بحالی اور دیگر سیاسی جماعتوں سے اتحاد وغیرہ مختصر یہ کہ آخری دور میں مولانا مذہبی شخصیت سے زیادہ سیاسی، حیثیت کی حامل شخصیت بن گئے،

مولانا کی تحریک (جماعت اسلامی) کے سلسلے میں نواب صاحب کی رائے معلوم کرنے کیلئے ان کی جماعت کے اصحاب نے نواب صاحب سے ملاقاتیں بھی فرمائیں اور خطوط کا تبادلہ بھی ہوا عنایت اللہ اثری کو اپنے ایک جوابی خط کے ذریعے نواب صاحب نے اپنی جس آزادانہ رائے سے مطلع کیا جو ارباب متعلقہ کی طبع نازک پر گراں گذرا ذیل کا خط وہی ہے

"فی الحال صرف اس قدر کہدینا کافی تصور کرتا ہوں کہ جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مجھے صرف اس کے طریقہ کار سے اختلاف ہے۔ ایک تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ جماعت ایک مستقل فرقہ نہ بن جائے اور اس کے ارکان اس میں شریک نہ ہونے والوں کو اسلام سے خارج نہ تصور کرنے لگیں، دوسرے میں اس کو سخت غیر مآل اندیشی تصور کرتا ہوں کہ ہم موجودہ حکومتوں اور خصوصًا ان کی مقننہ سے قطع تعلق کر کے اپنے مخالفین کو اور زیادہ قوی کر دیں،

گو میں بھی ان حکومتوں کو غیر الٰہی سمجھتا ہوں اور ان کے اسلامی بنانے ہی کو اپنا مقصد حیات تصور کرتا ہوں۔ فقط

آپ کا مخلص

محمد بہادر خاں

(حوالہ خط موسومہ عنایت اللہ اثری مورخہ ۱۰ رجنوری ۱۹۴۲ء مشمولہ یادوں کے خطوط خط نمبر ۲۴ ص ۸۹۔)

ناشر۔ اسلامی مرکز۔ حیدر آباد،

متذکرہ خط کے فوری بعد عنایت اللہ اثری صاحب کے خط کے جواب میں پھر ایک تفصیلی وضاحت پر مبنی خط نواب صاحب نے تحریر فرمایا،

عزیز مکرم!

آپ کا تفصیلی خط پہنچا۔ امر بالمعروف کا شکریہ۔ جیسا کہ میں نے، اپنے پہلے خط میں لکھا ہے۔ جماعت اسلامی کے اصول اور اغراض و مقاصد سے لفظاً متفق ہوا لیکن طریقہ کار سے مطمئن نہیں ہوں۔ اپنے طریق، پر اسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ جدھر جماعت اسلامی لے جانا چاہتی ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری جماعت میں برے بھی شریک ہیں لیکن حاشیہ نشینان بارگاہِ نبوت میں بھی عبد اللہ بن اُبی جیسے لوگوں کی موجودگی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر آپ جماعت اسلامی کے اصول کے ساتھ، اس کے طریقۂ کار کو بھی اچھا سمجھتے ہیں تو اس میں ضرور شرکت کیجئے۔ میں اس مسئلہ میں فی الحال خاموش رہنا چاہتا ہوں آپ کے استاد جب حیدر آباد تشریف لائیں تو مجھے ان سے مل کر بہت مسرت ہو گی اور ان سے اپنے، شکوک رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔

صرف ایک بات کہنے کی اجازت دیجئے۔ آپ نے دیکھا کہ میرا یہ اندیشہ کہ عنقریب یہ جماعت یہ ایک فرقہ بن جائے گی۔ آپ کے پہلے ہی،

خط میں نمایاں ہونے لگا۔ اور آپ دوسرے مسلمانوں کی برائی پر قلم اٹھانے لگے اور مجھے انہیں بروں کے لئے کام کرنا ہے اور ان کو ساتھ لے کر کرنا ہے۔

(حوالہ خط نمبر ۲۲۰ صفحہ ۲۵۵/۲۵۶ مورخہ ۳؍جنوری سنہ ۱۹۴۲ء مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی۔

متذکرہ خط نوک نشتر ثابت ہوا۔ ویسے مولانا سے خط و کتابت میں بھی جماعت کے بارے میں مولانا ابوالاعلیٰ کے مطلوب انسان کے بارے میں نواب صاحب کی رائے، ان کے ایک خط کے ایک سطر میں جو بیان کی گئی ہے، طنز کا شاہکار ہے۔ "دعا فرمایئے کہ خدا ہندوستان کے ہر مسلمان کو اور خصوصاً مجھے آپ کے معیار پر مسلمان کرے۔"

صفحہ ۲۹۵ موسومہ مولانا ابو اعلیٰ مودودی مورخہ ۳۱؍مئی سنہ ۱۹۴۲ء مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی)

خود ابو اعلیٰ صاحب کو بھی نواب صاحب نے ان کی تحریک کے بارے میں اپنے اختلاف سے آگاہ فرمایا تھا۔

جماعت اسلامی سے متعلق آپ کی کوششوں کا غور سے مطالعہ کر رہا ہوں اس کے مقاصد سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن طریقۂ کار میں مجھے بعض اصولی اختلافات ہیں۔ کئی سال سے ملنے کا متمنی ہوں اگر کبھی ملوں گا تو گفتگو کروں گا۔ اخبارات کے کالموں یا پلیٹ فارم پر اختلاف کو اس وقت تک اچھا نہیں سمجھتا جب تک کسی شدید اجتماعی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

(حوالہ خط نمبر ۱۸۰ صفحہ ۲۲۶، مورخہ ۲۲؍دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء مشمولہ مکاتیب۔ بہادر یار جنگ۔ کراچی۔

متذکرہ خط میں "اگر کبھی ملوں گا تو گفتگو کروں گا" تحریر فرمایا ہے

اس خصوص میں مولوی عبد الرحمٰن سعید (سعید صدیقی) از رفیق قاید ملت کے مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ اس خصوص میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور قاید ملت کی ایک ملاقات تحریک جماعت اسلامی کے سلسلے میں ہوئی۔

"جب مولانا حیدر آباد سے ہجرت کر گئے اور جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس سلسلہ میں ان کا لٹریچر منظر عام پر آنے لگا تو جماعت کی دستور کی بعض دفعات علمی حلقوں میں بحث و تنقید کا موضوع بن گئیں۔

مولانا جب کبھی حیدر آباد آتے تو نواب صاحب سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا کو نواب صاحب نے ظہرانہ پر مدعو کیا تھا..... مقامی چند خاص افراد کو بھی اس کے صحبت میں شریک کیا گیا تھا (جن میں رشید صاحب (پروفیسر غلام رشید) اور خود میں بھی شریک تھا) اس موقعہ پر جماعت اسلامی کے بعض اصولوں پر گفتگو رہی۔ نواب صاحب نے اور لوگوں کو بحث میں حصہ لینے سے منع کر دیا تھا۔ خود نواب صاحب اور مولانا کے درمیان مکالمہ ہوتا رہا۔ پوری بحث تو حافظ میں باقی نہیں، رہی۔

البتہ اتنا یاد ہے کہ گفتگو جماعت کے دستور کی بعض دفعات میں شدت پر مذکور تھی۔ مولانا کسی طرح دستور میں ترمیم کے قائل نہ رہے" مکتوب شکاگو۔

از مولوی عبد الرحمٰن سعید ٭

سخن گسترانہ بات

جماعت اسلامی حیدر آباد کے لئے مولانا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو "نائب امیر" کے عہدے کے لئے کوئی مناسب آدمی مطلوب تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ہزاروں چاہنے..
والے پیدا ہو چکے تھے اور تحریک پروان چڑھ رہی تھی دوسری طرف
بہادر یار جنگ دس کروڑ برصغیر کے مسلمانوں کے قلوب پر حکمراں تھے
اور انہیں جماعت اسلامی سے اختلاف تھا۔ ایسی صورت میں مولانا
ابو اعلیٰ مودودی کے دل میں دکن میں نائب امیر کے عہدے کے لئے
بہادر یار جنگ کی یاد کیوں آئی اور پھر بہادر یار جنگ میں بعض خوبیاں
ضرور ہیں مگر۔ ؟ کے ساتھ اتحاد المسلمین اور مسلم لیگ کی مخالفت
بھی اس خط میں شامل ہے۔

اس خط سے جو ۲ر جنوری ۱۹۴۲ء کا ہے صرف یہ تأثر ملتا ہے،
کہ مولانا نواب صاحب کے بارے میں ان کی جماعت سے نواب صاحب
کے اختلاف رائے کے جواب میں ان کے (IMAGE) شخصیت
کا اعتماد عمومی و خصوصی متأثر کرنا چاہتے تھے مولانا کے متذکرہ خط،
میں اختراعی الزامات کی فہرست بھی شامل ہے۔ خط۔۔ ملاحظہ ہو...
"مجھے اب تک ریاست حیدرآباد کے لئے کوئی مناسب آدمی ایسا
نہیں ملا جو وہاں نائب امیر بنایا جا سکتا ہو اور اس لئے وہاں جماعت
کی تنظیم میں مشکلات محسوس کر رہا ہوں وہاں جتنے نمایاں لوگ ہیں
وہ یا تو ملازم ہیں یا وظیفہ خوار یا حکومت کے متوسل کوئی ایسا آدمی،
نظر نہیں آتا جو اعلیٰ درجہ کا مدبر بھی ہو اور پھر علم دین بھی رکھتا ہو
اور ساتھ ہی لانجات فی اللہ لومتہ لائم اور لم یخش الا اللہ کا
مصداق ہو۔

اور حیدرآباد کے خداوند کی بندگی ..... میں بندھا ہوا نہ ہو بہادر
یار جنگ میں بعض خوبیاں ضرور ہیں مگر اوّل تو اس کا ذہن ابھی تک،
صاف نہیں ہے۔ خلافت الہیہ کی آواز بھی بلند کرتے ہیں اور پھر بھی

خاکسار تحریک اور کبھی مسلم لیگ اور کبھی حیدرآبادی و غیر حیدرآبادی کے جھگڑوں میں بھی پھنستے ہیں دوسرے ابھی بادشاہ پرستی کا پھندا ان کے دل پر چاہے نہ ہو۔ مگر ان کی گردن میں ضرور پڑا ہوا ہے ... حالانکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے مہاراج گان میسور و کشمیر وغیرہ کی فرمانروائی جتنی غلط ہے اتنی ہی خاندان آصف جاہی کی فرمانبرداری، بھی غلط ہے۔ میں اس کو دیانت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ ہم محض مسلمان قوم کے مفاد کی خاطر انگریزوں اور ہندوؤں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تو مذمت کریں مگر نام نہاد مسلمان رئیسوں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تعریف و توصیف اور حمایت کے لئے کھڑے ہو جائیں، اس قسم کی جانبداریوں کے ساتھ ہم نے اسلام کی تبلیغ کی اور خلافتِ الٰہیہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی تو یقین جانئے کہ کوئی غیر مسلم ہمیں اپنی دعوت میں سچا ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ لہٰذا میں حیدرآباد میں کسی ایسے شخص کو جماعت کا ذمہ دار قائد بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں جو دل میں تو اس ریاست کو غیر اسلامی سمجھتا ہو مگر ظاہر میں نظام کی وفاداری کا دم بھرے۔

(حوالہ: یادوں کے خطوط، مرتبہ اسلامی مکتبہ حیدرآباد، ناشر: مولانا محمد یونس۔

خط نمبر ۲۹ مؤرخہ ۲ رجنوری ۱۹۴۳ء)

مولانا نے اپنے اس مکتوب میں الزام عاید کیا ہے کہ "بہادر یار جنگ میں بعض خوبیاں ضرور ہیں مگر اول تو ان کا ذہن ابھی تک صاف نہیں ہے۔ خلافت الٰہیہ کی آواز بھی بلند کرتے ہیں اور پھر بھی خاکسار تحریک اور کبھی مسلم لیگ اور کبھی حیدرآبادی و غیر حیدرآبادی کے جھگڑوں، میں پھنستے ہیں" ۱۹۴۳ء میں نواب صاحب کا خاکسار تحریک سے تعلق

باقی نہ رہا تھا۔ خاکسار تحریک سے وہ اس لئے وابستہ تھے کہ آریہ سماج، راشٹریہ سیوک سنگھ ہندو مہا سبھا کی جارحانہ فرقہ پرستی کے جواب میں خاکسار تحریک کو وہ وقت کی ضرورت سمجھتے تھے وہ اس خصوص میں فرماتے ہیں "اگر عہد حاضر کے مسلمان سپاہیت کی طرف سے۔، غفلت برت رہے ہیں تو یقیناً وہ اپنے رسول کی پیروی سے۔، غفلت برت رہے ہیں۔ آقائے دوجہاں کا متروکہ نہ درہم تھے نہ دینار نہ لونڈیاں نہ غلام نہ املاک تھے نہ تجارت لیکن امہات المومنین کے تنگ حجرے اگر آپ کے کسی اثاثہ ومتروکہ سے بھرے ہوئے تھے تو وہ، آپ کی تلواریں آپ کی زرہیں آپ کے خورد اور آپ کی کمانیں، تھیں میں مسلمانوں کو اسوۃ حسنہ کے اس پہلو کی طرف بطور خاص متوجہ کرتا ہوں۔ میں ان کے ہر ایک فرزند کو خالدؓ اور ابو عبیدہ کا غلام دیکھنا چاہتا ہوں۔

(حوالہ خطبات قاید ملت ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸)

"کبھی مسلم لیگ،، نہیں بلکہ از ابتدا تا انتہا اتحاد المسلمین، مسلم لیگ اور اسٹیٹ مسلم لیگ کے وہ عظیم رہنما رہے کبھی "حیدر آبادی وغیر حیدر آبادی" یہ تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں وہ تو سارے ہندوستان (برصغیر) کے مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں مصروف بہ کار رہے۔ ایک اور، دلچسپ اعتراض کہ "ابھی بادشاہ پرستی کا پھندا ان کے دل پر چاہے نہ ہو مگر ان کی گردن میں ضرور پڑا ہوا ہے، حالانکہ اسلام کے نقطہ نظر سے۔ ۔ ۔ ۔ مہاراجگاں میسور و کشمیر وغیرہ کی فرمانبرداری جتنی غلط ہے اتنی ہی۔ ۔ ۔ خاندان آصف جاہی کی فرمانبرداری بھی غلط ہے میں اس کو دیانت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ ہم محض مسلمان قوم کے مفاد کی خاطر انگریزوں اور ہندوؤں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تو مذمت کریں مگر نام نہاد

مسلمان رئیسوں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تعریف و توصیف اور حمایت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔

بہادر یار جنگ نے اپنا خطاب اور جاگیر نظام کو واپس کردی تھی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں اتنا عظیم ایثار کسی مسلمان رہنمانے نہیں کیا وہ نظام کو صرف مسلمانوں کے اقتدار کا مظہر سمجھتے تھے۔ نظام نے نشہ اقتدار میں ایک شعر یوں کہا تھا۔

سلاطین سلف سب ہو چکے نذر اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

تو بہادر یار جنگ نے دوسرے ہی دن اس کا جواب دیا تھا کہ،

سلاطین سلف سب ہو چکے نذر اجل عثماں،
مسلمانوں سے تیری سلطنت کا ہے نشاں باقی،

بہادر یار جنگ پر شاہ پرستی کے زیر عنوان لگائے گئے اس تفصیلی، الزام کے جواب میں خود مولانا اگر اپنی گریباں میں جھانک لیتے تو، صدا آتی۔

آپ اپنے دام میں صیاد آگیا،،

مولانا ابو اعلیٰ مودودی کی پہلی تصنیف "دولت آصفیہ اور حکومت، برطانیہ" کے دو صد سالہ تعلقات نامی کتاب ہے وہ خود تحریر فرماتے، ہیں اس بات کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ "دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ" نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے مجھ سے لکھائی تھی حالانکہ جس وقت یہ کتاب میں نے لکھی ہے اس زمانہ میں نواب بہادر یار جنگ کو میں جانتا تک نہیں تھا اور نہ وہ مجھے جانتے تھے۔ ہمارا تعرف اس کے بعد ہوا ہے یہ کتاب دراصل میں نے خود ہی اس موقع پر لکھی تھی جب نظام مرحوم نے برار کا مسئلہ از سر نو چھیڑا تھا"

(حوالہ خط نمبر ۴۳ ص ۱۰۰ یادوں کے خطوط) یہ کتاب سر علی امام، صدر اعظم حکومت آصفیہ نے مولانا کو معاوضہ دے کر لکھوائی تھی۔۔۔۔ سلاطین عہد اسلامی سے سقوط قطب شاہیہ تک کی تاریخ مرتب و شائع کی اور آصف جاہ سادس تک کی تاریخ مرتب فرمائی۔ ہر دو، کتابیں تحقیقی مواد اور منفرد انداز بیاں کے باعث حوالوں کی کتابوں میں شامل ہیں۔ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ والی کتاب میں، دستاویزی ثبوت کے ساتھ نظام آف حیدرآباد کے استرداد وغیرہ برار پر دستوری حق کی حمایت میں سیر حاصل مواد سپرد قلم کیا گیا ہے اور دکن کی تاریخ میں شاہوں کی شاہی کی مدح سرائی کی گئی۔ ہر دو کتابیں مولانا کی شاہ پرستی یا زر پرستی کی زندہ یادگار ہیں۔

فتنہ ملت بیضا ہے امامت اس کی،
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

یہ ہر دو کتابیں جن مولانا ابو اعلیٰ مودودی کے قلم کی رہیں۔۔۔ منت ہیں ان کا یہ کہا خود انہیں پر صادق آتا ہے۔ "بادشاہ پرستی کا پھندا ان کے دل پر چاہے نہ ہو مگر ان کی گردن میں ضرور پڑا ہوا ہے" بڑے آدمی جھوٹ نہیں بولتے یہ چھوٹوں کا حسن ظن ہے۔ تحقیق کی صداقت جب اس مفروضے کو آئنہ دیکھاتی ہے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاہوں، اور مولویوں کی انا کی تسکین کے اس واحد سہارے کو ان سے، چھینا نہیں جا سکتا صرف۔ یہی ایک متذکرہ خط ہے جس سے "سخن گسترانہ بات" پیدا ہوئی ویسے نواب صاحب مولانا کی بیحد قدر کرتے تھے، اور خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دل میں نواب صاحب کا جو مقام تھا اس کا اندارہ ان کے اس تعزیتی بیاں سے ملتا ہے۔ جس میں وہ، فرماتے ہیں۔

بہادر یار جنگ مرحوم میرے دوست تھے اور میں نے ہمیشہ ، ان کے خلوص پر اعتماد کیا۔ مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ ایسا جوہر قابل بڑے نازک موقعہ پر ان سے چھن گیا۔ اب ان کی یاد منانے سے ، بڑھکر ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان کی زندہ یادگار بننے کی کوشش کریں" (بحوالہ انجام کراچی ۲ر جولائی ۱۹۵۶ء)

۵۔ پھر بھی اونچے تیری مسجد کے مینارے نکلے

علّامہ اقبالؔ

اور

قائدِ ملّت نوابؔ بہادر یار جنگؒ

ہم مولانا روم کے کلام میں سورج کی روشنی میں چراغ جلا کر ایک بزرگ کو تلاش کی منزل میں سرگرداں دیکھتے ہیں۔ جب ان بزرگ سے سوال کیا جاتا ہے کہ اجالے میں چراغ لئے آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں تو فرمایا کہ ایک مرد کامل کی تلاش ہے، مولانا روم کو جس مرد کامل کی تلاش تھی وہ دانائے راز اقبال کی صورت میں، ان کے افکار کا علمبردار، ان کا مطلوبہ مرید، ان کو مل گیا۔

اقبال کا پیام دراصل قرآن کا مطلوب انسان تھا۔ ایک ایسا مرد مجاہد جس کی زندگی کا نصب العین، ملّت کی نشأۃ ثانیہ اور احیاء دین ہو اور جس کا قلب، خلافت الہیہ کے تصور سے مزین ہو، بارگاہِ رب العزت میں اقبال نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی تھی ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں پھر ہو استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلبؔ جگر،

اس طرح خلافتِ الٰہیہ کے تصور پر مبنی، خلافت کے قلبؔ جگر کی اقبال کو تلاش تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے دَور اول تک مسلمانوں میں صرف چار شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کو ماضی کے آئینہ میں دیکھا اور حال کی الجھنوں میں پھنسا پایا۔ اور خوش آیند مستقبل سے دور دیکھا۔ پھر ماضی کی عظمت کی حقیقتوں کا جائزہ لیا، حال کو مطابق حال بنانے کی کوشش کی اور مستقبل

کے لئے راستے ہموار کئے، ان میں جمال الدین افغانی، علامہ اقبال، قائداعظم
محمد علی جناح اور محمد بہادر خاں (بہادر یار جنگ) شامل ہیں۔"
(حوالہ: اقبال اور قرآن از علامہ سلیمان ندوی)

"اقبال اور بہادر یار جنگ کا اصل رابطہ اطاعت خدا اور عشق رسول کی رسی سے بندھا ہوا ہے۔ اقبال نے فنا فی اللہ ہو کر مقام خودی پر فائز ہونے کی جو آرزو کی تھی اس کا حاصل بہادر یار جنگ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔
دونوں کا فکری ارتکاز توحید اور رسالتِ محمدی کے علاوہ کچھ اور نہ تھا"۔ (حوالہ: مردِ مومن از مولوی میاں محمد سعید مشمولہ نظریۂ پاکستان کے عظیم مبلغ ص ۱۲۸)

کوئی صاحب نظر، نظر حیدرآبادی کے اس حقیقت افروز اظہار خیال سے اختلاف نہیں کرسکتا کہ:

بہادر یار جنگ کی شخصیت کا خمیر ہی اقبال کی فکر سے اٹھا تھا، قائد ملت کی فکر و نظر کے سرچشمہ شیریں۔ کے بارے میں قائد ملت کے رفیق پروفیسر غلام دستگیر رشید نے سچ فرمایا کہ:۔

ان کی فکر و نظر کا ایک سرچشمہ شیریں کلام اقبال تھا۔ اقبال کے کلام میں انہیں قلب و نظر کا ایک آئینہ مل گیا تھا"۔
(حوالہ: پروفیسر غلام دستگیر رشید مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں، مرتبہ نذیر الدین احمد ص ۲۹)

اقبال مغرب دیدہ اور اسلام فہمیدہ سے محمد بہادر خاں کا کتابی تعلق و تعارف سولہ سترہ سال کی عمر سے رہا۔

" آج سے ۲۵ رسال قبل ہماری شعر گوئی اور مطالعہ دواوین کا سب سے اچھا وقت صبح کے ابتدائی لمحات ہوا کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ادب نے ایک معیاری کیفیت پیدا کی تو خود بخود یہ احساس ہونے لگا کہ

شاعر پیدا ہوتا ہے، بنتا نہیں۔ اور ہماری میز سے ہٹ کر دواویں الماریوں کی زینت بنتے گئے۔ اور بانگ درا کے سوا میز پر کچھ باقی نہیں رہا۔ آخری دَور میں اگر کسی کے کلام نے اقبال کے کلام کا ساتھ دیا تو مولانا روم کی مثنوی تھی۔ (حوالہ: میں مطالعہ کس طرح کرتا تھا، مشمولہ نگارشات بہادر یار جنگ ص ۵۹۔ مرتبہ نذیر الدین احمد)

۱۹۳۱ء تک مسلمانوں کے قائد اور خطیب سحر البیان کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں ان کی شہرت کا ڈنکا بج چکا تھا، اس وقت ان کی عمر صرف ۲۶ برس تھی۔ اور اس وقت تک ان کی نظر اقبال کی فکر کے عمیق گوشوں تک رسائی پا چکی تھی۔ وہ اقبال کی فکر، کام، کلام اور مقام سے اس درجہ واقف اور متاثر تھے کہ اس تاثر نے ان کو اقبال کا گرویدہ بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کے الہامی کلام نے انہیں، اقبال کی نوائے عاشقانہ کا حاصل بنا دیا۔ اقبال کے درد دل کو جس مرد حق نے سمجھا اور اَوروں کو سمجھایا وہ محمد بہادر خاں کی ذات تھی۔ ابتدار میں خود اقبال کو اس امر کی شکایت تھی کہ اقبال کو شاعر سمجھنے والوں کی تو کمی نہیں ہے لیکن ان کے پیام کو سمجھنے والے کم ہیں۔

" لوگوں نے شمع کا نور دیکھا، لیکن اس کے سوز دل کا اندازہ نہیں کیا۔ جگنو کی چمک دیکھی لیکن اس عاشق وارفتہ کی جگر سوزی اور اضطرار کا راز جان نہ سکے۔ اقبال کو شکایت تھی کہ لوگوں نے انہیں شاعر اور مغنی سمجھ لیا ہے لیکن اس پیام پر ان کی نظر نہیں گئی جو ان کی نوائے عاشقانہ کا حاصل تھی۔

(حوالہ: کیا پوچھتے ہو کسے کھو دیا۔ از محترم المقام مولوی سید خلیل اللہ حسینی قائد مرکزی تعمیر ملّت۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں۔ مرتبہ نذیر الدین احمد ص ۲۲)

قائد ملّت کی اقبال فہمی کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے قبل علامہ اقبال

سے ان کی ملاقاتوں کا ذکر موجب دلچسپی ہوگا۔

علامہ اقبال سے نوابؒ بہادر یار جنگ کی پہلی ملاقات

مولانا خواجہ حسن نظامی کو قائد ملت کی علامہ اقبال سے عقیدت و محبت اور ان کی والہانہ وابستگی کا علم تھا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال نے دہلی کا دورہ فرمایا، دہلی میں وہ ڈاکٹر انصاری کے مکان میں مقیم رہے، نواب بہادر یار جنگ ان دنوں دہلی میں تھے۔ ۱۳ مارچ ۱۹۳۳ء کے دن مولانا خواجہ حسن نظامی کے ہمراہ نواب صاحب نے پہلی بار علامہ اقبال سے ملاقات فرمائی۔

مولانا خواجہ حسن نظامی نے علامہ کی مصروفیات کا ہفتہ وار روزنامچہ دہلی مؤرخہ ۱۶ مارچ ۱۹۳۳ء میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"۱۳ مارچ ۳۳ء کو بارہ بجے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا جو ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مقیم تھے، نواب بہادر یار جنگ انکے مداح اور معتقد ہیں۔ میں نے نواب صاحب کا ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ان الفاظ میں تعارف کروایا۔

"اگر آپ بادشاہ ہیں تو یہ آپکے سپہ سالار ہیں اور اگر آپ شمع ہیں تو یہ آپکے پروانے ہیں اور اگر آپ دانا ہیں تو یہ آپ کے دیوانے ہیں"

(حوالہ: اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین ص ۲۶)

علامہ اقبال سے قائد ملت کی دو ایک اور ملاقاتوں کا مزید حال بھی علم میں آتا ہے مگر کتنی مرتبہ نواب صاحب کو علامہ اقبال سے نیازمندی کا موقعہ ملا۔ اس بارے میں عدم معلومات کے باعث کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔

علامہ اقبال کی نواب صاحب سے خط و کتابت کے بارے میں بھی کچھ تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال کی موجودگی

یں اقبال کا تصورِ شاہین پر.......... تقریر کرنے اور داد پانے کا مژدہ بھی سننے کو ملتا ہے۔ اس تقریر کا ذکر نواب صاحب نے یوم اقبال کے جلسے میں تقریر کے دَوران فرمایا تھا:۔

"آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصورِ مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے انتقال کے بعد اپنا تحفۂ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔"

۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال نے پہلی بار قائدِ ملت کو بذریعۂ خط مخاطب فرمایا تھا۔ اس وقت تک علامہ اقبال نواب صاحب سے غائبانہ تعارف رکھتے تھے۔ یہ خط کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی اعانت سے متعلق ہے۔

لاہور ۱۴ ستمبر ۳۳ء

مخدومی جناب نواب صاحب!

السّلام علیکم

مظلومین کشمیر کی امداد کے لئے آپ سے درخواست کیلئے یہ عریضہ لکھا ہوں۔ اس وقت حکومت کی طرف سے ان پر متعدد مقامات چل رہے ہیں۔ جس کے اخراجات وغیرہ کے لئے فنڈ کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے یہ مشکل حل ہو جائے گی۔ اس سے پہلے ایک خط مجھے ایک بزرگ محمد اعظم خاں عثمان آباد کی طرف سے آیا تھا۔ انہوں نے خود بھی چندہ کر کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا اور مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کی توجہ اس طرف منعطف کروں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مسلمانانِ کشمیر کو امداد کا مستحق تصوّر کرتے ہیں۔

باطبع اور ذہین قوم ایک مدت سے استبداد و ظلم کا شکار ہے۔ اس وقت مسلمانانِ ہند کا فرض ہے کہ ان کے موجودہ مشکلات میں ان کی

مدد کی جائے ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ امید کہ آپکا مزاج بخیر ہوگا ۔ یہ خط خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے معرفت آپ تک پہنچاتا ہوں ۔ مجھے آپکا اڈریس معلوم نہ تھا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ میرا خط کسی اور طرف چلا جائے ۔

مخلص

اقبال

نواب صاحب کے ایک خط سے علامہ اقبال سے نواب صاحب کی خط و کتابت کے سلسلے کا پتہ چلتا ہے ۔ یہ مذکور خط نواب صاحب نے شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر شعبۂ معاشیات کے نام لکھا تھا ۔

" اس سے قبل بھی تحریر کر چکا ہوں کہ مکاتیب اقبال (موسومہ قائد ملت) کا آپ سے زیادہ میں متلاشی ہوں اپنے کاغذات کا ایک ایک پرچہ تلاش کیا لیکن افسوس ہے کہ وہ طبلق ہاتھ نہ آیا " ۔

(حوالہ : خط نمبر ۴۸۲ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اوّل)

قائد ملت علامہ اقبال سے اپنی دوسری ملاقات کے سلسلے میں یہ دلچسپ واقعہ بیان فرماتے تھے کہ " ایک بار لاہور گئے اور اس کی انہیں بڑی تمنا تھی کہ وہ اقبال کو شعر کہتے ہوئے حال میں دیکھیں ۔ خوش قسمتی سے وہ بہت سویرے آہ سحر خیزی کے وقت جاوید منزل پہنچ گئے ، حسبِ عادت اقبال تلاوت سحر کے بعد شعر کہنے میں محو تھے ، علی بخش مرحوم کی مدد سے نواب صاحب بڑی خاموشی سے ان کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے ۔ اقبال اپنی شعر گوئی اور گنگنانے میں محو تھے ۔ یہ مشغلہ ختم ہوا تو باہمی گفتگو ہوئی ۔ یہ واقعہ ایک نمونہ اور علامت ہے کہ وہ اقبال اور کلام اقبال سے کس طرح دل بستگی رکھتے تھے "۔

(حوالہ : اقبال اور قائد ملت بہادر خاں مرحوم ، از پروفیسر غلام دستگیر رشید (رفیق قائد ملت) مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں ص ۲۹ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدرآباد دکن)

نواب صاحب کی علامہ اقبال سے تیسری ملاقات کے بارے میں مولوی عبدالرحمٰن سعید رفیق قائد ملت تحریر فرماتے ہیں کہ "اس دوسری ملاقات کے تیسرے روز نواب صاحب نے بہ تعیین وقت حضرت اقبال سے ملاقات کی اور ملّتِ اسلامیہ کی تنظیم اور اس کے مستقبل کے بارے میں ان سے تبادلۂ خیال کیا۔

بوقتِ رخصت مصافحہ کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا کہ یہ مصافحہ اس امر کا عہد ہے کہ نواب صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدمت ملت کے لئے وقف کریں گے"۔ (حوالہ: صدق جدید لکھنؤ ۱۷ اگسٹ ۱۹۷۳ء)

متذکرہ تیسری ملاقات کے بارے میں قائد ملت کے ایک اور رفیق مولوی محمد احمد خاں صاحب بیان فرماتے ہیں کہ "اس ملاقات کی بہادر یار جنگ نے تفصیلات تو نہیں بتائیں۔ البتہ اتنا ضرور کہا تھا کہ" لندن کی گول میز کانفرنس میں مملکت حیدرآباد کے تعلق سے سر اکبر کا رول نہایت نامناسب تھا"

" سر اکبر حیدری کی شخصیت بڑی نزاعی رہی۔ سر اکبر کا ذہن کانگریس اور قومی تحریکوں سے متاثر رہا۔ غیر منقسم ہندوستان کے نقشہ میں حیدرآباد انہیں صرف ایک ریاست ہی نظر آتا رہا۔ ہندو اکثریت سے آباد اور ہندوستانی علاقوں سے گھری ہوئی ریاست، سر اکبر حیدری کی سیاسی فہم و فراست کا محور دراصل انگریز ریزیڈنٹ کی چہار دیواری تھی۔ انگریزوں کی اکثریت نوازی حیدرآباد میں سر اکبر کی حکمتِ عملی کی شکل میں کارفرما تھی۔

دین او آئینِ او سوداگری ست
عنتری اندر لباس حیدری ست

مذکورہ بالا شعر کے متعلق بہادر یار جنگ نے اقبال سے دریافت

کیا تھا کہ حیدری کا اشارہ اکبر حیدری کی طرف تو نہیں ہے، جواب میں اقبال نے لکھا تھا "میں خوش ہوں کہ آپ میرا کلام اتنے غور سے پڑھتے ہیں"

(حوالہ : اکبر حیدری اور اقبال ص ۲۰۸،۲۰۹)

بہادر یار جنگ سے روایت ہے کہ ان سے خود اقبال نے کہا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس کے دوران نجی طور پر وزیر ہند اور انگلستان کے دوسرے مدبرین سے حیدر آباد کے آئینی موقف کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور انہیں اپنے دلائل سے قائل کر دیا کہ حیدر آباد کو اس کے مفوضہ علاقوں کی واپسی کے ساتھ مقبوضہ جاتی درجہ دے دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنی آزاد حیثیت میں کامن ویلتھ کی تقویت کا باعث ہو۔ لیکن بدقسمتی سے خود حیدر آباد کے وفد کے سربراہ سر اکبر حیدری نے اس کی مخالفت کی اور مخالفت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ایسا عمل قبل از وقت ہوگا اور ممکن ہے اس اقدام سے ہندو جماعتیں ایجی ٹیشن کریں اور دوسری ریاستیں بھی ایسے ہی مطالبات نہ پیش کر دیں۔

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں سے مرعوب ذہنیت (سر اکبر حیدری) نے ایک عظیم مدبر (علامہ اقبال) کے تاریخی اور انقلابی مشورہ کو پہلی ہی منزل میں مسترد کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں حیدر آباد کے مستقبل کو تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈھکیل دیا۔

اس سعی پر خلوص کی ناکامی کا اقبال کو آخر تک افسوس رہا۔

(حوالہ : اقبال اور حیدر آباد دکن از نظر حیدر آبادی)

علامہ اقبال سے قائد ملت کی ملاقاتوں میں یہ واقعہ کہ "جب بہادر یار جنگ رخصت کے لئے کھڑے ہوئے اور علامہ سے مصافحہ کے لئے انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اقبال نے ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور فرمایا۔ "وعدہ کرو کہ ملّت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دو گے"

آپ اسے مصافحہ رخصتی کہئے یا عہد خدمت، میں تو اس کو بیعت کہتا ہوں۔ بیعت جو ایک پیر مرد نے ایک جوان رعنا سے لی، گویا شیخ وقت نے سالک طریقت کو رسم وراہ منزل سے باخبر کر دیا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس بہادر جوان نے اپنی عمر کے شب و روز کس طرح گذارے۔

(حوالہ: علامہ اقبال اور بہادر یار جنگ، از مولوی محمد احمد خان صاحب)

سچ تو یہ ہے کہ متذکرہ بالا واقعہ علامہ اقبال کی نظر کلیمی کا مظہر ہے کہ قائد ملت کو علامہ اقبال نے رسم وراہ شاہبازی کی منزل سے باخبر کر کے انہیں اپنے منصب کا جانشین بنا دیا۔

بہادر یار جنگ کی زندگی، اقبال کے مرد مؤمن کی مکمل تفسیر تھی۔
نواب صاحب نے اقبال کے نظریات پر ملتِ اسلامیہ کی سیاست کی بنیاد رکھی، وہ اپنی جادو بیان تقریروں میں اقبال کے آتشیں افکار کی گرمی سے قوم میں حوصلہ اور جذبہ پیدا کرتے اور غلاموں کے لہو کو سوز یقین سے بدل دیتے تب ہی تو کنجشک فرومایہ شاہین کے مقابل ہوتے۔

"اقبال کو انہوں نے نہ صرف پڑھا اور سمجھا تھا بلکہ اس کے کلام و پیام کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کا قال ان کا حال بن گیا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے اور درس اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا۔" (ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، رفیق قائد ملت)

اس خصوص میں علامہ اقبال کے تعلق سے نواب صاحب کے احساسات کو ان کی تقریر و تحریر کے آئینے میں دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اقبال کی فکر کا کوئی گوشہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔

"اقبال نے خود اپنے الفاظ میں حجازی لے کو اپنے ہندی نغمہ میں

ایسا دلکش بنایا کہ کتاب اللہ جس کو اس کے ماننے والوں نے پس پشت ڈال دیا تھا آج پھر ہمارے آنکھوں کا نور بن رہی ہے، میری دلی تمنا ہے کہ آپ کے یہ اجتماع کامیاب ہوں اور ان کے شرکا رگفتار کے اس غازی کے خواب کی تعبیر بنیں۔ اور کردار کے غازی بن کر اس کی روح کو جنت الفردوس میں حقیقی سامانِ اطمینان مہیا کریں۔" (حوالہ: پیام قائد ملت بضمن یوم اقبال ص ۴۰۹، ۴۱۰ مکتوب نمبر ۳۹۶ مکاتیب بہادر یار جنگ، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

" یہ سن کر اقبال سے میری عقیدت بڑھ گئی کہ ان کے مطالعہ نے آپ کی بے یقینی کو یقیں کے راستے پر ڈال دیا۔ ایمان صحیح کی منزل جس سے آپ اپنے آپ کو محروم سمجھتے ہیں اب زیادہ دور نہیں ہے، میں آنکھوں کے بہاؤ کو قلب کا غسل کہا کرتا ہوں۔ خدا آپ کی اس رقت کو اور بڑھائے۔ اس سے سخت دل میں وہ نرمی پیدا ہوگی جو نقوش ایمانی کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اب جبکہ اقبال اور رومی کا آپ مطالعہ کر چکے ہیں، قرآن سے قریب ہونے کی کوشش کیجئے۔" (حوالہ: مکاتیب بہادر یار جنگ ص ۵۴۶ مکتوب نمبر ۵۴۰ بنام جناب عبدالحمید نظامی، ایم۔ اے نوائے وقت لاہور، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

" اقبال نوائے عصر تھا۔ مبارک ہیں جنہوں نے اس کی صدا پر لبیک کہا۔ اقبال کے سارے پیام کا خلاصہ عمل ہے۔ اگر چند نوجوان بھی آمادہ عمل ہو گئے تو اقبال کی روح کو حقیقی مسرت ہوگی اور ان کے دنیا میں آنے کا مقصد پورا ہو جائے گا۔" (حوالہ: مکتوب نمبر ۵۶۷ ص ۵۶۹، ۵۷۰ مکاتیب بہادر یار جنگ، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

درس اقبال میں

طبعِ مسلم از محبّت قاہر است
مومن از عاشق نہ باشد کافر است

اقبال کا یہ شعر مولوی غلام دستگیر رشید نے پڑھا۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے قائد ملّت سے مخاطب ہو کر فرمایا:-

نواب صاحب یہاں تو اقبال نے شاعری کی ہے۔ اتنا سخت فتویٰ میں نہیں سمجھتا کہ دیا جا سکتا ہے اور اس کا جواز قرآن میں ملتا ہو۔

قائد ملّت نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ اقبال کوئی بات قرآن سے ہٹ کر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (جو مومن ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے اشد محبّت ہوتی ہے) پھر اس آیت شریف کی تائید میں حدیث شریف پیش کی، جو شرط ایمان کا جزء لاینفک ہے ذات رسالتمآب سے محبّت۔ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری ذات اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور تمام محبوبین سے زیادہ محبوب تر نہ ہو جائے تب تک وہ مؤمن نہیں۔

علامہ اقبال پر نواب صاحب کی کئی یادگار تقریریں ہیں، اقبال کا مرد مومن، اقبال کا شاہین زادہ اور فکر اقبال پر ان کی یادگار تقریروں میں دو تقریریں تو ایسی ہیں جس میں پوری تقریر اقبال کی تشبیہات و استعاروں میں کی گئی ہے۔ حسن یار جنگ کے لئے یوم اقبال کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا کہ:-

"میں حیران ہوں کہ یہ فرض میرے سپرد کیوں کیا گیا جب کہ مجھے انوری ہونے کا دعویٰ ہے نہ قاآنی ہونے کا۔ بہرحال ایک اقبال آفریدہ شاہین زادہ کی بزم اقبال کے اس جلسہ کی تحریک صدارت کیلئے کھڑا ہوں۔

حضرات! آج تہذیب مشرق آپ اپنا خون بہانے میں مصروف ہے۔ شاخِ نازک پر بنے ہوئے آشیانے ایک ایک کر کے توڑے جا رہے ہیں، آج کسی کا آداب خود آگاہی سے واقف ہو جانا

غلاموں کو شہنشاہی کے رموز سے واقف کرا دیتا ہے ۔ آج کسی کی ہوس رائی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کر رہی ہے، آج جاوید نامہ کا قلزم خونی شکل اختیار کر گیا ہے ۔ آج ہندوستان کے پاؤں کی بیڑیاں وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں اور روحِ جعفر تنِ دیگر کی تلاش میں پھر رہی ہے ۔ ان حالات میں صرف اس قدر کہدینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک صحیح آدمی ہی اس جلسہ کی صدارت کیلئے موزوں ہو سکتا ہے جو نگاہ بلند رکھتا ہے ۔ جس کا سخن دلنواز ہے اور روح پرسوز، جو آفاق میں گم نہ ہو گی ہو بلکہ آفاق کو اپنے میں گم کر لیا ہو، جس نے خاکبازی نہ سیکھی ہو بلکہ خودی کا درس سیکھ کر دوسروں کو خود آگاہ بنا دیا ہو اور میں یہ جذبہ نواب حسن یار جنگ بہادر میں پیدا ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں ۔ ابھی بانگ درا بند نہیں ہوئی ہے ۔ ضرب کلیم کی تاب کس کو ہے اور ضرب کلیم کی تاب لانے کی کون ہمت کر سکتا ہے ۔ جاو، پیام مشرق اس کے بعد کی منزل ہے شاید مسلمانوں کا یہ ڈی جنریٹیڈ وہ طبقہ جس کو بیدار کرنے کیلئے اقبال کھڑا ہوا ۔ جس دن وہ بیدار ہو جائے گا ۔ اقبال کو پڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی ۔ اس عہد میں جبکہ بانگ درا کانوں سے اتر کر قلب سے قریب تر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ میں اس کو ہی مقام شکر سمجھتا ہوں ۔ حیدرآباد کے ایک شاہین زادہ کو جس کے اجداد کی شاہنیت حیدرآباد کے ہر باب پر ثبت ہے ۔ جو حیدرآباد کی قسمت کو بدلنا چاہتا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحریک صدارت کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنا ٹھیک نہیں کہ اقبال نوجوانوں کیلئے تڑپ کر مرا ہے اور آج ایک نوجوان اقبال کے جلسہ کی صدارت کر رہا ہے ۔ اس طبقہ سے جس سے میں مایوس ہوا جا رہا ہوں ۔ یہ امید کی ایک کرن سے کم نہیں ؛

(حوالہ : اقبال اور بزم اقبال حیدرآباد دکن ص ۹۳، ۹۴
ازعبدالرؤف عروج دارالادب پاکستان کراچی)

اقبال کے اس شاہین زادے نے "اقبال کا شاہین زادہ" کے زیرِ عنوان اقبال کے اس پیام حیات کی اقبال ہی کی زبان میں کس دلکش انداز میں تصویر کشی کی ہے:-

میرے نالے فضائے حیدر آباد سے کچھ اس طرح نا آشنا ہو چکے تھے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصور مؤمن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے انتقال کے بعد مختصراً اپنا تحفہ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔

اقبال کے پیام کا سب سے نمایاں حصہ مسلمان کی خودی کو بیدار کرنا ہے۔ اپنے پورے کلام میں انہوں نے اسی چیز کو بہ انداز مختلف پیش کیا ہے اس کے لئے انہوں نے جو تشبیہیں اختیار کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شاہین اور شاہین زادہ کی تشبیہ ہے وہ جتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگس خاکی نہیں بلکہ شاہین بلند پرواز و فضا پیما رہے اقبال کے کلام کا رنگ شاہ بازی سکھاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مسلمان کا مقام صحبتِ مرغِ چمن نہیں بلکہ وسعت ارض و سما ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے فطرت انسانی کی بہت سے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جب محنت و مشقت کے بغیر رزق حاصل کرنے لگتا ہے اور اس کا عادی بن جاتا ہے تو اسکی بہت سی ایسی صلاحیتیں اس سے چھن جاتی ہیں جن پر ان کی با عزت انفرادی و اجتماعی زندگی کا مدار ہے، ان انسانی صلاحیتوں میں سب سے ضروری اور اہم صلاحیت انسان کی شجاعت اور اس کا جذبۂ عزتِ نفس ہے اور مفت خوری کا اثر سب سے زیادہ اسی صلاحیت پر پڑتا ہے اور شجاعت و بلند ہمتی جُبن اور پستیٔ خیال سے ... بدل جاتی ہے اسی کو اقبال نے

اس شعر میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر شاہین بچوّں کو بھی پابند قفس کر کے عطائے صیّاد کا امیدوار بنا دو تو چند روز میں بٹیر کے پَر کی پھڑ پھڑاہٹ سے بھی لرزہ بر اندام ہو جائیں گے۔

تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد
چو شاہین زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

تم غور کرو کہ کیا حیدرآباد کا مسلمان گذشتہ دو سو سال سے اندر قفس با دانہ ساختن کا عادی نہیں ہو گیا ہے اور کیا اسی کا نتیجہ آج شاہین زادہ کی سایۂ بال تدرو سے لرزہ بر اندام نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک آرام و راحت زاغ و زغن کا کام ہے اور قید و صید کی بندشیں قسمت شاہین کی سعادت اور جب تک کوئی ان مرحلوں سے نہیں گذرتا عزت و احترام کے مقام رفیع کو حاصل نہیں کر سکتا وہ کہتے ہیں ؎

شہ پر زاغ و زغن در بند و قید و صید نیست
کیں سعادت قسمت شہ باز و شاہین کردہ اند

انہوں نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ کرگس کی دوں ہمّتی چھوڑیں اور شاہین کی پرواز اپنے بال و پر میں پیدا کریں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی دہر میں لیکن
شاہیں کا مقام اور ہے، کرگس کا مقام اور

اقبال کے نزدیک علم و فراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جبتک ان کا حامل تیغ و سپر سے بھی آراستہ نہ ہو ان کے نزدیک شاہین زادگی کی شرط اول مرد غازی کی تیغ و سپر سے موانست ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎ من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

(حوالہ: تقریر قائد ملّت بعنوان اقبال کا شاہین زادہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۹ء کے جشن یوم اقبال منعقدہ زمرد محل میں فرمائی۔ مشمولہ بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقریریں ——— مرتبہ نذیر الدین احمد)

علامہ اقبال کے ایمان افروز انقلابی پیام سے قائد ملت اس درجہ متاثر تھے کہ ان کی کوئی تقریر یا تحریر ذکر و فکر اقبال سے خالی نہ ہوتی:

قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال سے ان کی ذہنی وابستگی دراصل روحانی رقابت کا نتیجہ تھی۔

۲۱۰

کے ہر گوشہ سے میرے پاس اس وقت تک سینکڑوں خطوط وصول ہوئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کی بے عملی اور بے جا مصلحت اندیشی کا جو غلط تصوّر آپ کی پالیسی اور حکمتِ عملی سے ناواقفیت کی بنا پر عوام اور خصوصاً نوجوانوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا اس تقریر نے بڑی حد تک ازالہ کر دیا ہے۔

(حوالہ: خط موسومہ قائد اعظم خط نمبر ۵۱۔ ص ۵۲۔ ۵۲۱ مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی)

قائداعظم
سے
نوابؒ صاحب کا تعارف و تعلق

۱۹۳۴ء میں سر کاؤس جی جہانگیر ہال میں جلسہ میلاد میں قائداعظم سے اپنی ملاقات کا ذکر قائدِ ملت نے "جناح پہلی نظر میں، ایک تاثر" کے زیرِ عنوان قلمبند فرمایا تھا۔ وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:—

آج سے دس برس پہلے ربیع الاوّل کا مہینہ تھا اور مجھ سے مسلمانانِ بمبئی نے خواہش کی تھی کہ بمبئی کے عظیم الشان جلسہ میلاد النبیؐ کی صدارت کروں سر کاؤس جی جہانگیر ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اپنے و بیگانے، دنیا کے سب سے بڑے مقنن، سب سے بڑے جرنیل، سب سے بڑے ریفارمر، سب سے بڑے انقلابی، غیر اللہ کے سب سے بڑے باغی اور اللہ کے سب سے بڑے نبیؐ کے حالات سننے کو جمع تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ مجلسِ استقبالیہ کی صدارت کون کر رہے تھے۔ مگر اتنا یاد ہے کہ صدر مجلس استقبالیہ کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا۔ کہ جلسہ میں ایک عام ہیجان پیدا ہوا اور لوگوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ خطبہ میں کوئی ایسا غیر معمولی مقام نہ تھا جس پر اتنے جوش کا اظہار کیا جاتا۔ میں نے جلسہ میں چاروں طرف متجسس نگاہ ڈالی اور ایک دبلے پتلے آدمی کو گورے رنگ، اونچی ناک، مضبوط جبڑوں، درخشاں پیشانی اور سینہ کو چیر کر دلوں تک گھس جانے والی تیز نگاہوں

کے ساتھ اپنا مضبوط ہاتھ کھلی ہوئی لمبی لمبی انگلیوں سمیت پیشانی سے لگاتے صاف ستھرا اور استری کیا ہوا سوٹ پہنے ننگے سر نعروں کا خاموش لیکن دلوں کو موہ لینے والا جواب دیتا ہوا دیکھا، میز سے لگی ہوئی میری بازو والی کرسی پر جلسہ کے منتظم اور سکریٹری سیٹھ زکریا مینار بیٹھے تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ ہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح جو کبھی نام نہاد آل انڈیا نیشنل کانگریس کے روح رواں تھے، ہندوستانی قومیت کے علمبردار تھے، مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور انگلستان کے مشہور بیرسٹر تھے اور آج مسلمانوں کی آنکھ کا تارا۔ ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ کا سہارا۔ کانگریس کے فاتح اور مسلم لیگ کے علمبردار ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً وَلَاتَفَرَّقُوا کا سبق پھر ایک مرتبہ پڑھانے کا عزم کر لیا ہے اور سب کی غلامی سے چھوٹ کر محمّد رسول اللہ ؐ کے آستانہ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ مسٹر جناح ڈائس پر بچھی ہوئی پہلی صف کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے، خطبۂ استقبالیہ ختم ہوا اور میں نے اپنا خطبۂ صدارت شروع کیا، سر کاؤس جی جہانگیر ہال کے ہزاروں سامعین کا اجتماع میری ابرو کو جنبش بھی نہ دے سکتا تھا لیکن قائداعظم کی شخصیّت اور رعب میرے قلب پر چھایا جا رہا تھا اور میری زبان سینکڑوں تجربوں میں کامیابی کے باوجود رکتی محسوس ہوتی تھی اور میری فکر جس کو الفاظ کے انتخاب میں ادنیٰ پس و پیش بھی نہ ہوا تھا، ہر لفظ اور جملہ کو چنتے وقت تأمل کرتی تھی کہ ایک جوہری بیٹھا ہے کہیں اس کی ٹکسال میں میری جنس کھوٹی نہ ثابت ہو۔ گو یہ تأمل اور جھجک عارضی تھی لیکن اس نے میرے خطبۂ صدارت کو خذف سے الماس بنا دیا، خطبۂ صدارت ختم ہوا اور تکبیر کے نعروں میں محمّد اور علی رضؓ کے ناموں سے نسبت رکھنے والا عقل و دل کے جناحین پر خود بھی عرش کی سیر کرنے لگا اور اپنے سامعین کو بھی فرش سے بلند کرنے لگا۔ تقریر مختصر تھی

جس کے ابتدائی جملے میرے لئے سند تھے اور آخری حصّہ قانونِ محمدیؐ کا۔ دنیا کے دوسرے مشہور قوانین خصوصاً "رومن لا" سے متقابل مطالعہ تھا، موجودہ قوانین کا ایک عالمِ متبحر جس کی زندگی "رومن لا" کی ذرّیات کو اپنی آغوش میں پرورش کرتے ہوئے گذری، جب محمدیؐ قانون کے گوشے کھولنے لگا تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ تعلیم مغرب کے شیدائیوں نے حسن محمدی کے کیسے کیسے جلوے دیکھے ہوں گے۔ برخواست کے وقت مجھے تعارف کی مسرت حاصل ہوئی اور دوسرے دن "ٹل گمنر روڈ" کی مختصر مگر آراستہ کوٹھی میں ملاقات کا شرف نصیب ہوا۔ ملاقات کی ابتدا میں مجھ پر ان کی شخصیّت کا رعب طاری تھا لیکن چند لمحوں بعد معلوم ہوا کہ انسان کی سب سے بڑی بڑائی یہ ہے کہ وہ چھوٹوں سے چھوٹا ہو کر ملتا ہے، میں اس وقت تک سیاسیات سے کوسوں دور تھا، حیدر آباد کی فضا امن وسکون سے ہم آغوش تھی، برطانوی ہند کے ہنگامے ابھی ریاستی ہند کے حدُود کو عبور نہیں کرنے پائے تھے۔ ۱۹۲۵ء کا قانون حکومتِ ہند ابھی آب و گل میں آغشتہ تھا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد شائع شدہ وائٹ پیپر (کاغذ ابیض) سیاسیات ہند کے ماہرین کی توجہ کا مرکز تھا، انگلستان میں جوائینٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے اپنے کاروبار شروع نہیں کئے تھے، سیاسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے چند سوالات کئے اور ہندوستان کے استاد سیاست نے مسکراتے ہوئے ان کے چند گوشے کھولے۔ مسٹر جناح ابھی تک ہندوستان میں انگلستانی پارلیمانی جمہوریت کا تجربہ کرنے پر مصر تھے۔ جداگانہ انتخابات کے قائل ہو چکے تھے لیکن اقبال کے تصور قومیّت کو اس کی بنیاد پر ہندوستان کے شمال مغربی گوشے میں اسلامی سلطنت کے قیام کو ایک ناقابل عمل لیکن خوش آئیند نظریہ تصور کرتے تھے اور مسز سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں ابھی تک AMBASSADOR OF HINDU MUSLIM UNITY بنے ہوئے تھے۔ مجھ اقبال کے حلقہ بگوش کو ان کی سیاست

اپنی طرف زیادہ مائل نہ کر سکی اور میں اس ملاقات کی یاد لئے ہوئے بمبئی سے حیدرآباد واپس آیا"۔

اس تاثر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نواب صاحب کی قائداعظم سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ مخفی مباد اس تاریخی اور اثر پذیر ملاقات سے سات سال قبل ۱۹۲۸ء میں جب کہ نواب صاحب کی عمر ۲۳ سال تھی (اور وہ اس وقت صرف محمد بہادر خاں تھے، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس انتظامی کے رکن تھے) حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ٹاؤن ہال حیدرآباد میں پہلی بار متعارف کروائے گئے۔ قائداعظم اس اجلاس میں (جو ماہرین تعلیم، علماء و اکابرین اور رہنمایان ملت کی تعلیمی مسائل پر سالانہ کانفرنس تھی) حسب پروگرام (درمیان اجلاس) تشریف لائے، اجلاس کی کارروائی کو روک کر اس موقعہ پر ڈاکٹر ناظر یار جنگ صدر کانفرنس نے قائداعظم کی آمد پر استقبالیہ تقریر فرمائی، اور ان کی آمد پر شرکاء کانفرنس کی جانب سے شکریہ ادا کیا۔ اس اجلاس کو قائداعظم نے مخاطب فرمایا۔ بعد ازاں شرکاء کانفرنس سے قائداعظم کا تعارف کروایا گیا۔ اس یادگار موقعہ پر قائداعظم کے ہمراہ گروپ فوٹو لی گئی، اس یادگار فوٹو میں ناظر یار جنگ کے بازو قائداعظم ہیں اور قائداعظم کے بازو نواب صاحب تشریف فرما ہیں۔

(قائداعظم اور نواب صاحب کی پہلی ملاقات کی یہ پہلی یادگار تصویر ہے جو سوانح بہادر یار جنگ جلد اول میں ۲۷ نمبر پر ہے۔ اس جلسے کی تفصیلی روئیداد کیلئے ۱۹۲۸ء کی سالانہ رپورٹ ملاحظہ ہو)

اس طرح ہمیں ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۴ء کی دو ملاقاتوں کا علم ہوتا ہے ان دو ملاقاتوں کے بعد قائداعظم سے قائد ملت کے ربط و تعلق کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن ۱۹۳۴ء کی دوسری ملاقات جو قائداعظم کے مکان پر ہوئی وہ نواب صاحب کی صلاحیتوں سے قائداعظم کی آگاہی کا وسیلہ بنی۔

"سیرت کے اس جلسے میں قائداعظم نے قائدملت کی تقریر سنی۔ اس کے بعد دونوں شخصیتوں کے درمیان اللہ نے خبر و نظر کا یہ رشتہ اتنا مستحکم کر دیا کہ انہوں نے مل کر مسلمانوں کی اس کشتی کو لنگر انداز کر دیا جس کو حالیؔ منجدھار میں ڈوبتے دیکھ کر بڑے دُکھ سے دعاگو تھے"۔

رسول پاکؐ کی سیرت کے اس مبارک جلسے میں جہاں انوار کی بارش تھی یہ دو روشنیاں اس طرح ملیں کہ پھر مسلمانانِ ہند پر چھائی ہوئی ظلمت اور تاریکی کے سیاہ بادل انہوں نے کاٹ ڈالے۔

(حوالہ: قائداعظم اور قائدملت از اختر جمالی)

کچھ مضمون نگار اس خصوص میں یہ سمجھتے ہیں کہ شولاپور کے اجلاس سے قائدملت قائداعظم سے قریب ہوئے۔

"قائداعظم نے شولاپور میں خطبۂ صدارت انگریزی میں دیا تھا جسے حاضرین کی اکثریت سمجھنے سے قاصر تھی، ضرورت تھی کہ اس کا اُردو ترجمہ سنایا جائے نظر انتخاب بہادر یار جنگ پر پڑی، نواب صاحب نے ایک منٹ کی تاخیر کئے بغیر خطبۂ صدارت کا اتنے فصیح و بلیغ انداز میں ترجمہ سنا دیا کہ محفل جھوم گئی اور اس طرح مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو ایک زبردست خطیب اور مفکر قائد کو ایک معجز بیاں زباں مل گئی"۔

(از نظر حیدرآبادی، ص ۱۳، ۱۴۔ مضمون مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر دکن کی نظر میں۔ مرتبہ نذیرالدین احمد)

اجلاس پٹنہ کے بعد سے قائداعظم کا قریبی ربط و تعلق تو اظہر من الشمس ہے مگر اجلاس پٹنہ سے پہلے قائداعظم سے ان کے ربط و تعلق کی کڑیاں نہیں ملتیں۔ ویسے بلاد اسلامیہ کے دورے ۱۹۳۱ء کے اواخر میں ان کی قائدانہ صلاحیتیں پوری آب و تاب سے نکھر کر سامنے آچکی تھیں اور بہادر یار جنگ کی شخصیت، قائداعظم کی دُوررس نگاہوں کے انتخاب میں سما چکی تھیں"۔ اب قائداعظم کو

تعلق و تعارف پیدا کرنے کی ضرورت درپیش تھی، قائداعظم کو بہادر یار جنگ کی شعلہ نوائی، جوہر قیادت کی بے پناہ صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ تھا (پٹنہ کے اجلاس سے قبل کے تانے بانے نہیں ملتے) لیکن پٹنہ کے اجلاس سے مسلم لیگی رہنماؤں کی صفوں میں ان کی قد آور شخصیت پوری آب و تاب سے ابھری۔ قائداعظم کی ایما پر وہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں بڑی باقاعدگی سے شرکت فرمانے لگے اگرچہ وہ مسلم لیگ کے رکن نہ تھے اور نہ ہی ورکنگ کمیٹی کے ممبر، لیکن قائداعظم انہیں بطور خاص ورکنگ کمیٹی کے ہر اجلاس میں مدعو فرماتے۔ پٹنہ کے اجلاس کے بعد سے شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہوتا جو مسٹر جناح سے مل کر وہ اہم مسائلِ سیاسی پر تبادلہ خیال نہ کرتے، نواب بہادر یار جنگ کی قابلیت اور جامعیت کا اثر مسٹر جناح پر گہرا ہوا۔"

(حوالہ: مضمون قائد ملت از مسلم لیگی رہنما مولانا عبدالحامد بدایونی۔
ہفتہ وار آہنگ حیدرآباد ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء)

قائداعظم جیسے مدبّر کی نظر میں ان کا جو مقام تھا وہ قائداعظم کی گرانقدر تحریر میں "عیاں را چہ بیاں" کے مصداق ہے۔ "نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ کہ نواب بہادر یار جنگ کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں ہے، لیکن بڑے بڑے نازک موقعوں پر نواب صاحب میرے لئے معین اور رہبر ثابت ہوئے خدا انہیں عمر دراز عطا کرے۔ آمین"

(حوالہ: کتاب آفتاب دکن از حمیداللہ خاں شیدا، ص ۷
سنہ اشاعت ۲۷ اپریل ۴۴ء، مقام اشاعت پربھنی، حیدرآباد دکن)

سیاسی تعلق خاطر سے قطع نظر نجی حیثیت میں بھی قائداعظم، قائد ملّت سے اپنے ایک دیرینہ رفیق و ہمجولی اور دوست کی طرح ملتے، اس خصوص میں محمّد حنیف آزاد مرحوم فرماتے ہیں:

قائداعظم عام ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے تھے۔ دور از کار باتوں

سے انہیں سخت نفرت تھی، صرف مطلب کی بات اور وہ بھی انتہائی اختصار کے ساتھ سننے اور کرنے کی عادت تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص کمرے میں جہاں بہت کم لوگوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ صرف ایک صوفہ تھا، اس صوفے کیساتھ ایک چھوٹی سی تپائی تھی، اس میں صاحب اپنے سگار کی راکھ پھینکتے تھے، صوفے کے بالمقابل دو شوکیس تھے اُن میں وہ قرآن مجید رکھے رہتے تھے جو ان کے عقیدت مندوں نے ان کو تحفے کے طور پر دیئے تھے، اس کمرے میں ان کے ذاتی کاغذات بھی محفوظ تھے، عام طور پر وہ اپنا زیادہ وقت اسی کمرے میں گذارتے تھے، اس میں کوئی میز نہیں تھا۔ صوفے کے خالی حصے پر ان کے زیر مطالعہ کاغذات بکھرے رہتے تھے، ان کے لہجے میں ایک قسم کی کرختگی تھی، میں انگریزی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہوں لیکن جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ زور نہ دینے والے الفاظ پر بھی زور دے رہے ہیں۔

بہادر یار جنگ مرحوم قائداعظم کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ صرف انہی سے ان کے مراسم بہت بے تکلفانہ تھے، وہ جب بھی ان کے یہاں قیام کرتے تو یہ دونوں شخصیتیں ٹھیٹ دوستانہ انداز میں قومی اور سیاسی مسائل پر غور کرتی تھیں۔ اس وقت قائداعظم اپنی آمریت کچھ عرصے کے لئے اپنی شخصیت سے جدا کر دیتے تھے۔" میں نے صرف یہی ایک شخص دیکھا جس سے صاحب ہمجولی کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بچپن کے ساتھی ہیں۔ جب آپس میں باتیں کرتے تو کئی مرتبہ قید و بند سے آزاد قہقہوں کی آواز سنائی دیتی ــــــــــــــــ بہادر یار جنگ کے علاوہ مسلم لیگ کے دوسرے سربرآوردہ اراکین، مثال کے طور پر راجہ محمود آباد۔ آئی آئی چندریگر، مولانا زاہد حسین، نواب زادہ لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل اور علی امام صاحب اکثر تشریف لاتے تھے لیکن صاحب ان سے بالکل دفتری انداز

میں پیش آتے تھے۔ وہ بے تکلفی کہاں جو بہادر یار جنگ کیلئے مخصوص تھی۔"
(حوالہ: میرا صاحب، انٹرویو محمد حنیف آزاد مشمولہ گنجے فرشتے، از
سعادت حسن منٹو)

قائداعظم ان کے قدر داں تھے اور وہ قائداعظم کے شیدائی۔

"قائداعظم کے وہ شیدائی تھے اور ان کی قیادت کی ترویج میں نواب مرحوم کا بڑا حصہ تھا۔ وہ کچھ ایسے خلوص اور عقیدت سے حضرت قائداعظم مدظلہٗ کہتے تھے کہ سننے والوں میں بھی یہی جذبۂ عقیدت پیدا ہو جاتا تھا!"
(مضمون پاکستان ان کی بھی یادگار ہے از مولانا جمال میاں فرنگی محلی)

قائداعظم کی ذات گرامی سے انہیں بے انتہا عقیدت و وابستگی رہی۔
کس پیار عقیدت اور فخر کے ساتھ قائد ملت نے فرمایا تھا کہ:

"۳۸ رسال کی عمر میں بہادر خاں نے کسی سے عشق کیا ہے تو ۶۸ رسالہ بوڑھے قائداعظم سے"، کتنا معصوم اور حقیقت افروز احساسات عقیدت کا آئینہ دار تھا یہ بے باک اظہار محبت۔

"بہادر یار جنگ کے کردار کی عظمت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان جیسی صلاحیتوں کا انسان جس کے لئے مطلق قیادت کا مقام خود اس کے قدم لینے پر تیار تھا، انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و فلاح کی خاطر اپنے اس کمال کو قائداعظم کے قدموں پر ڈال دیا اور خود کو ان کا ایک تابعدار اور جانثار سپاہی بنائے رہے۔

مرحوم کو قائداعظم کی فراست و حکمتِ سیاسی پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ تنہا ان ہی کی ذات کو ملتِ اسلامیہ ہند کا سیاسی نجات دہندہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں وہ اتنے مخلص اور سچے تھے کہ کھلے اور چھپے انہوں نے یہ دعا مانگی تھی کہ:

"اے اللہ تو میرے عمر کو گھٹا کر قائداعظم کو عمر طویل عطا فرما!"

(حوالہ: مضمون قائدِ اعظم اور بہادر یار جنگ از ڈاکٹر سیّد معصوم حسلی ترمذی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)

ایک ساگر تھا دوسرا دھرتی، سچ ہی تو ہے کہ:
ساگر اور دھرتی ملتے ہیں تو سرحدیں ایک دوسرے میں گم ہو جاتی ہیں۔

قائدِ ملّت نواب بہادر یار جنگ اور مسلم لیگ

"جب قائد اعظم نے انگلستان سے لوٹ آنے اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ذمہ داری سنبھالنے کا فیصلہ کیا تو چند سر برآوردہ قومی کارکن ان کی قیادت میں کام کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہو گئے، ان کارکنوں میں نواب بہادر یار جنگ ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نواب صاحب کی اندوہناک اور ناوقت موت تک وہ قائد اعظم کے معتمد الیہ اور دستِ راست رہے، نواب صاحب نے اپنے قائد کا اعتماد حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، مسلم عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی خاطر انہوں نے سارے ہندوستان کے دورے کئے اور اپنی بے مثال خطابت سے مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت بنانے کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔"

(حوالہ: مضمون ایک دِلربا شخصیت از سیّد عبدالواحد ص ۲۱۱، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

"بہادر یار جنگ کی جاذب شخصیّت کا ٹھپہ دکن ہی پر نہیں ہندوستان کے طول وعرض اور مسلمانانِ ہند کی اجتماعی زندگی پر اتنا گہرا ہے کہ شاید صدیوں تک نہ مٹ سکے، یوں تو ایک عرصہ قبل برطانوی ہند ان سے متعارف تھا لیکن سیاسی واجتماعی تعلقات کی ابتدا مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ سے ہوئی۔"

(حوالہ: پاکستان کا نقیب از مولوی محمد احمد خاں صاحب)

"قائداعظم مسلم لیگ کو مسلمانوں کی ایک مجموعی جماعت بنانا چاہتے تھے اور عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا بڑے بڑے جلسے منعقد کرنے کی ضرورت تھی، عوام کے پسندیدہ خطیبوں کو پلیٹ فارم پر لانا لازمی تھا، ایسے میں بہادر یار جنگ کی خطابت کی گونج حیدرآباد کی چہار دیواری سے نکل کر ہندوستان کے طول و عرض میں پہونچ چکی تھی، مسلم لیگ کے جلسوں میں بہادر یار جنگ کو تقریروں کے لئے بلایا جانے لگا اور جلد ہی مسلم زعماء نے محسوس کر لیا کہ ان کی خطابت کا جادو عوام کے سر پر چڑھ کر بولتا ہے، اس لئے انکی ضرورت ہر جگہ محسوس کی جانے لگی"۔

(حوالہ: بلبل ہزار داستاں از سیّد بادشاہ حسین، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں ص ۹۷ کراچی)

"اب نواب صاحب قائداعظم کے باقاعدہ ترجمان بن چکے تھے جہاں قائداعظم تشریف لے جاتے نواب صاحب بھی بصد اصرار ضرور لے جائے جاتے اور قائداعظم کی تقریروں کا ترجمہ جس خوبی اور کمال سے کیا جاتا اس سے لوگ بے حد متأثر ہوتے، دو تین سال میں ہندوستان کے ہر گوشے میں ان کا ڈنکا بج گیا، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاسوں کے وقت نواب صاحب تشریف لاتے اور باوجود رکن نہ ہونے کے ان میں شرکت فرماتے"۔

(حوالہ: حیدرآباد کا ٹیپو از عبدالوحید خاں ص ۲۲۲، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، کراچی)

"بہادر یار جنگ نے جیسے ہی مسلم لیگ کے جلسوں میں تقریریں شروع کیں اور جب لیگ کے جلسہ میں پہلی مرتبہ زبان کھولی اسی دن سے

انہوں نے جمیع مسلمانانِ ہند کے قلوب پر قبضہ کرلیا اور پھر تو یہ حال ہوگیا کہ جناح صاحب کی انگریزی تقریر کے اردو ترجمے کے لئے بہادر یار جنگ وقف ہو گئے۔"

(حوالہ : بہادر خاں کی یاد میں از کلیم الدین انصاری ص ۲۷ - مشمولہ بہادر یار جنگ اہل دانش کی نظر میں)

یہ نواب صاحب کی غیر معمولی مساعی اور ذہن رسا کا کارنامہ تھا جس نے برعظیم پاک و ہند کے دس کروڑ مسلمانوں کو اپنی منزل مقصود کو متعین کرنے میں بروقت مدد دی اور قائد اعظم کی رہبری میں ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور کو منظور کروانے میں اسے اپنی فراست سے کامیاب بنایا اپنی مختصر زندگی میں انہوں نے پاکستان اور کل ہند مسلم لیگ کے لئے جو خدمات انجام دیں وہ بے شمار بھی ہیں اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے بے اندازہ بھی، کوئی انسانی کارنامہ دیانت، صداقت اور خلوص نیت کے بغیر دوام اور استقرار حاصل نہیں کرسکتا۔"

(حوالہ : نواب بہادر یار جنگ اور مسلم لیگ، از اے۔ اے قدوائی اخبار جسارت کراچی، مؤرخہ ۲۵ رجون ۱۹۸۶ء)

"ان کے تدبر کا ایک نمونہ ہے، مکدر و کشیدہ فضا میں ان کا سر سکندر سے ملنا اور یہ جانتے ہوئے ملنا کہ سر سکندر ان ہی کو انعقادِ جلسہ کا اصل محرک اور یونینسٹ پارٹی کے کھیل کو بگاڑنے والا تصور کرتے ہیں، کیا ان کی صفائی باطن کی دلیل نہیں ہے؟ روٹھے ہوئے سکندر کو منالینا اور اس کو اجلاس عام میں لے آنا ان کی من موہنی شخصیت اور بے پناہ جرأت کا اثر ہی تو تھا؟ قرار داد پاکستان کے سلسلہ میں ان کی پس پردہ کوششیں "خاصان لیگ" میں سے کسی کو خاموش کرا دینا اور کسی کو ہمنوا بنالینا اگر ان کی ساحری تھی تو عامۃ المسلمین کے دلوں میں اس قرار داد کے مفہوم و منشا کو

اتار دینا یقیناً معجز بیانی تھی!! پھر اس قرار داد پر ان کا ایمان و ایقان، ملّتِ اسلامیہ ہند کے حقیقی نصب العین سے بے پناہ وفاداری کا جیتا جاگتا ثبوت ہے!!! ــــــــــ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ ہی کہئے کہ اگر بہادر یار جنگ نہ ہوتے تو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کیا لاہور میں منعقد ہو جاتا؟ اور اگر ہو بھی جاتا تو کیا کامیاب ہوتا؟ بہادر یار جنگ کی شخصیت دلکش تھی، دلکش تر ان کی ذہنی صلاحیتیں تھیں اور دلکش ترین ان کی روح تھی ــــــ!"

(حوالہ: مسلم لیگ کا اجلاس لاہور، از مولوی محمد احمد خاں صاحب ص ۵۹ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، کراچی)

"یہ وابستگی بھی بلا سوچے سمجھے نہ تھی، فرماتے ہیں کہ مسلم لیگ سے میری وابستگی اس لئے ہے کہ غیر شعوری طور پر اس کا قائد اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جو میری منزلِ مقصود ہے، وہ مسلمانوں کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاج نبوّت پر فائز دیکھنا چاہتے تھے، وہ اس بات پر خوش تھے کہ لیگ کے پلیٹ فارم سے اللہ نے ان کی زبان سے یہ اعلان کروایا تھا کہ پاکستان کا دستور، الٰہی دستور اور وہاں کی حکومت قرآنی حکومت ہوگی، وہ اپنے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ: "جب میں دورانِ تقریر اس مقام پر پہنچا تو قائد اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے مکا مار کر فرمایا "تم بالکل دُرست کہتے ہو"! اور میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ قائد اعظم سے میرے قول پر سندِ تصدیق مِل گئی"۔ راستے کی مشکلات سے بے پروا، حق و صداقت میں بے باک، ایمان کے خلوص سے دل گداختہ لئے، زبان کی پوری پوری حلاوت اور شیرینی کے ساتھ نواب مرحوم نے دلوں کو فتح کیا اور پاکستان کو خواب و خیال

کی منزل سے نکال کر ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا"۔
(حوالہ: کراچی سیشن از صمدانی نقوی ص ۱۹۲، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

"آخر زمانہ میں بہادر یار جنگ مسلم لیگ میں تلقین حق کے لئے ایک فرشتہ بن گئے تھے، بہادر یار جنگ ایک ریاست کے باشندے تھے اور مسلم لیگ کے دستور کی رو سے اس کے باضابطہ رکن نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ضابطہ کا اجلاس ختم ہونے اور صدر کی اختتامی تقریر کے بعد ان کی تقریر رکھی جاتی تھی اور اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ محض ان کی تقریر سننے کے لئے ہزاروں آدمی دُور دُور سے جمع ہوتے تھے اور تقریر چوں کہ اجلاس کے آخر میں رکھی جاتی تھی اس لئے مجمع آخر تک سکون کے ساتھ جلسہ میں موجود رہتا تھا اور بہادر یار جنگ کی تقریر کو اجلاس کا ماحصل سمجھ کر منتظر ہوتا تھا، ان کے ذمہ قائد اعظم کی جانب سے یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ اپنی اس آخری تقریر میں وہ حاضرین کو مسلم لیگ کے اجلاس میں منظور شدہ قرار دادوں کا اصلی مفہوم سمجھائیں اور ان قرار دادوں پر عمل کی تلقین کریں۔

۱۹۴۳ء میں کراچی کا آخری اجلاس تھا جس میں انہوں نے شرکت کی تھی اور تقریر کی تھی"۔
(حوالہ: برطانوی ہند میں بہادر یار جنگ کی آخری تلقین حق، مشمولہ رسالہ اطلاعات کراچی جلد ۲، یکم جولائی ۵۶ء)

"مسلم لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سننے میں آتی (سننا اس لئے کہ شرکت کا اتفاق بطور تماشائی کے بھی ابھی تک نہیں ہوا) دل کو یہی اطمینان رہتا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرا کے رہے گی"۔

(حوالہ: قائد ملت از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۳۰، ۳۱۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

شمالی مغربی سرحدی صوبے میں عام انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں، اس صوبے میں خاں عبدالغفار خان کی کانگریس دوست تنظیم خدائی خدمت گار" کا بڑا اثر و رسوخ تھا، مسلم لیگ کے لئے وہاں کے انتخابات غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے، قائداعظم بہت فکر مند تھے۔ قائداعظم کو خوب اندازہ تھا کہ سرحد کے غیور پٹھانوں کو مسلم لیگ کا ہمنوا بنانے میں بہادر یار جنگ کتنے مفید ثابت ہو سکتے ہیں، ان دنوں قائد ملت کی "زبان بندی" کا دور تھا، قائداعظم نے والی ریاست میر عثمان علی خاں سے سرحد میں قائد ملت کی تقریروں کے سلسلے میں اجازت حاصل کی اور نواب صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کے وفد میں شامل مولانا کرم علی، قاضی محمد عیسیٰ وغیرہ کے ساتھ ۳ ہفتوں کے دورے پر ۱۴ فروری ۱۹۴۱ء کو روانہ ہوئے، نواب صاحب کی صوبہ سرحد کو روانگی کی اطلاع جو اخبارات میں شائع ہوئی اس کا اہم جزیہ جملہ ہے کہ: قائد ملت کے متعلق مسٹر جناح کو یقین ہے کہ وہ بہت جلد عوام سے اپنا ذاتی ربط قائم کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، اس طرح سرحد سمٹ کر مسلم لیگ کی آغوش میں آجائے گا، حیدرآباد سے روانگی کی اطلاع رہبر دکن میں شائع ہوئی۔

قائد ملّت کی روانگی

حیدرآباد ۱۳۔ فروری۔ قائد ملّت نواب بہادر یار جنگ بہادر بعزم سرحد آج شام کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوئے، یہاں آپ قائداعظم مسٹر محمد علی جناح سے ملاقات فرمائیں گے، آپ کی روانگی کا مقصد سرحد

میں جس پر کانگریس کا قبضہ ہے، قائداعظم کے حکم کی تعمیل میں مسلم لیگ کی تبلیغ و تنظیم ہے، مسلم لیگ جماعتوں سے عوام کا تعلق پیدا کرنا اور مسلم لیگ کی اکثریت کا قائم کرنا قائداعظم کے لئے گذشتہ چار سال سے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا رہا قائد ملت کے متعلق مسٹر جناح کو یقین ہے کہ وہ بہت جلد عوام سے اپنا ذاتی ربط قائم کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں اس طرح سرحد سمٹ کر مسلم لیگ کی آغوش میں آجائے گا، آپ کے دورہ کی مدت کسی طرح تین ہفتہ سے متجاوز نہ ہوگی، نواب صاحب کو خدا حافظ کہنے کے لئے کثیر تعداد میں مسلمان اسٹیشن پر جمع ہوئے تھے۔ عقیدتمندوں نے بکثرت پھولوں کے ہار پہنائے، ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہوتے وقت پورے مجمع نے بہ یک زبان "اتحاد المسلمین" زندہ باد اور نواب بہادر یار جنگ بہادر زندہ باد" کے نعرے لگائے۔

(حوالہ: روزنامہ رہبر دکن، حیدرآباد دکن، ۱۴؍فروردی ۱۳۵۰ف مطابق ۱۵؍فبروری ۱۹۴۱ء شنبہ)

قائدِ ملت حیدرآباد ۱۹؍امرداد۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر بعزم بلوچستان کل رات ۸ بجے کی گاڑی سے لاہور روانہ ہوئے، لاہور میں دو روز کے قیام کے بعد آپ بلوچستان کے لئے نکل جائیں گے۔

(حوالہ: روزنامہ رہبر دکن، حیدرآباد دکن، ۲۰؍امرداد ۱۳۵۱ف مطابق ۲۵؍جون ۱۹۴۲ء پنجشنبہ)

بہادر یار جنگ کا دَورہ صوبہ سَرحد

صوبہ سرحد میں بہادر یار جنگ کے دورے نے وار دھا کے فسوں کو کافور کر دیا اور وہ صوبہ جو کانگریس کا گڑھ تھا، مسلم لیگ کا پاسبان

ونگہبان بن گیا۔

صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار خاں کا طوطی بول رہا تھا اور خاں برادران نے علی الاعلان کہدیا تھا کہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی قبر بنائی جائے گی۔ سحر سامری کو توڑنے کے لئے قائد اعظم کی نظر انتخاب بہادر یار جنگ پر پڑی۔ بہادر یار جنگ دیوانہ وار صوبہ سرحد کی طرف روانہ ہوئے، ان دنوں صوبہ سرحد کی سڑکوں پر سفر کرنا موت کو دعوت دینا تھا، فقیر ایپی کی خطرناک سرگرمیاں زوروں پر تھیں، سردار اورنگ زیب خاں، قاضی محمد عیسیٰ اور بہادر یار جنگ دورے پر روانہ ہوتے ہیں، قاضی محمد عیسیٰ کار چلا رہے ہیں، فقیر ایپی کے حملے کے اصول کے مطابق موٹر ڈرائیور پہلا شکار ہوتا تھا، نواب بہادر یار جنگ کو قاضی عیسیٰ کی زندگی بہت عزیز ہے وہ انہیں خود ہٹا کر اسٹیرنگ سنبھال لیتے ہیں، سفر جاری تھا کہ چٹانوں کے پیچھے سے ایک رائفل بردار قبائلی نمودار ہوتا ہے، موٹر روک کر پوچھتا ہے کہ آپ میں بہادر یار جنگ کون ہے؟ نواب صاحب اپنی طرف اشارہ کرتے ہیں، وہ ان سے تنہائی میں گفتگو کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ سردار اورنگ زیب خاں اور قاضی محمد عیسیٰ بہادر یار جنگ کو کار سے اترنے سے منع کرتے ہیں مگر یہ شیر دل مجاہد کار سے اُتر کر قبائلی کے ساتھ چل پڑتا ہے، تنہائی میں لے جاکر قبائلی انہیں فقیر ایپی کا پیغام سناتا ہے کہ "فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں آپ کی آمد کی اطلاع تھی اس لئے آپ کے بحفاظت سفر کے انتظامات کر دیئے گئے ہیں، آپ جہاں جہاں جانا چاہیں ہمیں بتلا دیجئے کہ ہم وہاں بھی حفاظتی انتظامات کر دیں۔"

کیا سحر تھا اور کیا اعجاز تھا کہ جان کے دشمن بھی جان نثاری پر آمادہ ہو گئے، نواب صاحب نے اپنی شعلہ آشام تقریروں سے صوبہ سرحد کے غیور پٹھانوں کی غیرت کو جگایا اور ان کی کوششوں کی بدولت صوبہ سرحد کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

(حوالہ : ۲۳۰، ۲۳۱ مضمون بعنوان دیوانہ کوئے محبت از عبدالہادی صدیقی بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، کراچی)

مسلم لیگ کے بنیادوں کو صوبہ سرحد میں استوار کرنے کے لئے تین دیگر زعماء کے ساتھ قائداعظم نے بہادر خاں کو روانہ کیا، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، بہادر خاں نے سرحدی پٹھانوں کے دماغوں سے واردھا کے فسون عدم تشدد کو اتارا اور اپنے ڈیڑھ ماہ کے مسلسل دوروں میں انہیں تحریک پاکستان کا پُرجوش علمبردار بنایا۔

(حوالہ: تازہ بہ تازہ نوبہ نو از میاں بشیر احمد ص ۱۰۴ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

۱۹۴۱ء میں نواب بہادر یار جنگ نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور ہمارے ساتھ ڈیرہ اسماعیل خاں، بنوں، کوہاٹ، مردان اور ایبٹ آباد گئے جہاں انہوں نے بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کیا، ہر جلسے میں ان کی شانِ خطابت کے نئے جوہر آشکار ہوتے تھے، پشاور میں آج بھی بہت سے لوگ موجود ہیں جن کے دل نواب صاحب کی تقریروں کی یاد سے گرما جاتے ہیں۔ نواب صاحب کی تقریروں نے صوبہ سرحد میں حصولِ پاکستان کی جدوجہد کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے میں اہم کردار انجام دیا۔ ـــــــــــ صوبہ سرحد میں نواب صاحب کا قیام دس دن رہا اور دس دنوں نے یہاں کے عوام کے دلوں پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

(حوالہ : مضمون بے مثال مقرر از میاں ضیاءالدین بیرسٹر ص ۱۹۹۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

"یوں تو بہادر یار جنگ کے ساتھ ہفتوں حیدرآباد میں ایک ساتھ رہ کر شبانہ روز دیکھا تھا، لیکن اس دورے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ

بہادر یار جنگ کی تقاریر نے ایک نئی کیفیت پیدا کردی۔

ہم لوگ سرحد سے واپسی پر سیدھے قائداعظم کی خدمت میں آئے۔ نواب بہادر یار جنگ نے ساری رودادِ سفر پیش کی، مسٹر جناح اس سفر کے نتائج سے بے حد خوش ہوئے۔"

(حوالہ: مولانا عبدالحامد بدایونی، مضمون مشمولہ آہنگ حیدرآباد دکن ۱۲ رمئی ۱۹۵۷ء)

"نواب صاحب نے مسلم لیگ کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ مسلم لیگ کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔"

(حوالہ: مولانا عبدالحامد بدایونی، مشمولہ روزنامہ مشرق کراچی ۲۶ رجون ۱۹۶۸ء)

مسلم ہندوستان نے یقیناً ایک دلیر انسان کو حاصل کرلیا تھا اور ایک انمول ہیرے کو پالیا تھا، قائداعظم کا یہ "نواب بہادر" مسلم لیگ کی فوج کا ایک سرفروش مجاہد، پاکستان کا نقیب اور قائداعظم کا "دستِ راست اور رفیق کار" تھا۔

(حوالہ: تازہ بہ تازہ نو بہ نو از میاں بشیر احمد ص ۱۰۴، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ

دسمبر ۱۹۳۸ء

آل انڈیا مسلم لیگ کا پٹنہ سیشن مسلم لیگ کا پہلا تاریخی نوعیت کا اجلاس تھا۔ قطع نظر اور امور کے اس اجلاس کی دو باتیں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں

(۱) پٹنہ کے اجلاس نے مسٹر جناح کو قائد اعظم بنا دیا۔

(۲) نواب بہادر یار جنگ کو پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے اجلاس کو مخاطب کرنے کا موقعہ ملا اور وہ اسی دن سے آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔

اگرچہ مسٹر جناح کیلئے "قائد اعظم" کے الفاظ کسی صحافی نے اپنے اخبار میں قلمبند کئے تھے لیکن پٹنہ سیشن میں عزیز ملت سید عبد العزیز نے سب سے پہلی دفعہ بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ مسٹر جناح کو قائد اعظم کے الفاظ سے مخاطب کیا تو ان الفاظ کو پر لگ گئے اور پھر مسٹر جناح دمِ آخر تک قائد اعظم ہی کے نام سے پکارے جاتے رہے۔

نواب بہادر یار جنگ پہلی دفعہ مسلم لیگی رہنماؤں اور کارکنوں سے اس اجلاس کے ذریعے متعارف ہوئے مگر نواب بہادر یار جنگ، محمد علی جناح کی نگاہوں میں (اس وقت تک) معزز اور قابل قدر ہو چکے تھے، آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ عزیز ملت سر عبد العزیز کی محنت و توجہ سے

تاریخی اجلاس بنا، نواب بہادر یار جنگ پہلی بار مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے، اسی زمانہ سے شاید ہی کوئی کوئی مہینہ ایسا ہوتا جو مسٹر جناح سے مل کر وہ اہم مسائل سیاسی پر تبادلہ خیال نہ کرتے، نواب بہادر یار جنگ کی قابلیت اور جامعیت کا اثر مسٹر جناح پر بھی گہرا ہوا، اور اب وہ وقت بھی آگیا کہ ہر ایک ریاست کا باشندہ باوجود مسلم لیگ کا رکن نہ ہونے کے آل انڈیا مسلم لیگ کی رونق محفل بن گیا کوئی اجلاس ایسا نہ ہوتا جس میں مسٹر جناح نواب بہادر یار جنگ کو مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر کے لئے پیش نہ فرماتے۔

لاہور، دہلی، الہ آباد، کراچی کے اجلاس میں نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر نے مسلم ہندوستان کے قلوب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، دکن کا فرزند پورے ہندوستان کا محبوب بن گیا۔"

(حوالہ: قائد ملت از مولانا عبدالحامد بدایونی، ہفتہ وار آہنگ حیدرآباد ۱۲ر مئی ۱۹۵۷ء)

آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ سیشن کا سہ روزہ اجلاس جب ختم ہوا تو چوتھے دن اسی پنڈال میں وزیراعلیٰ سرحد جناب اورنگ زیب خاں کی صدارت میں اجلاس منعقد ہوا۔

"یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کشیدگی آخری حد تک پہنچ چکی تھی، کانگریس جماعتی مطلق العنانی (پارٹی ڈکٹیٹرشپ) کے نشے میں مخمور اور سات صوبوں میں اپنی وزارتوں کی طاقت سے مسحور و مغرور ہو کر مسلم سیاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی، ایک طرف مسلم تمدن، زبان اور مذہب کو ہندوستانی قومیت میں ضم کرنے کی غرض سے واردھا اسکیم کا نفاذ ہو چکا تھا، یوپی، سی پی، اور بہار میں مسلمانوں پر بے حد مظالم توڑے جا رہے تھے تاکہ وہ ہندو امپریلزم سے مرعوب و خوفزدہ ہو کر خود کو کانگریس

کے حوالے کردیں، سرکاری اسکولوں میں مہاتما گاندھی کی تصویر کی پوجا اور بندے ماترم کا گیت لازمی کر دیا گیا تھا، مہاتما جی نے اُردو زبان کو ختم کرنے کے لئے ہندی ساہتیہ پریشد کی بنیاد ڈال دی تھی اسی زمانے میں مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کے مشوروں سے حیدرآباد دکن میں ہندو مہاسبھا نے حکومتِ نظام کے خلاف عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی تھی جس میں دس ہزار سے زیادہ ہندو قید ہو چکے تھے، ———— دوسری طرف حکومت برطانیہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی فیڈرل اسکیم کو نافذ کرنے پر مصر تھی اور مسلم لیگ کو کسی طرح منظور کرنے پر تیار نہ تھی، یہی وہ زمانہ تھا جبکہ فلسطین میں امریکہ اور برطانیہ کی یہود نواز پالیسی کے خلاف مسلم لیگ اپنی صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی اور اپنا ایک ڈیلیگیشن چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمٰن صدیقی پر مشتمل باہر بھیج چکی تھی

غرضیکہ اس پس منظر میں پٹنہ کا اجلاس ہوا جس میں شرکت کی غرض سے ہندوستان کے ہر حصے کے مسلمان آئے، کسی طرح اجلاس میں شریک ہونے والے افراد کی تعداد دو لاکھ سے کم نہ تھی، تمام فضا جوش و خروش سے پُر تھی ارادوں اور ولولوں سے معمور تھی، نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے اس اجتماع کو غنیمت سمجھتے ہوئے طے کیا کہ حیدرآباد میں جو سازشیں ہندو لیڈر کر رہے ہیں اور وہاں کی حکومت کے متزلزل ہونے کا کافی خطرہ ہے، ان سے مسلم لیگ کے لیڈروں اور مسلم عوام کو باخبر کر دیں اور اس طرح مسلم ہندوستان کی ہمدردی حاصل کریں

پٹنہ میں بہادر یار جنگ کی موجودگی کا بہت کم لوگوں کو علم ہوا کیوں کہ اس وقت تک وہ کافی غیر معروف تھے، ان کے متعلق صرف اتنا سنا تھا کہ اچھے مقرر ہیں، اتحاد المسلمین کے صدر اور خاکسار جماعت کے رکن ہیں، حیدرآباد کے جاگیردار اور وہاں کے مقامی سیاسی کارکن ہیں اس لئے پٹنہ کے جلسۂ عام میں جو مسلم لیگ کے پنڈال میں اس وقت منعقد ہوا جب مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس عبدالعزیز صاحب بیرسٹر کی کوٹھی پر ہو رہا تھا، شرکار کی تعداد زیادہ

اجلاس ختم ہونے سے ایک روز قبل سر سلیمان مرحوم کے داماد چودھری اختر حسین صاحب (جو لکھنؤ میں ایک کامیاب وکیل اور لیجسلیٹو کونسل یوپی کے رکن تھے) کی طرف سے ارکان کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کو چائے کی دعوت کا پیام ملا جو بہادر یار جنگ مرحوم کے اعزاز میں تھی، "مجھے جاگیرداری نظام، رؤسا اور نوابوں سے دلی نفرت تھی، اس زمانے میں عام طور پر جاگیرداروں اور نوابوں کی آزادی ملک کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا تھا، غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات نے اپنے ملک کے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے خلاف بھی کافی نفرت پیدا کر دی تھی، عوام اس طبقے سے سب سے زیادہ بیزار اور نالاں تھے، میں بھی فطری طور سے ان جذبات سے متأثر تھا اور حیدرآباد کے ایک جاگیردار سے ملاقات کرنا تضیع اوقات اور ان سے تعارف و تقرب کو فعل عبث سمجھتا تھا، چنانچہ جب میں عصرانے میں گیا تو نہایت بے اعتنائی اور لاپرواہی کیساتھ مہمان خصوصی سے بہت دور جا کر بیٹھا اور میز کے ساتھیوں سے گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں موصوف کا تعارف کراتے ہوئے میزبان نے ان سے فرمائش کی کہ وہ حیدرآباد کے حالات سے ارکان کونسل کو آگاہ کریں، چشم زدن میں ایک دراز قامت شخص شکیل و وجیہہ، حیدرآبادی خاص شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس نظروں کے سامنے آگیا، یہی بہادر یار جنگ تھے، ان کے کھڑے ہونے کا انداز اور اپنے سامعین پر مسکراہٹ آمیز نظریں ڈالنے کا طریقہ عام انسانوں سے بالکل مختلف تھا، ان کی شکل میں نہ لکھنوی نزاکت کی بو تھی نہ ان کے انداز میں حیدرآبادی ریاست کی خو، ان کی آنکھیں اندرونی بے پناہ قوتِ ارادی کا پتہ دیتی تھیں اور ان کے تیور ایک مؤمنانہ عزم اور فاتحانہ کردار کے آئینہ دار تھے، ابھی انہوں نے ایک

لفظ بھی نہ کہا تھا کہ ان کے انداز نگاہ ہی نے میرے دل کے تمام وسوسے اور ذہن کے تمام تعصبات شیشے کی طرح چکنا چور کر دیئے، میں سنبھل کر بیٹھا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ شخص کوئی نواب نہیں بلکہ مجاہد معلوم ہوتا ہے، چند لمحات میں پھولوں کی بارش شروع ہوگئی، ان کے بولنے کا طرز، دیکھنے کا انداز، الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ساخت، مضامین کی ترکیب و تنظیم فضا میں ان کی انگشت شہادت کی گردش خیالات کی روانی، افکار کا تسلسل یہ سب باتیں میرے لئے بالکل نئی اور اچھوتی تھیں، ہر شخص ان کے خیالات کی زنجیروں میں بندھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے مولانا آزاد کو بولتے سنا تھا، ان کی چھپی ہوئی تقریروں کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا، مولانا احمد سعید اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی طویل اور دلآویز تقریریں متعدد مرتبہ سنی تھیں، ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے رنگ میں عمدہ مقرر اور بلند پایہ خطیب ہے، لیکن اس روز بات ہی کچھ اور تھی، اسماعیل شہید اور جمال الدین افغانی کی معجز نما تقریروں اور مجاہدانہ خطبات کے تذکرے کتابوں میں پڑھے تھے، معلوم ہوتا تھا انہی تاریخی خطبات کو پڑھنے وہ خود زمین پر اُتر آئے ہیں، آپ نے نہایت جامع اور تفصیلی طور سے حیدر آباد کا سیاسی پس منظر وہاں کی حکومت کی مفاد عامہ کے لئے کارگذاریاں اور ہندو لیڈروں کی ریشہ دوانیوں پر روشنی ڈالی اور نہایت غیر مبہم الفاظ میں یہ بھی بتا دیا کہ خود انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کو اس طرح منظم کر دیا ہے کہ انگریز اور ہندو ملکر بھی ان کو شکست نہیں دے سکتے۔

تقریر ختم ہوئی تو میرا عجیب حال تھا، اب وہ بے اعتنائی باقی نہ تھی ان سے ملنے اور تعارف حاصل کرنے کی تمنا دل میں کروٹ لینے لگی۔ سب لوگ باری باری ان سے مصافحہ کرنے لگے، ایک مصنف کا سب سے بڑا ذریعہ تعارف اس کی کتاب ہوتی ہے، وہ بہ زعم خود اس کو ایک بڑا حربہ سمجھتا ہے کہ جس سے متعارف ہونا ہو اپنی تصنیف کا ایک نسخہ اس کو

دے دے تاکہ اسے خود ہی معلوم ہو جائے کہ ملنے والا شخص ایک مؤلف ہے، یہ آسان نسخہ میرے ذہن میں بھی آیا اور فوراً اپنی تازہ تصنیف "مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ" جس کا دوسرا ایڈیشن صرف دو تین ماہ قبل نکلا تھا ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا، آپ نے میرے ہاتھ سے کتاب لے کر سرورق پر نظر ڈالی اور پھر میری طرف مسکراہٹ آمیز لہجے میں دیکھ کر فرمایا :-

"یہ کتاب نہ صرف میرے پاس ہے بلکہ اتحاد المسلمین کی ہر شاخ میں لازمی طور سے ایک نسخہ رکھنے کا حکم دے چکا ہوں، لیکن مصنف کے ہاتھ سے کتاب حاصل کرنے کا لطف کچھ اور ہی ہے، بہت شکریہ۔"

اس مختصر تقریب کے بعد ہر جگہ ان کے دلنشیں انداز تقریر کا ذکر تھا، ہر شخص جو ان سے ملتا اس نعمت کے ہاتھ آجانے پر خدا کا شکر ادا کرتا۔"

(حوالہ : وہ نواب نہیں مجاہد تھا، از مولوی عبدالوحید خاں اخبار مشرق کراچی ۲۵ رجون ۱۹۷۹ء)

میاں ضیاء الدین بیرسٹر بھی سرحد مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے صوبائی وفد کے ساتھ شریک اجلاس تھے اور پہلی مرتبہ قائد ملت سے ملنے اور ان کی تقریر سننے کا انہیں موقعہ ملا، وہ اس تاریخی جلسے کی روئیداد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"حصول پاکستان کی جدو جہد کرنے والے قائدین کی فہرست میں نواب بہادر یار جنگ کا نام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے، مجھے پہلی مرتبہ نواب بہادر یار جنگ سے مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں ملاقات کا موقعہ ملا اجلاس ۱۹۳۸ء میں منعقد ہوا تھا، سرحد مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے صوبائی وفد کے ساتھ پٹنہ گیا تھا، اجلاس میں نواب صاحب نے بڑی مؤثر تقریر کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا

بڑے ہی دلنشیں انداز میں تجزیہ پیش کیا اور خاص طور پر جنوبی ہند اور ریاست حیدر آباد کے مسلمانوں کے مسائل سے بڑی سیر حاصل بحث کی"

(حوالہ بے مثال مقرر، از میاں ضیاء الدین بیرسٹر ص ۱۹۷، بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں بھی شریک اجلاس تھے، انہوں نے بھی پہلی بار نواب صاحب کو دیکھا اور سنا، وہ اپنے تاثرات میں تحریر فرماتے ہیں:

عصرانے کے بعد نواب بہادر یار جنگ نے تقریر فرمائی، میں اس زمانے میں سیاسیات اور مسلم سیاسیات سے کچھ اس درجہ بے بہرہ تھا کہ نہ میں نے کبھی نواب مرحوم کا نام سنا تھا نہ صورت دیکھی تھی۔ میں نے ان کی تقریر سنی، جیسے جیسے الفاظ زبان سے نکلتے جاتے تھے ویسے ویسے میری دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ میں اپنے آپ کو ان کی سحر خطابت سے محسور پانے لگا، میں مدہوش ہوگیا، یہ عظیم المرتبت ہستی آخر کون تھی، مجھ جیسے میدان سیاست کے اجنبی کے لئے کیا یہ امر باعث عزت و توقیر نہ ہوگا، اگر میرا ان سے تعارف کرایا جائے اور ملاقات کی سعادت حاصل کروں۔ میری بے چینی بڑھتی گئی، میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی، جب نواب صاحب بے ساختہ آگے بڑھے اور مجھے یہ کہتے ہوئے گلے لگالیا کہ وہ ہمایوں کے ذریعہ مجھ سے ایک عرصہ دراز سے واقف تھے، تقریر کے بعد میں نے ہزاروں اشخاص کو دیکھا جن کی زبان پر اسی تقریر کا چرچہ ہے اور دل جذبات عقیدت سے معمور تھے۔

اس کے بعد لوگ بے چینی سے مسلم لیگ کی میقات کے منتظر رہتے تھے تاکہ نواب بہادر یار جنگ کی تقریر سن سکیں، اس وقت تک بظاہر ان کا لیگ سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن سچ پوچھئے تو وہی لیگ کے روحِ رواں تھے۔

ریاستی مُسلم لیگ

۱۹۳۹ء

قائد ملت نے ریاستی مسلمانوں کے حال زار سے آگاہی کے بعد یہ ضروری سمجھا کہ ریاستی مسلمانوں کے دَرد کا درماں ہو۔ سب سے پہلے قائدِ اعظم سے اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی اور ان کی تائید و حمایت کے یقین کے بعد اس خصوص میں ریاستی مسلمانوں کے اکابرین، وہاں کی مسلم جماعتوں کے رہنماؤں سے اس خصوص میں ضروری مواد جمع کیا۔ مسلم پریس کو سب سے پہلے متحرک کیا، نواب صاحب اس وقت تک اپنی اعلیٰ خطیبانہ صلاحیتوں اور مسلم لیگ اور مسلمانانِ دکن کے قائد کی حیثیت سے اقطاعِ ہند میں کسی تعارف کے محتاج نہیں تھے، مسلم لیگ اور میلاد النبی کے جلسوں کے سِلسلے میں آپ نے مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالت کا بچشم خود مشاہدہ فرمایا تھا، اس خصوص میں مسلم اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے سب سے پہلے آپ نے معاونت چاہی، روز نامہ آزاد کے مدیر کے نام اس مسئلہ میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:——————

حیدرآباد　　　　　　　　مؤرخہ ۹ ستمبر ۳۹ء

میرے عزیز برادر دینی!

اس خط کی ترسیل سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کے مسلمان رعایا کی بیداری و تنظیم کے لئے انڈین اسٹیٹس مسلم کانفرنس کے قیام کی جانب آپ کی توجہ مبذول کروں، انڈین اسٹیٹس پریس کانفرنس

کی موجودگی میں ایسے مرکزی نظام کی ضرورت اس لئے محسوس کی جارہی ہے کہ اولاً مسلمانوں کو کانگریسی پرجا منڈل اور پرجا پریشد کے چنگل سے بچایا جائے۔ ثانیاً مسلمانوں کی موجودہ حیثیت و موقف کی حفاظت کی جائے، ثالثاً مسلمانوں کے لئے معاشری، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی حقوق حاصل کئے جائیں۔

علاوہ بریں انڈین اسٹیٹس مسلم کانفرنس چوں کہ مسلم لیگ کی ایک ملحقہ جماعت ہوگی۔ اس لئے اس کے قیام سے ہمیں اپنے مستقل قومی وجود کو برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔

وقت آگیا ہے کہ ہم کمر ہمت باندھ کر ان ہندوستانی ریاستوں کے مسلمانوں کو مصائب سے بچائیں جہاں ان پر سیاسی غلامی مسلط ہوچکی ہے، ان کو اقتصادی اعتبار سے پامال کیا جارہا ہے اور ان کا تمدن خطرہ میں ہے، اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد کی جائے گی اور اس سے پیشتر پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعہ پُرزور پروپگنڈے کی ضرورت ہے، مسلمانوں میں تنظیم کے ابتدائی کام کو فوراً وسیع پیمانہ پر شروع کردینا چاہیئے، تھوڑے عرصہ کے بعد مسلم لیگ کے وفد کی طرح ہندوستانی ریاستوں میں مسلمانوں کی حالت کا معائنہ کرنے کے لئے انڈین اسٹیٹس مسلم کانفرنس کا ایک وفد مقرر کیا جائے گا۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پیش نظر مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے اپنا اثر ورسوخ صرف کیجئے۔ براہ کرم ایسے افراد اور جماعتوں سے مطلع فرمائیے جنہیں اس مسئلہ سے دلچسپی ہو اور اپنے حلقہ میں رفقاء واحباب میں گرم جوشی کا بلاک قائم کیجئے۔

آپ کا بھائی

بہادر یار جنگ

(موسومہ سردار علی صابری مدیر روزنامہ آزاد، ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء)

ساتھ ہی نواب صاحب نے مختلف ریاستی مسلم اکابرین سے حسبِ ذیل سوالات کے ذریعے مطلوبہ مواد طلب فرمایا:۔

(۱) اگر ریاست میں کوئی اسمبلی ہے تو اس میں مسلمانوں کی کتنی نشستیں محفوظ ہیں یا عملاً کتنے مسلمان ارکان ہیں۔

(۲) سرکاری ملازمتوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ بتائیں کہ وزارتوں، سکریٹریٹ اور ہر ایک سر رشتے میں ہندو مسلم ملازمین کا کیا تناسب ہے۔

(۳) مسلمانوں کی مذہبی آزادی متاثر تو نہیں ہو رہی ہے اور ان پر خاص قسم کے کوئی قیود تو عائد نہیں ہیں۔

(۴) ہندوؤں کے ساتھ خاص قسم کے مراعات کیا ہیں۔ مثلاً ان کے مذہبی رسوم کے لئے بجٹ میں خاص گنجائش، ان کے مذہبی رسوم کی ادائی میں خاص سہولتیں، ان کے منادر اور معابد کو خاص قسم کی معاشیں جو مسلمانوں کے ساتھ مرعی نہ ہوں۔

(۵) اس سلسلہ میں ریاست کی کل آبادی، اس میں مسلمانوں کا تناسب، مسلمانوں کی عام مالی حالت، ان کا عام پیشہ اور ان میں کسی قسم کی قومی بیداری اور احساس کی نسبت عام معلومات بھی اگر حاصل ہو جائیں تو باعثِ تشکر ہوگا۔

اس کے بعد ریاستی مسلم لیگ کے قیام کا رسمی اعلان کر دیا گیا، سارے ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں اس اعلان نے ریاستی مسلم رعایا کی کمر ہمت باندھی اور ریاستی مسلم لیگ کا پہلا شاندار اجلاس، مسلم لیگ لاہور کے پنڈال میں ۲۳ رمارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں سردار محمد اورنگ زیب خاں قائد حزب اختلاف مجلس قانونی سرحدی کی صدارت میں ہوا۔ حیدرآباد، میسور، کوچین، ٹراونکور، ریاست ہائے کاٹھیاوار، بڑودہ، بھوپال، اندور، گوالیار، دیواس، الور، پٹیالہ، کشمیر، قلات اور سرحدی ریاستوں کے مندوبین شریک اجلاس ہوئے۔ اس اجلاس میں لیگ کا دستور مرتب و منظور ہوا، اور نواب بہادر یار جنگ

کو بالاتفاق صدر منتخب کیا گیا۔ اس موقعہ پر نواب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"گول میز کانفرنس سے قبل کانگریس اور لیگ کی سرگرمیاں صرف برطانوی ہند تک محدود تھیں، لیکن اس کے بعد کانگریس نے اپنی پالیسی بدل دی اور اپنی سرگرمیوں کو ریاستوں میں بھی پھیلا دیا، اس کوشش میں کانگریسی لیڈروں میں اس کے علاوہ کوئی اور محرک کارفرما نہیں تھا کہ ریاستی سیاسیات میں اثر حاصل کیا جائے تاکہ وفاقی اسمبلی میں اس کے موقف کی صیانت ہو جائے جس میں قانون بابت ۱۹۳۵ء کے تحت ریاستی نمائندوں کی شرکت کی بھی تجویز تھی۔

کل ہند اسٹیٹس مسلم لیگ نے ایک ہنگامی دستور مرتب کیا ہے جس کے بموجب ریاستوں کو تین حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اولاً ہمالیاتی حلقہ جس میں شمالی مغربی سرحد صوبہ پنجاب، صوبہ متحدہ اور بنگال کی ریاستیں شامل ہیں، ثانیاً بندھیاچل کا حلقہ جس میں وسطیٰ ہند اور کاٹھیاواڑ کی ریاستیں شامل ہیں اور تیسرے حلقے میں حیدرآباد، میسور اور صوبہ جات بمبئی و مدراس کی ریاستیں شامل ہیں، کل ہند اسٹیٹس مسلم لیگ کو اس کے ساتھ الحاق کی اجازت دی جائے اور ریاستوں کے متعلق پالیسی اور دستور مرتب کیا جائے۔ (حوالہ: بہادر یار جنگ کی سیاسی تقاریر ص ۴۴۵، ۴۴۶ - مرتبہ نذیرالدین احمد)

ابتداء میں بھوپال میں اور بعد ازاں ناگپور میں آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کا باقاعدہ دفتر قائم کر دیا گیا۔ مولوی محمود الحسن جنرل سکریٹری مقرر کئے گئے۔ اسٹیٹ مسلم لیگ کے ناگپور میں دفتر کے قیام کے باعث مولوی محمود الحسن نے ناگپور میں سکونت اختیار فرمائی۔

قائد ملت کی ایماء پر مسلم لیگ کے اجلاس کے ساتھ اسٹیٹ مسلم لیگ

کے شاندار اجلاس بھی دو دن دو نشستوں پر مشتمل منعقد ہوئے، مندوبین کی رہائش کا علیٰحدہ انتظام ہوتا۔

پہلا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا، دوسرا اجلاس مدراس میں اور تیسرا اجلاس الٰہ آباد میں انتظامات اجلاس کے سلسلے میں نواب صاحب مجلسِ استقبالیہ کے معتمد کو قبل از قبل مطلع فرماتے۔ چنانچہ اجلاس الٰہ آباد کے سلسلے میں نواب صاحب نے جو خط تحریر فرمایا۔ اس کے مطالعہ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔

نواب سر محمد یوسف

الٰہ آباد

نواب صاحب مکرم و محترم!

ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی کہ الٰہ آباد کے اجلاس مسلم لیگ کی مجلس استقبالیہ کس کی صدارت میں مرتب ہو رہی ہے، میں اگر ہوتا تو صرف آپ کے لئے رائے دیتا۔ اس لئے اس وقت آپ ہی کو صدر مجلس استقبالیہ تصور کر کے یہ عریضہ گذران رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ ابھی اپنے دورِ طفولیّت سے گذر رہی ہے اور قطعاً اس قابل نہیں کہ بغیر کسی سہارے کے اپنے پاؤں پر آپ کھڑی رہ سکے اور اس کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ سے بہتر سہارا کون ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتک اس کے دو سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے پنڈال میں لاہور اور مدراس میں ہو چکے ہیں۔ اور اب اس کے تیسرے سالانہ اجلاس کی کامیابی کا دار و مدار آپ کی توجہ پر منحصر ہے۔ لاہور اور مدراس کی مجالس استقبالیہ کا میں ممنون ہوں کہ انہوں نے ہم کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائیں۔ پنڈال کے استعمال کی اجازت دی۔ اپنے پروگرام میں ہماری دو نشستوں کے لئے کافی وقت رکھا، لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت دی، اگر ہم کو کوئی رات کا وقت دیا گیا تو پنڈال میں روشنی کا انتظام کیا۔ ہمارے ڈلیگیٹس کو ٹھہرانے کے لئے جداگانہ انتظامات کئے۔ مجھے یقین ہے

کہ الہ آباد کی مجلس استقبالیہ اپنے ریاستی بھائیوں کی امداد میں کسی سے پیچھے نہ رہیگی۔

میں آپ سے حسب ذیل امور کی طرف توجہ فرمائی کا متمنی ہوں۔

(۱) ہمیں اپنے سالانہ اجلاس کی دو نشستوں کے لئے اپنا عظیم الشان پنڈال اور اس کے متعلقہ انتظامات کے استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔

(۲) اپنے پروگرام میں کسی دو دن ہماری دو نشستوں کے لئے تین تین گھنٹوں کا مناسب وقت معین فرمائیے۔

(۳) ہمارے مندوبین کے ٹھہرنے کیلئے جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ سو ہوگی اپنے مندوبین کے کیمپ میں ایک جداگانہ مقام میں فرما دیجئے۔ اور اگر آپ اپنے مندوبین کے قیام کے لئے مکانات کا انتظام فرما رہے ہوں تو جلسہ گاہ سے قریب ایک مکان کا انتظام ہمارے لئے بھی کر دیجئے، اگر کرایہ ادا کرنا پڑے تو ہم ادا کر دیں گے۔

میں نے ان تمام انتظامات میں آپ کی امداد حاصل کرنے اور آپ سے مل کر بالمشافہ تمام امور کو طے کرنے کے لئے مولوی محمود الحسن صاحب صدیقی ایکٹنگ سکریٹری آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کو آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ جن سے آپ ناگپور میں مل چکے ہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ کی کامل ہمدردیاں ہم کو حاصل رہیں گی۔ میری دلی دعا ہے کہ الہ آباد کا اجلاس آپ کی مساعی سے کامیاب ہو اور آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ میں اپنی خوبیوں کے اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہے گا، انشاء اللہ ۳ر اپریل کو الہ آباد پہونچوں گا۔

(حوالہ: مکاتیب بہادر یار جنگ، مرتبہ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی مکتوب نمبر ۱۲۶ ص ۲۸۷، ۲۸۸۔

اس طرح مسلم لیگ کے ہر سالانہ اجلاس کے موقعہ پر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے اجلاس بڑے اہتمام سے منعقد ہوتے۔

آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے کام کو پروان چڑھانے کے لئے

۱۹۴۳ء میں قائد ملت نے ایک دورہ کمیٹی مقرر فرمائی، جس کمیٹی کی قیادت قائد ملت نے فرمائی۔ سب سے پہلے راجپوتانہ کی تمام ریاستوں کا دَورہ فرمایا جہاں مسلمانوں نے غیر معمولی جوش سے اپنے قائد کا خیر مقدم کیا، ریاست ہائے راجپوتانہ میں اودے پور، جے پور، جودھپور، بوندی کوٹہ بیکانیر ٹونک، دھول پور، بھرت پور، وسطی ہندوستان میں گوالیار، اندور، بھوپال، ریوا دیتا دھار دیواس جاوڑہ، تلام چارکھاری اور گجرات وکاٹھیاواڑ کی ریاستوں میں کچھ، جوناگڑھ، پالن پور، کونڈل، دھاول، پوربندر، مانا دیدور، بالاسیرور، کیمبے، دھن پور، ناونگر، بھونگر اور جام نگر۔

ریاست ہائے پریسیڈنسی بمبئی میں بڑودہ، کوکھاپور، سانگلی، راج پیلہ جنجرہ، ساجن، جام کمنڈنی، اکل کوٹ، سادنورا، مدراس پریسیڈنسی میں، حیدرآباد، میسور، پدوکوٹہ، بیگن پلی اور کوچین۔

کشمیر و پنجاب کی ریاستوں میں پٹیالہ بہاولپور، نابھا، کپورتھلہ، کالیہ، منڈی، مالیرکوٹلہ، فریدکوٹ، لوہارو۔

پنڈی سندھ اور بلوچستان میں خیرپور، قلات۔

صوبہ جات متحدہ بہار بنگال اور آسام کی ریاستوں میں رام پور کنگ پور، کیونجی ہار، ڈھنکنال کا دورہ فرمایا۔

اختتام دَورہ پر بشمول صدر نوارکان کی کمیٹی نے رپورٹ مرتب کی، ریاستی مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی امور کا جائزہ لیا گیا۔ مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت، ریاستوں میں اصلاحات اور دیگر امور کے حل پر غور و فکر کے بعد ایک لائحۂ عمل مرتب کیا گیا۔

قائد ملت نے ان دوروں میں کل ہند ریاستی لیگ کے مقاصد ریاستی مسلمانوں کے حقوق اور اس کی صیانت کی صورتِ حال پر

اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، لسان الامت کی اثر انگیز خطابت نے ہر ریاستی مسلمان کو اس درجہ متاثر کیا کہ وہ انتہائی گرم جوشی سے ریاستی مسلم لیگ کے اجلاسوں میں بڑھ چڑھ کر عملی حصّہ لینے لگے —————

نواب صاحب نے اسٹیٹ مسلم لیگ کو آگے بڑھانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، ارباب متعلقہ سے مسلمانوں کے حقوق سیاسی مذہبی و اقتصادی میں نمائندگی فرمائی، مقامی مشاہیر کے باہمی اختلافات کو دور کرکے ان کی صلاحیتوں کو تنظیمی قوت میں بدل دیا، اس ریاستی لیگ کے ذریعے سارے ہندوستان کی مسلم آبادی کو ایک مرکز پر جمع کر دیا۔

"بہادر یار جنگ نے آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ قائم کی اور آخر دم تک اس کے صدر رہے۔ اس لیگ کی تنظیم خاصی مشکل اور اس کا عملی کام اس سے بھی زیادہ مشکل تھا لیکن بہادر یار جنگ کی عالی دماغی، محنت اور خلوص نے اس کو ایک ایسی حقیقت بنا دیا کہ جن غیر مسلم ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق پامال کئے جا رہے تھے وہاں کے ارباب اقتدار اس لیگ اور اس کے صدر کے نام سے کانپتے تھے۔ بہادر یار جنگ نے اس سلسلے میں ہر قسم کی محنت اور تکلیف کو برداشت کیا"

(مرگ مفاجات از مولانا غلام بھیگ نیرنگ)

قائد ملت کو اسٹیٹ مسلم لیگ قائم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اس کا پس منظر "پورا سیاسی پس منظر" کا حامل ہے، ایک طرف جب کانگریسی لیڈروں نے اسٹیٹس پیپلس کانفرنس کا کانگریس سے الحاق کا تصفیہ کیا اور ریاستوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا تو دوسری طرف مسلم لیگ ریاستوں سے متعلق اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی پر قائم تھی اور نواب صاحب نے اس موقعہ پر محسوس فرمایا کہ :-

" بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بعض موقعوں پر ریاستی مسلمانوں کو مایوس کیا۔ ان تمام حالات نے دیسی ریاستوں کے مسلم باشندوں پر اس ضرورت کو پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک کل ہند نظام ترتیب دیں ورنہ اکثریت ہونے کے باوجود بیرونی طاقتوں سے ربط و تعلق اور اقلیت کا اقلیت ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بے تعلق ہونا ان کے مستقبل کو انتہا درجہ تاریک اور خطرات سے پُر بنا دیگا، میں نے محسوس کیا کہ یوں تو حیدرآباد کے مسلمانوں کو جو مغلیہ شہنشاہیّت کی عظمتِ رفتہ کے صحیح وارث ہیں، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی شاہ راہ ترقی میں رہبری کرنی چاہئے لیکن کم از کم وہ اپنے اس فریضہ کی ابتدا ایسی ریاستوں کے مسلمانوں کی قیادت سے کریں۔ اس سے ایک طرف وہ مختلف ریاستوں کے مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ اخوت پیدا کر سکیں گے جو ہر ایک کی مضبوطی کا باعث ہو اور اس کو آنے والے طوفان جمہوریت میں اپنے وجود کے تحفظ کے قابل بنائے تو دوسری طرف بالواسطہ وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ بھی تعاون اور اشتراکِ عمل کر سکیں گے۔ جے پور، جودھپور اور بعض دوسرے ریاستوں کے خونچکاں حالات اور گوالیار وکشمیر وغیرہ کی مسلم کش دستوری تبدیلیاں اس ضرورت کو اور بھی زیادہ محسوس کراتی ہیں، چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر ایک آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی تحریک ریاستی مسلمانوں کے سامنے رکھی اور ان سے خواہش کی کہ ایک مرکز پر مجتمع ہو جائیں اور اپنی انفرادیت کے تحفظ میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس ضرورت کو ہندوستان کے اور بھی بہت سے مفکرین محسوس کر رہے تھے، چنانچہ میری دعوت پر ہر طرف سے صدائے لبیک بلند ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تحریک مستقبل میں نہایت

کامیاب اور ریاستی مسلمانوں کے تحفظ اور نجات کا ذریعہ بنے گی"۔

(حوالہ: خطبات قائد ملت ص ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۷)

اور سچ تو یہ ہے کہ نواب بہادر یار جنگ کی سیاسی بصیرت کا ایک نقش یہ بھی تھا کہ انہوں نے بَروقت محسوس کیا کہ مسلم لیگ کی، ریاستی مسلمانوں کے تعلق سے غیر جانبدارانہ پالیسی، ان ریاستوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، انہیں نقصان پہنچائے بغیر نہ رہے گی، ایک طرف تو کانگریس اپنی خود ساختہ جماعت اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کی وساطت سے ریاستوں کا کانگریس کے ساتھ الحاق چاہتی تھی اور اس مطالبہ پر اپنی روش سخت سے سخت تر کرتی جاتی تھی اور دوسری طرف مسلم لیگ اپنے دستور کے حدود سے باہر ریاستی مسلمانوں کے معاملات کو اپنے دائرۂ کار سے خارج سمجھتی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ ریاستی مسلمان کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک کل ہند تنظیم کی ضرورت تھی قائد اعظم سے جب اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہوگیا تو نواب صاحب نے کل ہند ریاستی مسلم لیگ کی بنا ڈالی اور صدر کی حیثیت سے مصروف عمل ہو گئے"۔

(حوالہ: ص ۱۹۵، مضمون مولوی صمدانی نقوی صاحب
بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

ان کی غیر معمولی شخصیت اگر اس کام کا بیڑا نہ اٹھاتی تو یہ تحریک سازشوں کا شکار ہو کر دم توڑ دیتی، ریاستی مسلم لیگ کے سلسلے میں لیاقت علی خاں اور دیگر لیگی رہنماؤں کا عدمِ تعاون اور اندرونی طور پر اس کی ہر محاذ پر مخالفت بھی ہر دم رخنہ گر رہی۔ حالانکہ ریاستی مسلم لیگ، ایک طرف ریاستی مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے اور انہیں انصاف دلانے میں معاون بنی تو دوسری طرف لیگ کے مطالبہ

پاکستان میں ریاستی مسلمانوں کی وجہ سے قابلِ قدر تعاون، لیگ کے شریکِ حال رہا۔

انہوں نے ریاستِ ہند کے مسلمانوں کی زبوں حالت پر غائر نظر ڈال کر طے کیا کہ ان تمام ریاست ہائے ہند کی مسلم آبادی کو کسی ایک نظام میں منسلک کیا جائے تاکہ وہ منظم ہو کر اپنے حقوق کا تحفظ اور مستقبل کے آنے والے خطرات کا علاج کر سکیں، اس مقصد کے لئے آل انڈیا ریاستی مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔

ابتداءً اس جماعت کی ہنسی اڑائی جاتی تھی لیکن نواب بہادر یار جنگ کی غیر معمولی اور مخلصانہ خدمات نے اس جماعت کو تھوڑی ہی مدت میں اس معیار پر پہنچا دیا کہ جس مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوتا، وہیں آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کے شاندار اجلاس ہوتے جہاں ریاست ہائے ہند کے نمائندگان کے علاوہ مشاہیر ہند اور زعمائے ملت شرکت کرتے۔"

(حوالہ: قائدِ ملت از مولانا عبدالحامد بدایونی، ہفتہ وار "آہنگ" حیدرآباد، ۱۲ر مئی ۱۹۵۷ء)

لاہور کے پہلے اجلاس کے بعد اب یہ معمول بن چکا تھا کہ مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں کے ساتھ ریاستی مسلم لیگ کا شاندار اجلاس بھی منعقد ہوتا۔ اس دوران ریاستی مسلم لیگ کی شاخیں، ریاستوں میں قائم کی گئیں اور باضابطہ کام شروع کیا گیا۔ اس دوران آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کے تعلق سے نت نئی باتیں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی، جن میں سب سے اہم یہ جھوٹی خبر تھی کہ ریاستی مسلم لیگ سے متعلق قائدِ ملت اور قائدِ اعظم میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں حالانکہ ہر صاحبِ نظر اس امر کا معترف تھا کہ محض قائدِ ملت کی بصیرت و

قابلیت کے باعث ریاستی مسلم لیگ مسلم لیگ کی معاون جماعت ثابت ہوئی۔
نواب صاحب نے اس سازش کو بھانپ لیا اور اس پروپگنڈے کے جواب میں ارشاد فرمایا:

میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو پاکستان پر کامل یقین رکھتے ہیں، اور اس کو ہندوستان کے سیاسی مسائل اور خصوصاً مسلمانوں کے مستقبل کا واحد حل تصور کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ قائداعظم سے ریاستی مسائل کے سلسلے میں میرا اختلاف ہے۔ حالانکہ اس کے برخلاف میں نے آج تک ان کی مرضی کے بغیر قدم نہیں اٹھایا، میری سیاسی زندگی کی ہر منزل میں وہی میرے رہنما ہیں۔

(حوالہ: نوائے وقت پاکستان ۲۵ رجون ۱۹۸۲ء)

۱۹۴۲ء میں سر اسٹافورڈ کرپس، باشندگان ریاست کے نمائندوں سے ملنے والے تھے، اس خصوص میں اسٹیٹس پیپل کانفرنس جس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے، پیش پیش تھے، ایسی صورت میں ریاستی مسلمانوں کی نمائندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک ریاستی مسلم لیگ اس خصوص میں نمائندگی نہ کرتی۔ وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نواب صاحب نے سر اسٹافورڈ کرپس سے ریاستی مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں باخبر کیا اور اس خصوص میں قائداعظم سے رہنمائی و مدد بھی طلب کی۔ وہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو قائدِ اعظم کے نام اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

مسٹر جناح! جیسا کہ میں نے کل آپ سے کہا تھا، اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سر اسٹافورڈ کرپس باشندگان ریاست کے نمائندے سے بھی ملنے والے ہیں۔ میں نے آپ کی ہدایت کے موافق ان کو ایک تار بھی بھیجا ہے اور خط بھی لکھا ہے، جس کی نقل منسلک ہے، آل انڈیا اسٹیٹس

مسلم لیگ کے پوزیشن کو قائم رکھنا اب آپ کی توجہ پر منحصر ہے اور میں متمنی ہوں کہ آپ اس میں دلچسپی لیں۔ میں جانتا ہوں کہ ریاستی رعایا کا ریپرزنٹیشن (REPRESENTATIO N) موجودہ مسائل میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر بھی مسلمانوں کی نمائندگی کا نہ ہونا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ میں آپ کی ہدایات کا منتظر ہوں۔

(حوالہ: خط نمبر ۷۶ہم الف ص ۴۹۲ مکاتیب بہادر یار جنگ)

اور سر اسٹافورڈ کرپس کے نام حسب ذیل خط لکھا گیا، جس میں اسٹیٹس مسلم لیگ کی نمائندگی کے بارے میں وضاحت کی گئی تھی

سر اسٹافورڈ کرپس!

اخبارات میں، میں نے دیکھا کہ آپ اسٹیٹ کے عوامی نمائندوں سے ملیں گے، آپ کے فوری حوالہ کے لئے ایک اخبار سے تراشہ بھی منسلک کر رہا ہوں، شاید آپ اس حقیقت سے واقف ہوں کہ اسٹیٹ کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی صرف ایک ہی جماعت ہے جو آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کہلاتی ہے اور جس کی صدارت مجھے سونپی گئی ہے۔

اسٹیٹس پیپل کانفرنس جو پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں کام کر رہی ہے یا کوئی اور جماعت، اسٹیٹ میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل کو انصاف کے ساتھ پیش نہیں کر سکتی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اسٹیٹس کے مسلمانوں کو نظر انداز نہ کریں گے اور مجھ سے ملنے اور ان مسلمانوں کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے خیال کو پسند فرمائیں گے۔

(حوالہ: ص ۴۹۳، خط نمبر ۷۶ہم ب مکاتیب بہادر یار جنگ)

"بطل حریت قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور نہ صرف مسلمانانِ ریاست حیدر آباد کے مایۂ ناز رہنما تھے بلکہ تمام

ہندوستانی ریاستوں میں بسنے والی ملتِ اسلامیہ کے محبوب قائد بھی تھے۔
یہ آفتاب ہدایت اگرچہ حیدر آباد دکن کی سرزمین سے طلوع ہوا مگر اس کی ضو فشانی اور نورانی کرنوں نے ہندوستانی ریاستوں کی ظلماتی سرزمین کو منور اور روشن کرنا شروع کر دیا تھا، انہیں ریاستی مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا ہر لحظہ خیال رہتا تھا، ان کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ریاستی دنیا کے اندر ایک ایسی بہار پیدا کی جائے کہ جس سے امن و سلامتی سے پژمردہ شگوفے اور ایمان وایقان کے مرجھاتے ہوئے پودے تازہ ہو کر ہرے بھرے ہو جائیں۔

مرحوم ایک ایسی زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے کہ دنیا کے حوادث ان کے غیر متزلزل عزم پر مطلق اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے ان کے سینہ میں بلندیوں کے لئے ایک لازوال تڑپ، ایک لافانی جذبہ، ایک پیہم اضطراب اور مسلسل ذوق تگاپوے دمادم موجود تھا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے ریاستی مسلمانوں کے آہ وفغاں کے نالے، درد و الم کی چیخیں اور اضطراب والتہاب کی صدائیں سنیں۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

(حوالہ: "حیات آفریں" شائع شدہ اعلان جالندھر، قائد ملت نمبر شمارہ ۲۱)

ایسے موقعوں پر جب یادوں کے چراغ جلتے ہیں تو دِل بے اختیار پکار اٹھتا ہے ؎

وہ اٹھ گیا جو پیکر احساس درد تھا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

قائدملت مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے اسٹیج پر

قائدملت کی وابستگی برصغیر کی ہراس تحریک اور ادارے سے رہی جن اداروں یا تحریکات کا تعلق ملتِ اسلامیہ کے مفادات کی حفاظت وصیانت، ذہن وفکر کی اصلاح یا ان کے فلاحی کاموں اور تعلیمی نظام سے متعلق رہے۔

تحریک علی گڈھ مسلم یونیورسٹی تو مسلمانانِ ہند کی عظیم تعلیمی تربیت گاہ رہی ہے جہاں کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے ہر شعبہ حیات میں کامیابی وکامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں بلاشبہ اس یونیورسٹی کے طلبہ کی جدوجہد تحریک پاکستان کا ایک سنہرا باب ہے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار کرتے ہوئے قائدملت نے ارشاد فرمایا تھا "مجھے دو نسبتیں مسلم یونیورسٹی سے اتنا ہی قریب کردیتی ہیں جتنا کوئی وہاں کا تعلیم یافتہ ہوسکتا ہے ایک نسبت تو اسلامی ہے جس کی وجہ سے ہر مسلم کو اس یونیورسٹی سے محبت ہونی چاہیئے۔

دوسری نسبت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی اس کے چانسلر ہیں اور اس طرح مسلم یونیورسٹی حیدرآباد کی ہے اور ہر حیدرآبادی اس سے روحانی تعلق رکھتا ہے۔" (حوالہ: تقریر قائدملت بعنوان "مسلم یونیورسٹی علیگڈھ" مشمولہ بہادریار جنگ کی غیرسیاسی تقاریر۔ مرتبہ نذیرالدین احمد)

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں قائد ملت کی پہلی تقریر حیدر آباد میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور دعویٰ ہائے اقتدار کے زیر عنوان تھی۔ اس تقریر کے متعلق علامہ سلیمان ندوی اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"علی گڈھ یونیورسٹی یونین سے داد پانا آسان نہیں، یونین میں ان کی پہلی تقریر تھی، موضوع حیدر آباد میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور دعویٰ ہائے اقتدار تھا۔ جب تک وہ تقریر کرتے رہے، تاثیر کا دریا بہتا رہا اور ہر شخص کو تسکین ہو گئی کہ حیدر آبادی مسلمانوں کا دعویٰ بالکل صحیح ہے۔ ایک اچھے مقرر لیڈر کو یہ کہتے سنا کہ انہوں نے اپنے کیس کو بہت خوبی سے پیش کیا۔ طالب علموں نے ان پر تحسین و آفریں کے پھول برسائے، یہ علیگڈھ میں ان کی پہلی جیت تھی۔"

(حوالہ: ایک بہادر مسلمان کی موت، از علامہ سلیمان ندوی)

علیگڈھ کا اسٹیج اہل علم و فضل کیلئے بھی امتحان گاہ سے کم نہیں رہا ؎

یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

کے مصداق حال تھا لیکن پہلی تقریر کیا ہوئی کہ طلبہ و اساتذہ ان کی تقریروں اور شخصیت کے گرویدہ بن گئے۔ حامد علی ہال کی وسعتیں جب شائقین کے ہجوم کے باعث اپنی تنگ دامنی پر شکوہ سنج ہوئیں تو اسٹریچی ہال کی وسعتوں نے اپنا دامن پھیلا دیا مگر اسٹریچی ہال کی نظریں بھی سامعین کے ہجوم سے آنکھیں ملانے کے قابل نہ تھی۔ اسٹریچی ہال کے دامن میں جتنے سماجاتے، سماجاتے باقی کھڑے کھڑے ہال میں اور ہال کے باہر اس شعلہ نوا خطیب کی سحر انگیز تقریر سے مستفید ہوتے۔

یوں تو قائد ملت نے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے اسٹیج پر کئی تقریریں فرمائیں، لیکن جن تقریروں کی روئیدادیں مضامین میں محفوظ ہو گئیں۔ اسی سرمایہ سے اس موضوع پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ ۳۰ راگسٹ ۱۹۳۹ء کی ایک یادگار

تقریر کا ذکر "آواز دوست" کے صفحات پر ملتا ہے۔

"۳۰ر اگست ۱۹۳۹ء کو بہادر یار جنگ کی پہلی تقریر اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے سیرت کے جلسہ میں سنی۔ میرے لئے وہ بالکل اجنبی تھے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا، سیرت کا ہفتہ منایا جارہا تھا اور مہمان دور دور سے اس میں شرکت کیلئے بلائے گئے تھے۔ نامور عالم، مشہور سیرت نگار، معروف مفسر اور دینی اداروں کے معلّم سبھی اپنی مخصوص سادگی اور وضع قطع کے ساتھ وہاں موجود تھے، حفیظ جالندھری بھی آئے تھے اور عمر کے اس دور سے گذر رہے تھے جب شاہنامہ اسلام سناتے ہوئے نہ وہ تھکتے تھے اور نہ ان کے سننے والے، ایسے عالمانہ شاعرانہ اور غریبانہ ماحول میں دولتِ آصفیہ کے ایک یار جنگ کو تقریر کی دعوت دینا میری سمجھ سے باہر تھا بہت سوچا تو یہ خیال گذرا کہ شاید منتظمین کو اس نواب سے چندہ ملنے کی توقع ہے جو ترکی ٹوپی کسی ہوئی شیروانی اور تنگ پائجامہ پہنے تنگنائے دکن سے چل کر مسلم یونیورسٹی میں آنکلا ہے، وخطاب یافتہ جاگیردار تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو پہلے اپنے دونوں انگوٹھے اچکن کے سامنے والی جیبوں میں اٹکائے تقریر کی تو اہل درد کا دل اس جاگیردار نے لوٹ لیا کیا وہ جلسہ کیا وہ دن یہ تقریر تو سیرت کے پورے ہفتہ کی تقریبات کا حاصل بن گئی اس کے بعد اگلے چندسال لوگ اس ہفتہ اور اس مقرر کی آمد کا انتظار کرتے رہتے اس روز تقریر ختم ہوئی تو میں نے اپنی اچکن کی جیب سے آٹوگراف البم نکال کر بہادر یار جنگ کے سامنے رکھدی بہادر یار جنگ نے البم کو ترچھا کیا اور صفحے کے وسط کے بجائے اس کے نصف حصّے کے درمیان بڑی تیزی سے محمد بہادر خاں لکھا۔ اس کے نیچے چھوٹی سی لکیر لگائی پھر ۳۰ر اگست ۱۹۳۹ء لکھا اس کے نیچے ایک بڑی سی لکیر لگا کر البم مجھے واپس کردی اس وقت ان کی عمر صرف ۳۴ر برس کی تھی اور برّصغیر کی تاریخ میں اپنا مستقل مقام حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس صرف پانچ برس

باقی رہ گئے تھے۔ اب وہ تحریک پاکستان تحریک آل انڈیا مسلم لیگ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے ذریعہ اسلام کا پیغام عام کرنے لگے، شاید انہیں اس کا احساس تھا کہ کام بہت پڑا ہے اور مہلت بہت کم ہے اس لئے وہ ہر کام بہت تیزی اور تندہی سے کیا کرتے تھے، تیزی سے لکھا ہوا خط خوشخطی کے زمرے میں نہیں آتا لیکن خلوص اور تندہی سے کئے ہوئے کام کارنامے بن جاتے ہیں "

(حوالہ: آوازدوست محترم مختار مسعود صاحب)

علیگڈھ کے اسٹیج پر نواب صاحب کی تقاریر کا آنکھوں دیکھا حال مولوی الحاج محمد زبیر کی زبانی سنئے۔

میں نے قائد ملت بہادر یار جنگ مرحوم کا نام پہلے پہل خاکسار تحریک کے ضمن میں سنا تھا اس تحریک کے انتہائی سخت اور کڑے اصولوں کی جس خلوص و تندہی کے ساتھ انہوں نے پابندی اور تعمیل کی اس کا شہرہ سن کر میں ان کی بڑائی کا قائل ہوگیا اور میرے دل میں ان کو دیکھنے کی آرزو کروٹیں لینے لگی - میری یہ آرزو اس وقت برآئی جب وہ پاکستان تحریک کے سلسلے میں علیگڈھ تشریف لائے اور اسٹوڈینٹس یونین کلب کے عظیم الشان ہال میں ان کا نہایت پرجوش خیرمقدم کیا گیا۔ مجھے وہ سما خوب یاد ہے جب قائد ملت تقریر کرنے کے لئے اسٹیج پر تشریف لائے۔ تو یکایک یونین ہال کی چھت کے دریچہ سے ان پر پھول برسنے لگے اس گلباری سے ان کا متبسّم اور پُروقار چہرہ بے حد مسرور اور شگفتہ نظر آرہا تھا۔ انہوں نے پرجوش تالیوں کی گونج میں اپنی تقریر کا آغاز کیا اور طلاقت لسانی اور حسنِ خطابت کا سکہ حاضرین کے دلوں پر بٹھا دیا، اس کے بعد وہ برابر علی گڈھ تشریف لاتے رہے اور مجھے ان کی خدمت میں باریاب ہونے اور ان کی بلند پایہ تقاریر سننے کے مواقع ملتے رہے۔ ان جلسوں میں میری بیوی بھی برابر شریک ہوا کرتی تھیں۔ جلسہ گاہ میں یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلبار کے علاوہ خواتین بھی

کافی تعداد میں ہوتی تھیں۔ ان جلسوں کی ایک قابل قدر خصوصیت یہ تھی کہ خواتین کے لئے نشستیں مردوں سے علیٰحدہ ہال کی گیلری میں فراہم کی جاتی تھیں۔

میں نے نواب صاحب کی تقریر میں ایک خوبی یہ بھی دیکھی کہ وہ تقریر کے دوران بڑے فاضلانہ انداز سے بڑی اچھوتی اور نئی بات پیدا کرکے اپنے بیان کو دلکش اور پرمغز بنا دیتے تھے۔ مثلاً ایک بار مسلم لیگ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس کا اولین اجلاس اللہ تعالیٰ کے زیر صدارت آسمان پر ہوا تھا پھر انہوں نے اپنے اس نکتہ کی توضیح وتشریح نہایت پرتاثیر اور عالمانہ انداز سے فرمائی جس کے نقوش مدتوں میرے ذہن کی سطح پر مرتسم رہے۔

یہاں یہ کہہ دینا غیر متعلق نہ ہوگا کہ طلبار کے یونین کلب کا یہ ہال نواب حامد علی خاں والیِ رامپور کے قیمتی عطیہ سے تعمیر ہوا ہے اور اسی بنا پر "رامپور حامد ہال" کہلاتا ہے یہاں ہر ملک و قوم کے اکابر ومشاہیر کے طلبار کی طرف سے خیر مقدم کیئے جاتے ہیں جن کی شان وشوکت لائق دید ہوتی ہے لیکن جب نواب بہادر یار جنگ کے جلسوں میں شرکار کی تعداد ہال کی وسعت سے آگے نکل گئی تو ان کی تقریریں یونیورسٹی کے اسٹریچی ھال میں ہونے لگیں۔

اس ہال کے متعلق یہ یاد رہے کہ اس کے در و بام میں ایثار و قربانی، فراخدلی اور بے تعصبی کے بڑے دلکش نقوش تقریباً سو برس سے جھلک رہے ہیں ان کا ذکر میں اپنی تحریروں اور تقریروں میں کرتا رہتا ہوں تاکہ سامعین اور قارئین کے دلوں میں یہ عالی صفات اجاگر ہوتی رہیں۔

اس عظیم الشان ہال کی اندرونی وسعت پانچ ہزار مربع فٹ کہی جاتی ہے اس کا نام سرسیدؒ نے اپنے زمانے کے یوپی کے گورنر "سرجان اسٹریچی" کے نام پر اسٹریچی ہال رکھا تھا اور آج تک وہ اسی نام سے موسوم ہے اس کی دیواروں پر ان اصحاب کے نام کندہ ہیں جنہوں نے اس کی تعمیر میں چندے دیئے تھے، ان میں مسلم معطیان کے ساتھ ہندو اور انگریزوں کے نام بھی ثبت ہیں مگر ان میں

جالندھر ہائی اسکول کے ایک غریب مدرس کا نام سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے ان کے ایثار کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے پانچ سو روپیہ جمع کیا تھا لیکن نکاح کے وقت اسے یہ خیال آیا کہ شادی کی فضول رسموں میں خرچ کرنے کے بجائے قومی کام میں خرچ کر دینا بہتر ہوگا چنانچہ انہوں نے اپنی لڑکی کا نکاح صرف چھواروں پر کر دیا اور پانچ سو روپے اسٹریچی ہال پر تعمیر کرنے کیلئے سرسیّد کے پاس بھیجدیئے۔

یہ ذکر تو درمیان میں آگیا جس کا پڑھنا میرے خیال میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اصل میں کہنا یہ ہے کہ اس عالی شان حال میں یونیورسٹی کانوکیشن اور دیگر بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ یہاں میں نے ہزار الٹڈ ہائنس میر عثمان علی خاں (نظام حیدرآباد دکن) ہر ہائنس سلطان جہاں بیگم نواب حمید اللہ خاں (فرماں روایان بھوپال) نواب صاحب بھاولپور، مہاراجہ الور، وائسراں ہند لارڈ لنلتھ گو، لارڈ ریڈنگ، لارڈ ولنگڈن اور دیگر ممتاز اکابر کے بڑے تزک و احتشام سے خیر مقدم ہوتے دیکھے ہیں۔ لیکن جب بہادر یار جنگ یہاں تقریر فرماتے تو یہاں کا سماں بڑا روح افزا ہو جاتا، ان جلسوں کی مقبولیت اور نواب صاحب کی ذات گرامی سے لوگوں کی ارادت کا یہ عالم دیکھا کہ یونیورسٹی کے پرفیسر، طالب علم، غرض ہر استعداد اور ہر مکتبۂ فکر کے حاملین اتنی کثیر تعداد میں شریک ہوتے کہ اس وسیع ھال میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہتی۔ جب نواب صاحب اراکین یونیورسٹی کے جلو میں یہاں داخل ہوتے تو حاضرین ایستادہ ہوکر پرجوش چیرز کے ساتھ اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے تھے۔

ایسے ہی والہانہ جوش و خروش کے ساتھ ان کی آمد کے وقت اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا جاتا۔ طلبار اور دیگر حضرات کی اس قدر کثرت ہوتی کہ ریل کا وقتِ مقررہ پر روانہ ہونا مشکل ہو جاتا۔ ایک بار میں لوگوں کے جم غفیر میں اس بری طرح پھنسا کہ سانس لینا محال ہوگیا اس کے بعد پھر کبھی ان کے

استقبال کیلئے اسٹیشن جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

یہ ۲۵ برس پرانی باتیں ہیں جو یاد آجاتی ہیں وہ یہاں پیش کردیتا ہوں۔ اس وقت میری نظروں میں وہ چہل پہل اور رونقیں گھوم رہی ہیں جو نواب صاحب کے قیام کے دوران یونیورسٹی سے شہر تک پھیل جایا کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ بھی ان کی تقریریں سننے کے اتنے متمنی رہتے کہ رات میں بھی کئی میل کا فاصلہ طے کرکے یونیورسٹی پہونچ جاتے تھے۔

علیگڈھ میں جہاں ان کا قیام ہوتا وہاں بھی ہمہ وقت چہل پہل رہتی ان سے ملنے اور ان کی صحبتوں سے فیض اٹھانے کیلئے لوگ برابر آتے رہتے تھے، لائق ذکر بات یہ ہے کہ ان مشاغل کے ہجوم میں بھی ان کے چہرہ پر تھکن یا گھٹن کے آثار نہ ہوتے، ہر حال میں ہشاش بشاش نظر آتے تھے، ان کی مصروفیت کا حال کیا بیان کروں، یونیورسٹی کی شعبہ جاتی سوسائٹیوں اور طلبار کے مختلف انجمنوں کی طرف سے روزانہ عصرانے اور ڈنر دیئے جاتے، ان تقریبات میں نواب صاحب کی شان میں نظمیں پڑھی جاتیں۔ میزبان اپنی تقریروں میں طرح طرح سے ان کی خدمات کی تعریف وتحسین کرتے، پھر جوابی تقریر ہوتی جو کھانے کے مزوں کو دوبالا کردیتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک جلیل القدر مقرر تھے، میں نے یونیورسٹی سے اپنی ۴۲ سالہ وابستگی کے دوران جن بڑے بڑے علمار وفضلار اور اکابر مشاہیر کی تقریریں سنیں، ان... میں نواب صاحب کی تقریر کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا، اسکی لطافت معنویت، شیرینی وشگفتگی ہی کچھ اور تھی۔"

(حوالہ:۔ مضمون از الحاج محمد زبیر صاحب، استاد لائبریری سائنس مسلم یونیورسٹی علیگڈھ وسابق لائبریرین نیشنل کالج کراچی ص ۲۷۵ تا ۲۷۷ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظریں۔
ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی۔ کراچی)

سنہ ۱۹۴۱ء میں علیگڈھ کے اسٹیج پر مولانا عبدالماجد دریابادی اور بہادر یار جنگ کی تقریر کی روئیداد مولانا عبدالماجد دریا بادی "صدق" کے صفحات پر نقل فرماتے ہیں :-

" ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۱ء مقام علیگڈھ یونیورسٹی کی مجلس تاریخ وتمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب کا دونوں کا بیان ہونے والا تھا، نواب سحر بیان کی خطابت بچے بچے سے تحسین حاصل کئے ہوئے اہل جلسہ نے غلطی کر کے مجھ جیسے کج مج زبان کا وقت اسی بلبل ہزار داستان کے ساتھ رکھدیا، وسیع اور لق و دق اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک بھرا ہوا سامنے جو لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اس نے جواب دے دیا۔ اب بھلا میری آواز کہاں پہنچتی، ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہہ دیا، ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے۔ کچھ سنائی نہیں دیتا اور ہم نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں۔ میں تو پہلے ہی سے ہٹنے پر آمادہ تھا۔ ذرا صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا۔ معاً نواب صاحب کھڑے ہوئے اور گرج کر بولے، کوئی سنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے بیان کو آخر تک سنوں گا، میں تو انہیں کا لکچر سننے آیا ہوں اور جب تک وہ اپنا لکچر ختم نہ کریں گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کروں گا، مجمع میں سناٹا چھا گیا۔ ہے کہیں اس دور میں شرافت کی ایسی مثال ؟ -

وہ رات جنوری کی رات تھی اور اپنے پورے شباب پر تھی۔ مولانا کا مقالہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ ادھر طلبہ نے بے چینی کا اظہار مختلف طریقوں سے کرنا شروع کر دیا۔ صدر اجلاس ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے طلبہ کو جھاڑ پلائی اور پھر مولانا سے درخواست کی کہ وہ اپنا مقالہ پورا کریں، لیکن مولانا تشریف نہیں لائے۔ صاحب صدر نے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ سے تقریر کرنے کی درخواست کی۔ جلسہ کا ماحول بڑا خراب ہو گیا تھا، یہ ایک

مقرر کیلئے بڑا ہی کٹھن وقت تھا لیکن بہادر یار جنگ کیلئے کچھ مشکل نہ تھا، چنانچہ آپ ڈائس پر تشریف لائے اور بڑے ہی اطمینان سے یوں مخاطب ہوئے۔

"حضرات! اس سردی کے موسم میں آپ کی دعوت پر پانچسو میل کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ مولانا عبدالماجد نہیں ہوں کہ بیٹھ جاؤں گا۔ اچھی طرح سُن لیجئے کہ جب تک ایک ایک لفظ نہ کہہ لوں گا اسٹریچی ہال سے جاؤں گا نہ آپ کو جانے دوں گا۔"

اس کے بعد نواب بہادر یار جنگ بولے اور بڑے ہی دھڑلے کے ساتھ تقریر کی۔ تقریر کیا تھی ایک سحر تھا کہ کسی کو ہاتھ ہلانے کا بھی ہوش نہ تھا۔ ایک جوار بھاٹا تھا جس میں پتھر لڑھکنے کے بجائے موتی رُل رہے تھے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی شخصیت بڑی ہی جاذب نظر تھی، دراز قد، چوڑا چکلا سینہ۔ سرخ و سپید رنگ۔ مزاج میں شگفتگی، طبیعت میں سادگی، زبان میں فصاحت، گفتار میں مٹھاس، متقی اور پرہیز گار، قائداعظم کے دستِ راست، مختصر یہ کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ سچ پوچھئے تو جو گناہ دکن کی سرزمین نے میر صادق کو جنم دے کر اپنے سر لیا تھا اس کی تلافی اس نے نواب بہادر یار جنگ جیسے مجاہد کی شکل میں کر دی تھی۔

(حوالہ: تحریکِ علیگڈھ اور حیدرآباد دکن، دارالادب پاکستان کراچی ص ۳۵، ۳۶ — از مولوی حسام الدین خاں غوری مرحوم)

قائد ملت کو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے غیر معمولی دلچسپی رہی، کیوں کہ وہ علیگڈھ یونیورسٹی کے طلبہ کے مقاصد کو جلیل اور عزائم کو بلند سے بلند دیکھنا چاہتے تھے اور انہیں اس یونیورسٹی کی ترقی میں کما حقہ اپنا حق اور حصّہ ادا کرنے کی فکر دامن گیر رہتی۔

جس وقت ۱۹۲۹ء میں علیگڈھ اولڈ بوائیز ایسوسی ایشن کے ڈنر میں ملٹری

کالج کے قیام کی تجویز پیش ہوئی تو قائد ملت نے اس تحریک کی بھرپور تائید کرتے ہوئے اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہوئے فرمایا تھا:-

" ملٹری کالج کے قیام کی ضرورت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے میں اس سے بالکل متفق ہوں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ ہر مسلمان فطرتاً سپاہی ہوتا ہے، کلمہ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں ایک عجیب اثر ہے جو اس کے پڑھتے ہی انسان کی نگاہ تمام طاقتوں سے ہٹ کر ایک مرکز الوہیت پر جم جاتی ہے، اس میں ایک ایسی جرأت اخلاقی پیدا ہو جاتی ہے جس کو کوئی دوسری تعلیم پیدا نہیں کر سکتی ۔ مسلمان میں روح عسکریت آج بھی موجود ہے لیکن مواقع کا فقدان اور تربیت کی کمی اس کو زائل کر جا رہی ہے، سخت ضرورت ہے کہ ایک ایسا کارخانہ ملٹری کالج کے نام سے قائم کیا جائے جس میں ان ہیروں کی تراش ہو اور جلا دیکر ان کو دنیا کی ٹکسال کے قابل بنایا جا سکے تاکہ ان کی جوت سے دنیا والوں کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر چندھیا جائیں۔ میں حیدرآباد کے مسلمانوں کی طرف سے یہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر ایسی تحریک شروع کی گئی تو حیدرآباد انشاء اللہ حسب روایات اس کی امداد اور سرپرستی میں سب سے آگے رہے گا۔

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا مستقبل انکی خواہش کے آئینے میں کتنا عظیم تھا:-

" میں تو مسلم یونیورسٹی کو دنیا کی اور تمام درسگاہوں سے ممتاز اور اس درسگاہ کا پَرتو دیکھنا چاہتا ہوں جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے مدینہ کی پھونس کی بنی ہوئی مسجد میں قائم ہوئی تھی اور جس کے تعلیم پانیوالوں نے بیس برس کے اندر دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا اور عرب کے بادیہ گردوں کو دنیا کا معلم اخلاق و سیاستداں بنا دیا تھا اور اپنی طاقت و جبروت سے گنگا و جمنا کی لہروں کو بحر الکاہل کی موجوں سے ملا دیا تھا۔"

(حوالہ :- تقریر قائد ملت بعنوان مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، مشمولہ بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقاریر - مرتبہ نذیر الدین احمد - ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد)

مسلم لیگ کا اجلاس لاہور

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

"۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کا دن خاکسار تحریک کے لئے انتہائی المناک تھا لاہور کی زمین میں خاکساروں کو سر سکندر حیات خاں کی حکومت نے گولیوں کا نشانہ بنایا۔

خاکسار سر سکندر کی حکومت سے دل برداشتہ تھے، اس دن خاکساروں نے حکومتِ وقت سے ٹکر لینے کی ٹھانی تھی، گولیوں کی بارش سے متعدد خاکسار جاں بحق ہو گئے، لیکن انہوں نے بھی اپنے بیلچوں ہی سے سرکاری فوج کی خوب خبر لی، پولس والوں کے سر قلم کر دیئے۔ ایس، پی جائے وقوع پر زخموں سے چور ہو گیا اور جانبر نہ ہو سکا، لاہور میں ایک کھلبلی مچ گئی ایک ہیجان برپا ہو گیا، سیاسی ابتری پھیل گئی اور سر سکندر کی وزارت انتشار اور لاقانونیت کا شکار ہو گئی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا بہت ہی اہم اجلاس لاہور میں منعقد ہونے والا تھا، چوں کہ امن و امان خطرے سے ہمکنار تھا، سر سکندر کی وزارت نے مسٹر جناح سے استدعا کی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو منعقد ہونے والا ہے اسے ملتوی کر دیا جائے۔

(حوالہ: نواب بہادر یار جنگ ایک نفسیاتی جائزہ، از محمد انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ)

لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کی اس سے قبل بھی کوششیں باآور نہ ہوسکیں۔ اس خصوص میں "سب سے پہلے زیادہ پرزور کوشش علامہ اقبال نے کی تھی، انہوں نے ۱۹۳۷ء میں اجلاس لکھنؤ سے پہلے اور پھر اس کے بعد قائداعظم کو بار بار توجہ دلائی تھی کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کیا جائے[۱]۔ بتاریخ ۳ر مارچ ۳۸ء قائداعظم نے جب ان سے دریافت فرمایا کہ آیا لیگ کا جلسہ لاہور میں کرنا چاہیئے تو علامہ نے اس تجویز کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا، لیکن پنجاب کا برسر اقتدار ٹولہ یعنی یونینسٹ پارٹی اور سر سکندر حیات خاں وزیر اعلیٰ پنجاب نہیں چاہتے تھے کہ لیگ کا سالانہ جلسہ لاہور میں ہو، چنانچہ ایک سازش کے ذریعہ اس اجلاس کو ملتوی کر دیا گیا[۲]۔

اب پھر قائداعظم اور مسلم لیگ کونسل نے یہ اعلان کیا تھا کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوگا، چنانچہ اس اجلاس کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہوگئیں اور مندوبین کے نام دعوت نامے بھی جاری ہوگئے، عین اس زمانے میں جبکہ اجلاس کے انعقاد میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے۔ اگرچہ لاہور کی پوری فضا شعلہ فشاں بن گئی۔ ان حالات میں سب سے زیادہ تشویش اور پریشانی مسلم لیگ کے کارکنوں کو لاحق ہوئی کہ اب کیا ہوگا؟۔

---

[۱] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ شائع کردہ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۲، ۲۴۔

[۲] اقبال کے آخری دو سال، مصنفہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، شائع کردہ اقبال اکیڈیمی کراچی، مطبوعہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۶۱۳ - ۶۱۶۔

اجلاس میں گنتی کے چند دن باقی رہ گئے تھے، اس نازک صورتحال میں قائد اعظم کی نظریں اس نازک مسئلہ کے حل کے لئے قائد ملت کی جانب اٹھیں، قائد اعظم نے بذریعہ تار، قائد ملت کو فوری طلب فرمایا، اب بہادر یار جنگ کی زبانی مکمل کہانی سنئے۔

"ایک روز میں سوکر اٹھا تو ڈاکیہ نے ایک ہی وقت میں دو تار لاکر دیئے، دیکھا تو ایک تار قائد اعظم کا تھا اور دوسرا علامہ مشرقی کا! دونوں میں طلبی کا حکم تھا، دونوں تار دہلی سے آئے تھے، میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے فوراً بستر باندھا اور قائد اعظم کی خدمت میں دہلی حاضر ہوگیا، مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، خیر وعافیت پوچھی، پھر انہوں نے کچھ نہ کہا، بس میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھما دیا، دیکھا تو یہ ایک پیغام تھا، سر سکندر کا قائد اعظم کے نام کہ اجلاس لاہور ملتوی کر دیا جائے۔ میں نے جب اس کو پڑھ لیا تو قائد نے فرمایا کہ لاہور کا یہ اجلاس اہم ہے، اس کا اعلان ہوچکا ہے (DELEGATES ......) کے نام دعوت نامے جاری کئے جاچکے ہیں، مگر صورتِ حال بہت نازک ہے، لیگ کے ایک گروپ کا خیال ہے کہ ان حالات میں اجلاس ملتوی کر دیا جائے اور دوسرے کی رائے ہے کہ اجلاس ضرور ہو، میں تمہاری رائے سننا چاہتا ہوں کیوں کہ تمہارا تعلق دونوں تنظیموں (یعنی مسلم لیگ اور خاکسار) سے ہے، میں نے دو منٹ خاموشی اختیار کی اور اس کے بعد عرض کیا، قائد اعظم مسلم لیگ کا اجلاس اس سال مقررہ وقت پر لاہور ہی میں ہوگا، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے دل میں بھی یہی خواہش ہے، انشاءاللہ آپ کی یہ خواہش پوری ہوگی، آپ لاہور تشریف لے چلیں، میں ہمرکاب ہوں، میری آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ آپ جلوس کی شکل میں لاہور اسٹیشن سے شہر روانہ نہ ہوں، باقی تمام معاملات کی ذمہ داری مجھ پر ہے، میری باتیں سن کر قائد اعظم کا چہرہ کھل اٹھا، انہوں

نے میری اس درخواست کو شرف پذیرائی بخشا، مسلم لیگ کے تمام سربرآوردہ قائدین اور کارکنوں کے نام تار روانہ کیئے گئے کہ اجلاس لاہور ہی میں ہوگا اور وقت مقررہ پر ہوگا، دوسرے ہی دن قائداعظم نے رخت سفر باندھا، میں ان کے ساتھ تھا، راستہ میں جگہ جگہ اسٹیشنوں پر قائداعظم کا بے مثال استقبال ہوا، لاہور پہنچنے کے بعد قائداعظم اسٹیشن کے پچھلے دروازے سے اپنی قیام گاہ کو روانہ ہوگئے اور میں ان کے ہی کمپارٹمنٹ سے لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اتر پڑا۔ لوگوں کے اژدہام نے مجھے گھیر لیا، سب کی نگاہیں قائداعظم کو تلاش کر رہی تھیں، وہ انہیں جلوس کی شکل میں لے جانا چاہتے تھے، قائداعظم زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے میں نے لوگوں کو سمجھا بجھا کر لوٹا دیا۔

قیام دہلی کے دوران خاکساروں کے سالار سے مل چکا تھا اور انہیں یہ ہدایت کی تھی کہ محاذ لاہور کے انچارج سالار کے نام یہ حکم بھیجا جائے کہ وہ معہ اپنے رفقاء کے مجھ سے لاہور ہی میں ملیں، لاہور پہنچنے کے بعد میں نے ان کا انتظار نہ کیا بلکہ اسی دن خود ہی ان سے ملا، صورتِ حال پر گفتگو کی، پھر میں نے خاکساروں کے مختلف حلقوں میں گشت لگائی۔ ان کو سکندر کی حکومت کے خلاف آتش غضب میں ڈوبا ہوا پایا، لوٹ کر قائد کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ بنفس نفیس ہسپتال چلیں اور ان خاکساروں کی عیادت کریں جو اس ہنگامہ میں زخمی ہوگئے تھے، قائداعظم نے میری اس درخواست کو بھی درخور اعتنا سمجھا۔ اور دوسرے دن اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ہسپتال تشریف لے گئے، زخمیوں کے مزاج پرسی کی، انہیں دلاسا دیا اور پھر یہ اعلان فرمایا کہ مسلم لیگ کی تمام ہمدردیاں خاکساروں کے ساتھ ہیں، اس سے خاکساروں کے غصہ کی آگ کچھ ٹھنڈی پڑی، پھر بھی اشتعال باقی تھا، انہوں نے لاہور کی گلی کوچوں میں اپنے

مورچے بنا رکھے تھے اور سکندر کی حکومت سے ٹکر لینا چاہتے تھے، اب میں نے لاہور کے کوچہ د بازار کی گشت شروع کی، ایک ایک کونہ چھان مارا، خاکساروں کے تمام مورچوں پر گیا، ان کے سالاروں سے گفتگو کی، ان کے دستوں کے سامنے تقریریں کیں، وقت کی نزاکت کا احساس دلایا، اور پرامن رہنے کی تلقین کی، الحمدللہ کہ میری ان کوششوں کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا کیوں کہ وہ مجھے اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے، میری "خاکساری" اس وقت کام آئی اور میری گذارشوں کی انہوں نے حکم سمجھ کر تعمیل کی، اس طرح اشتعال ختم ہوا، فضا بدل گئی اور ماحول سازگار ہوگیا۔

خاکسار محاذ کو اس طرح ٹھیک ٹھاک کرنے کی بعد میں سر سکندر کے کیمپ گیا، وہاں کے ماحول میں سخت کشیدگی اور کبیدگی محسوس ہوئی، میں نے مناسب سمجھا کہ راست سر سکندر سے مل لیا جائے، رات کا وقت تھا لیکن وہ بلا تامل ملاقات پر آمادہ ہو گئے، پھر بڑی محبت سے ملے، باتیں بہت کچھ ہوئیں، کچھ گلے، کچھ شکوے، مگر زیادہ تر وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے رہے، اٹھتے وقت میں نے ان سے کہا کہ کل کے اجلاس میں آپ کی عدمِ شرکت سے کچھ اچھا تاثر پیدا نہ ہوگا۔ آپ شریک ہوں گے اور ضرور شریک ہوں گے، وہ کبیدہ خاطر تو تھے ہی، یہ سن کر کچھ سٹپٹائے کچھ تامل کیا میں تاڑ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور ان کے دل میں کیا کیا اندیشے اور کون کون سے وسوسے ہیں، اس لئے ان کا جواب سننے سے پہلے ہی میں نے ان سے کہہ دیا، سر سکندر! مجھے جواب میں کچھ سننا نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، بس یہ سن لیجئے کہ آپ کل کے اجلاس میں شریک ہوں گے کوئی آپ کا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ آپ کو صرف گزند اسی وقت پہنچے گا جب بہادر خاں کے سینہ سے گولی پار ہو جائے گی، سلام علیکم! میں نے مصافحہ کیا اور وہاں سے سیدھا قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ساری روئیداد

کہہ سنائی، انہوں نے اٹھ کر میری پیٹھ ٹھونکی[1]۔

سیاسی پسِ منظر: پٹنہ میں کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۳۸ء میں ہوا تھا، اس کے تقریباً پندرہ مہینے بعد یعنی مارچ ۴۰ء میں مسلم لیگ کا تاریخ ساز اجلاس لاہور میں منعقد ہوا، اس سوا سال کی مدت میں سیاسی حالات کافی تیزی سے بدلتے رہے، سب سے بڑا اور اہم واقعہ تو یہ ہوا کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی، جس میں برطانوی حکومت براہ راست ملوث تھی، قانون دستور حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے ایک جزء یعنی صوبائی خود مختاری کا نفاذ اس جنگ کے چھڑ جانے سے قبل ہی ہو چکا تھا اور اب اس صوبائی خود مختاری کے تحت ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریسی وزارتیں کام کر رہی تھیں، مسلمانوں کو ان وزارتوں کی "کارگذاریوں" کے تلخ تجربات ہو رہے تھے، کانگریس نے جو سبز باغ دکھائے تھے، ان کی دھوپ چھاؤں سے ہندو صوبوں کی مسلم اقلیت گذر رہی تھی، مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی اس نے سازشوں کے جو جال پھیلائے تھے، ان کا ایک ایک تار واضح طور پر نظر آنے لگا تھا، یوں ۱۹۳۵ء کے دستور میں مسلمانوں کو جو تحفظات عطا کیے گئے تھے، وہ محض سراب ہی ثابت ہو رہے تھے یہ تو اس دستور کے صرف ایک جزء صوبائی خود مختار کے حسین خد و خال کا حال تھا، اس کے دوسرے جزء "وفاق" کے نقش و نگار کی رعنائی ابھی دیدنی تھی ــــ! اجلاس پٹنہ کے بعد ہی سے مسلم قیادت کا ذہن بدلنے لگا تھا، جس کا اظہار اس قرارداد سے ہوتا ہے جو متبادل دستوری اسکیم کی تدوین کے سلسلہ میں، اسی اجلاس میں منظور کی گئی تھی، صوبائی خود مختاری کے تحت کانگریسی وزارتوں کے

---

[1] یہ روئیداد راقم الحروف نے بہادر یار جنگ کی زبانی اجلاس لاہور سے حیدر آباد واپس ہونے کے بعد سنی تھی، مفہوم من و عن ان کا ہے، الفاظ میرے ہیں۔ محمد احمد خاں۔

کردار اور کل ہند کانگریس کے کرتوت سے مسلمانوں کے دل و دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا، اس طرح مسلم عوام اور قائدین تحفظات کے خوش نما جال سے نکلنے کیلئے پر تول رہے تھے! یہ حالات تھے جب کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی ہائی کمان نے سالانہ اجلاس لاہور میں طلب کر لیا، سیاست کے پیچ و خم کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ جناح کا ذہن اب کسی اور سمت میں کام کرنے لگا ہے۔ وہی سمت جس کی طرف شاعر مشرق نے اشارہ کیا تھا اور جس کے متعلق انہوں نے قائد کاروان ملت سے بار بار سرگوشیاں کی تھیں۔ دور بینوں نے بھانپ لیا تھا کہ قائد اب کسی لمحہ بھی ایک انقلابی اعلان کر ڈالے گا اور اس اعلان کے لئے سب سے زیادہ موزوں و مناسب مقام لاہور ہی ہو سکتا ہے، جو کبھی مغلیہ سلطنت کا دہلی کے بعد دوسرا دارالسلطنت رہ چکا تھا اور جو ابھی تک مسلم ثقافت و تہذیب کا نمائندہ شہر، پرجوش و فعال مسلمانوں کے صوبے کا صدر مقام اور مسلمانان برّصغیر کی سیاست کا مرکز اعصاب (NERVE CNTRE) اس طرح "مسلم لیگ کا اجلاس لاہور تاریخ و وقت مقررہ یعنی ۲۲ رمارچ ۱۹۴۰ء جمعہ ڈھائی بجے دن شروع ہوا، منٹو پارک حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لوگوں نے حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھا کہ جلسہ گاہ کے ڈائس پر سر سکندر حیات خاں موجود ہیں اور ان کے برابر بہادر یار جنگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

لاہور کے اجلاس عام میں قرارداد پاکستان پیش فضل الحق نے کی، تائید چودھری خلیق الزماں نے کی، تائید مزید دیگر صوبوں کے قائدین نے کی، تقریریں مدلّل بھی ہوئیں اور پرجوش بھی، طویل بھی ہوئیں اور مختصر بھی، آخر میں باری اس کی آئی جو اس ہنگامہ خیز اور معرکۃ الآرا اجلاس کی روح تھا، قائد ملت بہادر یار جنگ نے قرارداد پاکستان پر اس اجلاس میں جو

تقریر کی اس کا نقش آج بھی سننے والوں کے دلوں پر تازہ اور ان کی وہ آواز آج بھی ان لوگوں کے کانوں میں گونج رہی ہے"

(حوالہ: مسلم لیگ کا اجلاس لاہور اور بہادر یار جنگ کا تاریخ ساز کردار از جناب محمد احمد خاں صاحب، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔)

لاہور کا اجلاس شاندار کامیاب ثابت ہوا، قائد اعظم نے مسلمانوں کے نصب العین کا اعلان کیا اور نواب صاحب قائد اعظم کے ترجمان بنے، اس کے بعد تحریک پاکستان کی حمایت میں بہادر یار جنگ کی آواز ملک کے طول و عرض میں گونجی، مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور جنوبی ہند کی پستیوں نے بھی، دریائے سندھ کی لہروں نے بھی اور جمنا کی موجوں نے بھی"مسلمان[1] تیشۂ لَاالٰہ الاّ اللہ کو لیکر فاران کی وادی سے اٹھا، ایک طرف امارت کی عمارتوں کو ڈھا دیا، دوسری طرف غربت کے غاروں کو بھر دیا اور تمام اقصائے عالم کی سطح کو مسطح کر دیا۔ وہ بڑھا تو پہاڑیوں کی بلندیوں، فضا کی پنہائیوں اور میدانوں کی وسعتوں کو خاطر ہی میں نہ لایا، ایک طرف بحرالکاہل اور دوسری طرف بحراوقیانوس کے پانی سے وضو کیا، بحر منجمد شمالی کے برفانی علاقوں میں فاتحانہ نیزے گاڑ دیئے اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں پرچم ہلالی کو لہرا دیا۔

مرد میدان بڑھے، کبھی پہاڑوں پر چڑھے، کبھی میدانوں میں اترے یہاں تک کہ پہاڑ غار بن گئے اور میدان گڑھے ہوکر رہ گئے، ان میں ایک گڑھا ہندوستان تھا، جس کے کم از کم ایک حصّہ کا ہموار کرنا اب ہمارا کام ہے" (حوالہ: ملّت کا ایک درخشاں ستارہ، از محترم سیّد شریف الدین پیرزادہ، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، کراچی)

میری اور مسلمانانِ پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ۲۷ ریں سالانہ اجلاس کے موقع پر وہ لاہور میں مارچ ۱۹۴۰ء میں تشریف

---

[1] بہادر یار جنگ کی تقریر مشمولہ۔

لائے۔ میں کبھی نہ بھولوں گا وہ شام جب مسلم لیگ کے اجلاس کا خاتمہ نواب صاحب بہادر کی تقریر پر ہوا، مجلس استقبالیہ کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے میں ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، کان ان کی دلکش آواز پر لگے ہوئے تھے، آنکھیں ان کے پر جلال چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں، دل میں ان کے کلام کا ایک ایک لفظ اتر رہا تھا، مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ گویا آغاز اسلام کے زمانہ کی کوئی محبوب ہستی ہمارے سامنے آگئی ہے، جس میں قوت کے ساتھ محبت اپنا کام کر رہی ہے اور صرف مجھ ہی پر اتنا اثر نہیں ہوا بلکہ اس ہزارہا اشخاص کے مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس حیرت انگیز مقرر کی تقریر کو دل کے کانوں سے بغور نہ سُن رہا ہو، پنڈال میں کامل خاموشی طاری تھی، سارے اسلامی ہندوستان کے نمائندے ایک پرخلوص، پرجوش، بلند خیال، بلند قامت مسلمان کے سامنے زانوے ادب تہہ کئے ہوئے بیٹھے تھے، اسلام کی ایک تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔

(حوالہ آفتاب دکن از حمیداللہ خاں شیدا، حیدرآباد)

صاحب طرز انشا پرداز میاں بشیر احمد ہمایوں کے یہ مختصر اور سرسری تاثرات ایک پیام کے زیر عنوان تھے۔ جب لاہور کے اجلاس پر میاں بشیر احمد نے اس محفل اخوت و محبت کے ساقی اور مطرب خوش نوا پر قلم اٹھایا تو حشر تک کے لئے وہ رات باقی رہ گئی، وہ رات جو زبان خاموش سے آج بھی یہی کہتی ہے ؎

رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر رات باقی ہے

"کبھی بھول سکتا ہوں میں وہ رات؟ جب نصف صدی کی آرام پسند تاریک زندگی بسر کر لینے کے بعد اس تاریکی میں مجھے ایک روشنی دکھائی دی، پل کی پل، بجلی کی سی چمک، خاموش خواب آور اندھیرے میں ایک بیدار کن

روح پرور چاندنا! اس رات میں نے جس محبوب کو دل دیا وہ کوئی پری جمال نہ تھا کوئی گل عذار نہ تھا، ایک جھریاں پڑے چہرے میں مجھے ذرا سی تازگی کی جھلک دکھائی دی جس نے میرا دل موہ لیا، کئی صدیاں اس پر گذر چکی تھیں، تیرہ صدیاں لیکن اس رات مجھے عنفوان شباب کی ایک جھلک سی دکھائی دی اس میں، اور میں نے خدا جانے تھوڑی یا زیادہ دیر کے لئے اپنا دل دے دیا ....
.... اس میں میں نے محبوبیت کی ذرا سی شان دیکھی اس رات ۔ اس رات کا کچھ نشہ اب تک باقی ہے ۔

اس محفل اخوت و محبت کا ایک ساقی تھا ایک مطرب! دو دن ہوئے روز روشن میں ساقی نے "مئے باقی" پلائی متواتر تین گھنٹے یہ دور چلا اور آج رات مطرب خوش نوا نے ایک گیت گایا "تازہ بہ تازہ، نو بہ نو" ایک گھنٹہ پچپن منٹ! ساقی و مطرب کی یہ ہم نوائی نئی بوتل میں پرانی شراب ظہور کی جلوہ نمائی تھی، ایک مضمحل قوم کا کہن سال لیکن تازہ دم قائد، اس کی دلنواز پکار پر ایک مرد بہادر کی لبیک جسے ایک لاکھ انسانوں نے سنا، اور اس طرح دل کے کانوں سے سنا کہ آنکھیں کہتی تھیں " دیکھو دیکھو، کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں"۔ تیار بیٹھے ہیں! چلنے کو تیار لیکن کہاں؟ اس نئی جانی پہچانی سرزمین کو جس کا قائد نے نام لیا، ملکوں کی محفل میں ایک نووارد و نوزائیدہ پاک بستی! اور اب اس مرد بہادر نے چند اشاروں میں چلنے والوں کو سمجھا دیا کہ رستے پر ان کے قدم کیسے پڑے کہ وہ موعودہ سرزمین محض کہنے کو نہیں بلکہ ہر لحاظ سے واقعی پاک وصاف بن کر نظر آئے ۔

ایک لاکھ آدمیوں کے مجمع میں ایک وجیہہ بلند قامت تنومند جوان کھڑے ہے، کھدر کا سادہ لباس مختصر سیاہ بال پکار رہا ہے، دائیں بائیں پکار رہا ہے! اس کے لفظوں کی پرزور دلکشی، اس کے چہرے کی ہلکی مسکراہٹ، اسکی آنکھوں کی بولتی شیرینی آج رات اس محفل پر چھا رہی ہے، تیرتی پھرتی ہے، جا بجا

دلوں میں اتر رہی ہے، اس کی زبان ایک ایسے دل کی ترجمان ہے جو قربانی دینے والی محبت کا بے باک علمبردار ہے، دولت میں پل کر دولت سے بے نیاز، خدمت کا پروانہ ایک سچّا بہادر یارِ ملّت، آج کی رات ایک لاکھ آنکھوں کا مطمحِ نظر!

اپنی قوم سے محبت ہے اور کسی اور سے نفرت نہیں بلکہ اس قوم کی محبت نوعِ انساں کی خدمت پر مجبور کرتی ہے کہتی ہے کہ اسلام وہ نہیں کہ محض مسلمان کے مفاد کے لئے وقف ہو، خدا مسلم و غیر مسلم سب کا خدا ہے! یہ کہا بہادر نے اور سوتے جاگتے مسلمانوں کو یہ کہہ کر جگایا اور سمجھایا کہ تم سچّے انسان نہ بنو گے جب تک پہلے سچے مسلمان نہ ہو لو، ان لوگوں کا ایک ذرا سا نمونہ جنہوں نے آج سے تیرہ صدیاں پہلے ایک غلام دنیا کو اسلام کی سچی روحانی اشتراکیت کا پیغام دیا تھا، اسلام جس نے غریب امیر کے فرق کو خوش اسلوبی سے کم کیا، اسلام جس نے بڑے چھوٹے کے امتیاز کو نیکی کی کسوٹی پر پرکھا، جس نے روح میں ایمان کی لو لگا دی، رواداری کو ایمان کا جزو بنا دیا، اسلام جس نے امیوں کے ہاتھ میں علم کی مشعل دے دی اور کہہ دیا کہ جاؤ اور محبت سے مسخر کر لو دنیا بھر کے دِلوں کو!

"مردِ میدان بڑھے کبھی پہاڑوں پر چڑھے، کبھی میدانوں میں اترے، یہاں تک کہ پہاڑ غار بن گئے اور میدان گڑھے ہو کر رہ گئے، ان میں ایک گڑھا ہندوستان تھا جس کے کم از کم ایک حصّے کا ہموار کرنا اب ہمارا کام ہے۔"

مجھے کچھ یاد نہیں بہادر نے کیا کہا، میرے ٹوٹے پھوٹے جملے کیا بتا سکتے ہیں، اس کے لفظ سوئے ہوئے دلوں کے لئے انگارے تھے، کیا میرا آرام پسند دِل ہی آخر وہاں سے بچ نکلا، محض یہ کہانی سنانے کے لئے؟ مانا کہ میں پھر مصروف ہو جاؤں گا، اپنے بے مصرف کاموں میں، پھر بیٹھ جاؤں گا اپنی میز پر قلم سنبھالے ہوئے لیکن یقیناً یاد کر اٹھوں گا، کبھی کبھی اس لمبی لیکن مختصر شیریں رات کو جب ایک نیک دل کی پکار سن کر میرا بھی جی چاہا کہ اٹھوں اور

کہوں کہ لے میں پھر ایمان لاتا ہوں تیرے ہاتھ پر، ایسا ہوتا ہے لاکھوں کو ایک نئی زندگی بخشنے والا دلیر انسان!

(حوالہ: تازہ بہ تازہ نو بہ نو از میاں بشیر احمد مرحوم و مغفور بیرسٹر ایٹ لا، ایڈیٹر ہمایوں، سابق رکن مجلس عاملہ لیگ، سفیر ترکی، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما مولانا عبدالحامد بدایونی (مرحوم) سے جب حافظ محمد اسلام نے یہ سوال کیا کہ ۱۹۴۰ء کے موقعہ پر پیش آنے والا کوئی واقعہ سنائیے جس نے آپ کو متاثر کیا ہو اور اب تک آپ کو یاد ہو۔

جواباً مولانا نے ارشاد فرمایا:

"اجلاس لاہور کی دو باتیں ایسی ہیں جس نے مجھے بڑا متاثر کیا، اوّل مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنماؤں کا جذبہ ایثار و قربانی، دوم نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی وہ یادگار تقریر جس نے خواص و عوام میں جدوجہد کے لئے ایسا جذبہ ابھارا کہ چند مہینوں میں ہندوستان کا گوشہ گوشہ قیامِ پاکستان کے مطالبہ سے گونج اٹھا"۔

(حوالہ: روزنامہ جنگ، استقلال پاکستان ایڈیشن ۱۹۶۸ء)

"اس موقعہ پر (اجلاس مسلم لیگ لاہور) نواب بہادر یار جنگ نے جو تقریر کی وہ فن خطابت کا ایک اچھوتا اور نادر نمونہ تھی، ان کی تقریر زخمی دلوں کے لئے مرہم اور نسخہ شفا کا کام کر گئی۔ جذبات کے دہکتے ہوئے انگارے باد سحر کے ایک ہی جھونکے سے لہلہاتے گلزاروں میں تبدیل ہو گئے، کشیدگی اور نفرتوں کے بادل چھٹ گئے، فضا میں محبت اور شائستگی عود کر آئی"۔

(حوالہ: نواب بہادر یار جنگ از قاضی عبدالرؤف، نوائے وقت ۲۵ رجون ۱۹۸۲ء)

قائداعظم نے اس موقعہ پر" بہادر یار جنگ کا تعارف کروایا کہ

اعلیٰ حضرت حضور نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ نواب صاحب کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں ہے، لیکن بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین اور رہبر ثابت ہو چکے ہیں، نواب صاحب نے مسلمانان حیدرآباد کی تنظیم میں اپنی جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہ سب کے لئے باعثِ فخر و مسرّت ہے۔ میں ان سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ آپ سے مخاطب کریں"۔ (حوالہ: روزنامہ رہبرِ دکن حیدرآباد دکن ۳۰ رمارچ ۱۹۴۰ء)

اب بہادر یار جنگ تقریر کریں گے:

اس اعلان کے ساتھ ہی ایک دم جیسے مجمع کو سانپ سونگھ گیا، قدآور بہادر یار جنگ ڈایس پر آئے، اپنے نطق معجز اثر سے پردہ سکوت کو چاک کیا، بولنا شروع کیا اور بولتے چلے گئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیشہ کا بولتا، گونجتا، گرجتا لاہور ایکدم گونگا ہوگیا ہے۔ مسلسل سات گھنٹے تک بولنے کے بعد جب بہادر یار جنگ مائیکرافون سے ہٹ گئے، اور منتظمین جلسہ نے قائداعظم سے درخواست کی کہ اب ہم آپ کی مخاطبت کے لئے بے چین ہیں تو قائداعظم اٹھ کھڑے ہوئے، میکرافون کے سامنے آئے اور صرف یہ جملہ کہہ کر بیٹھ گئے:"

"بہادر یار جنگ کے بعد کسی کا بولنا غلطی ہے"

(حوالہ:۔ پاکستان زندہ باد از ابراہیم جلیس، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، کراچی)

مسلم لیگ کا اجلاس مدراس

اپریل ۱۹۴۱ء

آصف سابع میر عثمان علی خاں والی ریاست حیدر آباد کی ماں بڑی بیگم صاحبہ کا اپریل ۱۹۴۱ء میں انتقال ہوا اور اس خصوص میں معززین شہر کی جانب سے ٹاؤن ہال میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ نواب صاحب ان دنوں مدراس میں مسلم لیگ کے اجلاس میں مصروف تھے اور شریک جنازہ نہ ہو سکے۔ اس تعزیتی جلسے میں اپنی عدم شرکت جنازہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں جنازہ کو کاندھا دینے کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ میں کل ہی واپس آیا اور آج اس تعزیتی جلسہ میں شرکت کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

(حوالہ: تقریر بعنوان مادرِ دکن ص ۶۱ - بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقریریں، مرتبہ نذیر الدین احمد)

شہر مدراس میں منعقدہ اجلاس مسلم لیگ کے موقعہ پر ٹامل زبان بولنے والے مسلمانوں کی اردو سے ناواقفیت پر نواب صاحب بہت دلگیر ہوئے، کیوں کہ۔۔۔ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں ربط اخوت کو مضبوط بنانے کے لئے رابطہ لسانی کا مسئلہ بھی بہت اہم تھا، اس خصوص میں قائد ملت نے اجلاس مدراس کے سلسلے میں اس اہم مسئلہ پر اپنے ایک خط میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ مدراس سے ایک سہ روزہ اخبار "اخبار دکن" کے نام سے نکال رہے ہیں۔ مجھے دکن سے محبت رہی ہے اور دکن سے محبت رہے گی۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ جنوبی ہند میں احیار زبان اردو کے مقصد میں پوری پوری طرح کامیاب ہوں۔ ترقی اردو کی کوشش شمال میں اتنی ضروری نہیں ہے، انتہائی جنوب میں ضروری ہے، جنوبی ہند کے مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں سے اپنے رابطۂ داخوت کو اس وقت تک مضبوط نہیں بنا سکتے جب تک یہ رابطہ لسانی نہ ہو، مسلم لیگ کے گذشتہ اجلاس میں شامل جاننے والے مسلمانوں کی اردو سے ناواقفیت پر رونے کو جی چاہتا ہے۔"

(حوالہ: خط بنام اختر قریشی ایڈیٹر اخبار دکن مؤرخہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۱ء ص ۱۸۹، مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی)

قطع نظر ان دو جزدی باتوں کے اہم اور قابل تذکرہ یہ بات بھی ہے کہ اجلاس مسلم لیگ مدراس کے تاریخی اجلاس میں "قرارداد پاکستان کو لیگ کے اغراض و مقاصد میں داخل کر لیا گیا۔ یہ تحریک دوسرا اہم سیاسی قدم تھا، پیر علی محمد راشدی صاحب اور دوسرے شرکار شاہد ہیں کہ لیگی زعمار میں اس مسئلہ پر سخت انتشار و خلفشار برپا تھا اسی حالت میں اگر یہ تحریک اجلاس میں آتی تو کبھی بھی پاس نہ ہو سکتی۔ وہ تو یہ ہوا کہ ساری رات نواب بہادر یار جنگ نہ خود سوئے نہ ان لوگوں کو سونے دیا۔ فرداً فرداً گفتگو کر کے ذہنی تلاطم میں ایسا سکون پیدا کر دیا کہ صبح جب یہ تحریک اجلاس میں پیش ہوئی تو بہ غلبہ آرار آسانی سے پاس ہو گئی، بہادر یار جنگ کی ان ہی مدبرانہ مساعی کو دیکھ کر مسلمانوں نے اسی اجلاس میں ان کو قائد ملت کا خطاب عطا کیا۔"

(حوالہ: مضمون شائع شدہ در اخبار نوائے وقت ۲۵ر جون ۱۹۸۶ء)

اجلاس مسلم لیگ الہ آباد

اپریل ۱۹۴۲ء

الہ آباد کے اجلاس کی روئیداد بھی شرکاء اجلاس ہی کے مضامین میں ظاہر کردہ تاثرات سے تکمیل پاتی ہے

الہ آباد کا اجلاس لیگ

"اپریل ۱۹۴۲ء الہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا، سر اسٹیفرڈ کرپس اپنی مشہور اسکیم لے کر ہندوستان آئے تھے اور اس پر غور کرنے اور پاکستان کے مطالبے کا پرزور اعادہ کرنے کی غرض سے یہ اجلاس طلب کیا تھا، قائداعظم نے اس موقعہ پر بڑا پرجوش اور مدلل خطبۂ صدارت فی البدیہہ پڑھا اور حسب معمول اس کا ترجمہ بھی نواب صاحب نے کیا، آخری اجلاس میں چندے کی اپیل کی گئی، ایک شخص نے تلوار پیش کی، آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں اس کا نیلام شروع کر دیا۔ پندرہ منٹ میں اکتالیس ہزار کا اعلان ہوگیا، قائداعظم نے مداخلت کرتے ہوئے چندے کی اس بوچھار کو روک دیا کہ بغیر رسید اس طرح روپے کی بارش میرے مسلک کے خلاف ہے، اس وقت ان کی تقریر کا اتنا اثر تھا کہ لوگ اس پر آمادہ تھے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے سب نچھاور کر جائیں۔ الہ آباد کی تقریر کراچی کے اجلاس کے علاوہ سب سے بہتر خیال کی جاتی ہے" ——— (حوالہ: حیدرآباد کا ٹیپو، از عبدالوحید خاں صاحب ص ۲۲۳، بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، ناشر: بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

"۱۹۴۲ء میں الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں، میں نے بہادر یار جنگ کی تقریر سنی ۔ میں نے نواب صاحب کو سنا تو مسحور ہو کر رہ گیا نواب صاحب عوام کے لئے قائداعظم کے انگریزی صدارتی خطبے کا ترجمہ کرتے ہوئے اور اپنے انداز میں برعظیم کے سیاسی حالات اور سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز پر تبصرہ کر رہے تھے ۔

دوسرے دن الٰہ آباد کے ایک مسلم لیگی لیڈر کے گھر رات کھانے کی دعوت تھی، قائداعظم اور بہادر یار جنگ اور دوسرے رہنما دعوت میں شریک تھے، وہاں میں نے نواب صاحب کو دیکھا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے، ان کی طرف لپکا، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اس مصافحے میں وہ لذت محسوس کر رہا تھا جو میرا پوتا مجھ سے ہاتھ ملا کر محسوس کر سکتا ہے نواب صاحب ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک دیو تھے، میں نے انہیں گذشتہ رات کی شاندار تقریر پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ نواب صاحب! اگر اللہ میاں مجھ سے کہیں کہ اپنی ایک خواہش کا اظہار کر، ہم اسے پوری کریں گے تو میں نہایت عجز کے ساتھ کہوں گا، خداوندا، مجھے وہی زور بیاں عطا فرما جو تو نے بہادر یار جنگ کو عطا کیا ہے (حوالہ: بہادر یار جنگ' از مسعود جاوید، روز نامہ ڈان ۲۵ جون ۱۹۶۸ء)

اجلاس الٰہ آباد کی اور تفصیلی روئیداد ہمیں سیّد ابوالخیر کشفی کے ایک مضمون سے ملتی ہے ۔

بہادر یار جنگ جو شمالی ہند میں بھی قائد ملّت کہے جاتے تھے، قائد اعظم کی زندگی میں ان کے علاوہ صرف دو آدمی قومی خطابات سے نوازے گئے تھے اور یہ خطابات ہماری زبانوں پر تھے، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی اور "قائد ملّت"، بہادر یار جنگ کی عظمت اور شہرت شمالی اور جنوبی ہند کے

مسلمانوں کے درمیان ایک ذہنی پل کا درجہ رکھتی ہے ۔

میں اپنے چچا اور کانپور کے دوسرے مندوبین کے ساتھ الٰہ آباد پہنچا، ..... جہاں اقبال نے کوئی گیارہ بارہ سال پہلے پاکستان کے خواب کو الفاظ کا جامہ عطا کیا تھا، الٰہ آباد کے اجلاس میں قائداعظم نے اردو میں تقریر کی اور قائداعظم کے بعد نواب بہادر یار جنگ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، صحتمند چہرہ آنکھوں کی چمک جس میں عبدالرزاق لاری کے جذبات کا شعلہ روشن تھا، بلند پیشانی جو ملی مستقبل کا درخشاں مطلع معلوم ہوتی تھی ۔"

بہادر یار جنگ نے لب کھولے، الفاظ کی سیپیاں نطق کے دریا کی سطح پر اچھل کر آگئیں، وہ سیپیاں جن میں معانی اور فکر بلند کے موتی تھے ۔ بہادر یار جنگ نے تقریر شروع کی، ان کے الفاظ میری لوحِ ذہن پر آج بھی پتھر کی لکیر کا درجہ رکھتے ہیں ۔

"تمام حمد سزاوار ہے اس خدائے بلند و برتر کے لئے جو تختِ عظمت و جلال پر متمکن ہے اور تمام تعریف محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جس ذات گرامی نے عرب کے بدوؤں اور خانہ بدوشوں کو تہذیبِ انسانی کے کارواں کا سالار بنا دیا، عظمت و ناموسِ انسانی کے دامن سے کھیلنے والے آبروئے آدم کی شمع کا فانوس بن گئے ۔

ابھی ابھی قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی فصیح و بلیغ اردو میں آپ سے خطاب فرمایا، اَب دکن کا یہ صحرائی حیران ہے کہ کیسے تابِ زباں کشائی کرے۔"

میں اسٹیج پر تھا، رضاکاروں کے گروہ میں قائداعظم اپنا نام سن کر چونکے اور مسکراتے ہوئے اپنے قریب بیٹھے ہوئے کسی رہنما سے پوچھا :-

"WHAT DOES HE SAY?"

مسلم لیگ کی اسی کانفرنس کے اجلاس میں تقریروں کے خاتمے پر ایک تلوار نیلام کے لئے پیش کی گئی، نیلامی بولی، بہادر یار جنگ اٹھے،

مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دکن کے مسلمانوں کو آواز دی۔

"میں دکن کے مندوبین کو آواز دیتا ہوں کہ وہ شمشیرِ جگرِ دار کی طرف ہاتھ بڑھائیں اور پھر پہلی بول بہادر یار جنگ کی تھی، ان کے بعد دکن کے بعض مندوبین نے بولیاں لگائیں اور بہادر یار جنگ نے کانپور کے مسلمانوں کے جذبات کو جگایا۔

"کہاں ہیں کانپور کے وہ غیور اور اہل دِل، جن کی وجہ سے قائدِ اعظم نے کانپور کو مسلم لیگ کا بینک کہا تھا۔"

اور پھر یہ کیفیت تھی کہ کئی کئی "بولیوں" کی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیتی تھیں، نیلامی کے اس سلسلہ سے اکتا کر بعض لوگ پنڈال سے جانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہادر یار جنگ کی آواز بلند ہوئی:۔

"رات کے آرام کے پجاریو! تم پر ملّت کی بیداری کے یہ لمحے بھی گراں ہیں۔ یہ دولتِ بیدار جسے محمّد علی جناح کہا جاتا ہے، تمہارے سامنے ہے اور تم بستروں کی پناہ ڈھونڈنے جا رہے ہو۔

دوستو! کیا تمہیں دیدہٴ بیدار قوم کی طرف اپنی پیٹھ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ تنظیم پاکستان کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے، تنظیم کا تقاضا ہے کہ اجلاس کے نظم کو قائم رکھا جائے۔"

اور باہر جاتے ہوئے قدم رک گئے۔ اٹھنے والے شرمندہ تھے۔

یہ تھی قائدِ ملت کی آواز سے میری شناسائی، کہتے ہیں کہ آواز کبھی نہیں مرتی، آواز سدا سدا زندہ رہتی ہے۔ وہ فضا کا حصہ بن جاتی ہے اور بہادر یار جنگ جیسے آدمی کی آواز تو نئی نسل کی رگوں میں خون بن کر گردش کرتی ہے، سینہ کی آواز بن کر زندگی کے راستے کو جگمگاتی ہے۔

(حوالہ: الٰہ آباد سیشن از سید ابوبکر کشفی، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں ــ کراچی ص ۳۶ تا ۳۸ کراچی)

مسلم لیگ کا اجلاس دہلی

اپریل ۱۹۴۳ء

"دہلی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہونے والا ہے، رام لیلا میدان مسلمانانِ ہند کی جیتی جاگتی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بن گیا ہے، کارکنوں کی شب و روز کی محنت نے اس جگہ جہاں خاک اڑتی تھی، ایک چھوٹا سا شہر بسا دیا؛ لوگوں کی ریل پیل اور گھما گھمی ہے۔ لوگ چاندنی چوک اور کناٹ پلیس کو بھول گئے ہیں۔ اس عوامی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ حیدر آباد کے نواب بہادر اس جلسہ کو مخاطب کرنے والے ہیں۔ دلّی اردو زبان اور ادب کا گہوارہ، لال قلعہ کی فضاؤں میں سانس لینے والے، بہادر یار جنگ سے محبت نہ کرتے تو اور کسے چاہتے، سخن سنج اور سخن آفریں اتفاق سے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے، غالب اور ذوق کی روحوں نے بھی ایک اہتزاز محسوس کیا؛ لوگ جوق در جوق جمع ہوئے اور ایسا ہجوم ہوا کہ دلی کی تاریخ میں ایسا اجتماع دیکھنے میں نہ آیا ——————

رات کے بارہ بجے لیگ کا آخری اجلاس ختم ہوا۔"

—————— ایک اندازِ خطابت یہ بھی تھا۔ شیخ علی احمد۔

(حوالہ: ہفتہ وار اعلان جالندھر قائدِ ملت نمبر جلد ۷ شمارہ ۲۱)

دوسری دیدہ و شنیدہ شخصیت رقمطراز ہے کہ :-

۴۳ء کے دہلی سیشن کی آخری نشست تھی ڈھائی بج رہے تھے۔

قائداعظم فلسطین سے متعلق قرارداد پر اظہار خیال فرمانے کے بعد اجلاس برخواست کرنا ہی چاہتے تھے کہ مجمع سے ایک شور اٹھا۔

بہادر یار جنگ —— بہادر یار جنگ —— ہم بہادر یار جنگ کو سنیں گے ——

قائد ملت سے تقریر کرنے کی استدعا کی گئی۔ (حوالہ: مرد مؤمن از احسان الحق انور، اعلان جالندھر جلد ۷، شمارہ ۲۱۔)

"قائداعظم نے اعلان فرمایا۔ اب نواب بہادر آپ کو مخاطب کریں گے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی قائداعظم نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک رضاکار آپ کے قریب آیا (اشارہ پاکر) آہستہ سے آگے بڑھ کر اس نے میز پر سے گھڑی اور گھنٹی اٹھالی۔ یہ گویا اعلان تھا اس بات کا کہ وقت کی کوئی قید نہیں جب تک جی چاہے داد فصاحت دیجئے۔

ہمیشہ حیدرآباد کی شیروانی میں ملبوس رہنے والے نے آج چست پاجامہ اور انگرکھا پہن رکھا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا نواب خود بھی دلی دبستان ادب میں زبان کی لطافتوں سے سرشار ہونے کے لئے تیار ہو کر آئے تھے

(حوالہ: ایک انداز خطابت یہ بھی تھا، شیخ علی احمد حزین، ہفتہ وار اعلان جالندھر جلد ۷، شمارہ ۲۱)۔

کیسا سہانا سماں تھا، رات کی تاریکی قائد ملت کے مسحور کن اندازِ خطابت سے لطف اندوز ہونے کے لئے گہری ہوگئی اور ستارے دم بخود، ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں نے نیند کے ہتھیائے ہوئے لوگوں کو گدگدا کر بیدار کیا اور سب کان شوق سے متوجہ ہو گئے اور تمام نگاہیں فرط اشتیاق سے اسٹیج پر جم گئیں۔ قائد ملت کے اندازِ خطابت پر خطابت خود فدا تھی۔

چند الفاظ —— جس میں قائد ملت نے مسلمانوں کی

نشأۃ ثانیہ اور مطالبہ پاکستان کی توضیح کی تھی۔ کبھی میرے موج دل سے محو نہیں ہو سکتے، خود کو قوم سے تشبیہ دیکر قائداعظم کو رہنما کی حیثیت سے ایک مکالمہ کی صورت میں فرمانے لگے۔

"میں آوارہ اور سرگرداں پھر رہا تھا، میرے قائد نے مجھے بتلایا اور سمجھایا کہ تم ایک قوم ہو، میں نے بصد شوق تسلیم کرلیا اور کہا لیکن میرے قائد میرے لئے گھر بھی تو ہونا چاہیئے، فرمانے لگے، ہندوستان کے نقشے کی طرف دیکھ، میں جنوب کی جانب تکنے لگا، میرے قائد نے کہا، نادان مسلمان کی نگاہ بلند ہونی چاہیئے، میں نے شمال کی جانب آنکھیں اٹھائیں تو پنجاب اور سرحد پرجم کررہ گئیں۔ پھر میرے قائد نے کہا مسلمان کی نظریں وسعت ہونی چاہیئے، میں نے ادھر دیکھا میں نے ادھر دیکھا، اس پر انہوں نے پاکستان کے شمالی مغربی اور شمالی مشرقی منطقوں کی اس خوبصورتی سے تصویر کھینچی کہ خود قائداعظم نے فرط انبساط سے تالیاں بجائیں اور فرمایا:

QUITE RIGHT

وقت گذر رہا تھا اور تقریر جاری تھی، لوگ اطمینان سے بیٹھے سن رہے تھے، رات قریب الختم تھی نور کا تڑکا ہوچکا تھا، قائد ملت نے مسلمانوں کو اسلام کے رفعتِ مقام کا اندازہ لگانے اور مسلمانوں کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا۔ سنو میرا اقبال کیا کہتا ہے۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

میں نے نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں، ستارے پنڈال کی چھت میں سے جھانک رہے تھے اور ان کی تنک تابی اس نظریہ کی تصدیق کررہی تھیں۔ (حوالہ: مرد مؤمن از احسان الحق، ہفتہ وار اعلان جالندھر قائد ملت نمبر جلد ۷ شمارہ ۲۱)

"ساری تعریف اس خدائے قدیر و قیوم کو سزاوار ہے جس کا تخت عظمت و جلال ہمیشہ سے آراستہ ہے اور ہمیشہ آراستہ رہے گا جس کی بارگاہ ذوالجلال میں انہی افراد و قوموں نے جگہ پائی ہے جن کا عمل صالح رہا اور دھتکار دیئے گئے جو کچھ نہ کر کے سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے"

نواب صاحب کی تقریر کی ابتدا ان جملوں سے ہوئی۔ دہلی والوں کے ذوق سماعت نے انگڑائیاں لینا شروع کیا، لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے مجمع کو سانپ سونگھ گیا، قائد اعظم کی محویت بڑھنے لگی، وقت کا احساس اس وقت ہوا جب دور کسی مؤذن نے آواز دی، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ نواب نے تقریر روک دی جب لاالہٰ الا اللہ کی آخری بانگ پر اذان ختم ہوئی تو پھر گویا ہوئے۔

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تیری آواز مکے اور مدینے

(قائد اعظم نے اس جلسہ کے اخراجات کی پابجائی کے لئے ایک لاکھ روپئے کی اپیل کی تھی لیکن صرف چند ہزار اس فنڈ میں جمع ہوئے تھے، کارکنان جلسہ پریشان تھے کہ اخراجات کی پابجابی کس طرح ہوگی جلسہ شروع ہونے سے قبل نواب صاحب قائد اعظم کے ساتھ شریک طعام تھے اسی دوران قائد اعظم نے مالی مشکلات کا ذکر فرمایا، نواب صاحب قائد اعظم کو اس مسئلہ پر متفکر دیکھ کر خاصے بے چین ہو گئے۔ اور اس خصوص میں فوری قائد اعظم کو یقین دلایا کہ انشاء اللہ اس نشست کے ختم ہونے پر ان کی فکر کا بار دور ہو جائے گا) تب اسی تقریر کے دور دوم میں صبح صادق کی روشنی میں اس مسئلہ پر گویا ہوئے، تقریر کا کچھ اور ہی رنگ تھا، خلوص الفاظ میں سمٹ آیا فقرے درد سے معمور تھے اور آواز کے زیر و بم میں سوز نہاں امڈ آیا۔

سننے والوں کے جذبات میں ایک تلاطم تھا، ان کے قلب کا نور سارے اجتماع پر تیرتا پھرتا تھا کہ میگرافون سے آواز بلند ہوئی:

" جو مال کا ایثار نہیں کر سکتے وہ جان کیا دے سکیں گے" اب جو مسلمانوں کی عملی کمزوری کا جائزہ شروع ہوا تو سب ہی محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے اپنے اعمال کا محاسبہ ان ہی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رکھے گا، تقریر کے دوران تند و تیز گویا نشتر کی دھار تھے جو دل پر گھاؤ دے رہے تھے اس ماحول میں کون تھا جو نفس و ضمیر کی اس کشمکش میں پورا نہ اترتا۔ جسم پر جو کچھ مال و متاع تھا اسے اتارنے لگے، عورتوں نے کانوں سے بالیاں اور ہاتھوں سے چوڑیاں اتار کر رکھ دیں۔

اس موقعہ پر قائداعظم بے حد پریشان ہوئے اور اعلان فرمایا کہ میں صرف نقد لوں گا۔ نقد رقم جو اس جلسے میں جمع ہوئی وہ سوا لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔

ایک مہینے سے لیگی زعماء ایک لاکھ کی اپیل لے کر گھر گھر دوڑے مگر بات نہ بنی، جب قدرت کو بات بنانی پڑی تو بہادر یار جنگ کے اعجاز خطابت سے لمحوں میں یہ کام بن گیا۔

(حوالہ: ایک اندازِ خطابت یہ بھی تھا، شیخ علی احمد، ہفتہ وار اعلان جالندھر قائد ملت نمبر جلد ۷، شمارہ ۲۱)

" قرار داد پاکستان کے بعد سے دہلی میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام جلسے کثرت سے ہونے لگے، قائداعظم کی مستقل رہائش بمبئی میں تھی لیکن وہ دہلی اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ اسمبلی کے زمانہ میں جب دہلی آتے تو ان کا قیام طویل ہوتا، دہلی کے مسلمانوں کی اکثریت قائد اعظم کی منتظر رہتی تھی، جب وہ تشریف لاتے تو شہر میں ایک تازہ چہل پہل نظر آتی اور اس کی رونقیں دوبالا ہو جاتیں، مسلم لیگ

کے جلسے شروع ہو جاتے، عام طور پر یہ جلسے جامع مسجد اور ایڈورڈ پارک کے درمیان واقع وسیع میدان میں منعقد ہوئے۔ قائد اعظم بعض جلسوں میں تشریف لاتے، ان کی تقریر کبھی اردو میں ہوتی اور کبھی انگریزی میں، بعض اوقات اردو میں تقریر کا آغاز کرتے لیکن بعد میں سرکاری رپورٹروں کی جانب اشارہ کر کے فرماتے کہ "یہ لوگ کہیں مجھ سے غلط باتیں منسوب نہ کر دیں اس لئے میں باقی تقریر انگریزی میں کرتا ہوں، قائد اعظم کو انگریزی زبان پر اس قدر عبور تھا کہ انگریز بھی ان کے مداح تھے، ان کی انگریزی تقریروں کو پورے ہندوستان میں ایک خاص شہرت حاصل تھی، ہندوستان کی اسمبلی میں انہوں نے وہ معرکۃ الآرار تقریریں کیں کہ مخالفین کے چھکے چھوٹ گئے، مسلم لیگ کے جلسوں میں دوسرے لیڈر بھی تقریریں کیا کرتے تھے، علمائے دین میں مولانا عبدالحامد بدایونی اکثر جلسوں میں شریک ہوتے اور تقریر کرتے، نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر میں ایک جادو کا سا اثر تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ طلاقت عطا فرمائی تھی کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے سوا کسی کو کم نصیب ہوئی ہوگی، آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس جو اپریل ۱۹۴۳ء میں اجمیری گیٹ کے باہر ایک میدان میں ہوا۔ نہایت دلآویز تھا، نواب بہادر یار جنگ نے اتنی مؤثر تقریر کی کہ لوگ دم بخود ہو گئے،،۔

(حوالہ: مجموعۂ کلام سوز نفس از ایوبؒ صاحب ص ۳۵، ۳۶)
آپؒ مرکزی وزارت مالیات پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے
آپ کا فارسی دیوان نوائے فردا کے نام سے شائع ہوا ہے۔)

قائدِ ملّت اور حکومتِ کشمیر

۱۹۴۳ء

کشمیری مسلمانوں کی ایک آل جموں و کشمیر کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات (کانفرنس ۱۲، ۱۴، ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء) نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیے گئے تھے چوں کہ اس انداز کی کانفرنس کشمیر کی تاریخ میں پہلی کانفرنس تھی، جس کانفرنس میں کشمیری مسلمانوں کے مسائل اور ایک مدّت سے ان کے آپسی نظریاتی اختلافات کی یکسوئی کی صورت گری کے لئے یہ کانفرنس فال نیک ثابت ہونے کا یقین کامل تھا۔ تین ماہ قبل قائدِ اعظم محمد علی جناح (صدر مسلم لیگ) اور قائد ملّت نواب بہادر یار جنگ صدر آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ سے اجلاس میں شرکت کی درخواست شرف قبولیّت پا چکی تھی۔ پوسٹر چسپاں کر دیے گئے تھے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اس تمام کارروائی کے دوران حکومتِ کشمیر نے نہ کوئی امتناعی حکم جاری کیا اور نہ ہی کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کی۔ اجلاس سے صرف دو دن قبل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ حکومتِ کشمیر نے پابندی کا اعلان جاری کر دیا اور ایسی صورت میں اجلاس کا انعقاد ہی خارج از بحث تھا۔

قائد ملّت حسبِ پروگرام ۱۲ اگست ۱۹۴۳ء کو راولپنڈی سے

کشمیر کے لئے روانہ ہوئے۔ حسب پروگرام بیگم صاحبہ قاید ملت نواب صاحب کے کشمیر تشریف لانے سے قبل حیدرآباد سے کشمیر آچکی تھیں اور ان کا قیام ہاؤس بوٹ بمقام ڈل گیٹ میں تھا۔

دومیل کی چوکی پر سب سے پہلے نواب صاحب کا پستول لائسنس ساتھ نہ ہونے کے باعث حکومت کشمیر کی پولیس نے ضبط کر لیا۔ نواب صاحب کے سامانِ سفر کے ساتھ نواب صاحب کا لائسنس بھی تھا جو سامان ٹرک کے ساتھ پیچھے آرہا تھا۔ نواب صاحب کو چوں کہ سری نگر جلد پہنچنا تھا، اس لئے آپ ہاں سے میر واعظ منزل تشریف لے گئے جہاں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس چل رہا تھا۔

"جلسہ رات کو شروع ہونے والا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم قریب دن کے ۱۲ بجے سرینگر پہنچے۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ اس وقت میر واعظ منزل میں جلسہ کے متعلق حکومت کی جانب سے عائد کردہ شرائط پر غور کر رہی تھی کہ نواب صاحب بھی وہاں تشریف لے آئے۔ میری ان کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی"۔

(البتہ "مسلم کانفرنس کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد متواتر گرمیوں میں سری نگر آتے رہے اور اپنے قیام کے دوران انہوں نے مسلم کانفرنس کی تنظیم اور استحکام کے سلسلے میں بے حد دلچسپی لی، اور دوڑ دھوپ کی' جماعتی مذاکرات کے سلسلہ میں ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔)

میر واعظ منزل پر پہنچ کر نواب صاحب نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا اور صرف چند باتیں حضرت قائدِاعظم کی مدح میں بیان فرما رہے تھے کہ حکومت کی جانب سے سرینگر سے ان کے اخراج کا حکم پہنچ گیا۔ اس خبر سے ہم سب گم سم ہو گئے۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے کہ نواب صاحب خلاف ورزی احکام کریں یا بہ مجبوری کشمیر سے واپس تشریف

لے جائیں۔ مجلس عاملہ کے اکثر ممبروں کی خواہش تھی کہ نواب صاحب اس حکم کی خلاف ورزی کر کے قید ہو جائیں۔ لیکن نواب صاحب کو یہ پوزیشن معقول وجوہ کی بنا پر منظور نہ تھی مجھے بھی ان سے اتفاق تھا کیوں کہ نواب صاحب کی گرفتاری سے مسلم لیگ کی پوزیشن مخدوش ہونے کا احتمال تھا اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ حضرت قائدِ اعظم ہمارے اس فیصلہ پر کبھی صاد نہ کریں گے بلکہ ناراض ہو جائیں گے۔ اندریں حالات ہم نے بمصداق "یار زندہ صحبت باقی" نواب صاحب کو رخصت کیا۔ میر واعظ منزل سے باہر جامع مسجد تک زائرین کا بے پناہ جمِ غفیر تھا جس نے نواب بہادر یار جنگ زندہ باد کے نعروں سے فضائے آسمانی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ نواب صاحب سیدھے اپنی قیام پر تشریف لے گئے۔ تاکہ وہاں سے بیگم صاحبہ کو لے کر عازم راولپنڈی ہو جائیں۔

(حوالہ: پیکر خلق و انکسار چودھری غلام عباس ص ۲۴۶
بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ ناشر بہادر یار جنگ
اکیڈمی۔ کراچی)

پہلے ہی حکومتِ کشمیر نے نواب صاحب کو کشمیر بدر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حکومتِ کشمیر نے کمینگی کی انتہا کر دی، رات میں ۲ بجے نواب صاحب کو بوٹ کلب سے سینٹرل پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر پر لایا گیا اور اپنی روایتی ذلت و تعصّب کا مظاہرہ کیا۔ رات کے ۲ بجے گھنگھور گھٹاؤں والی اندھیری رات میں جب کہ مینھ برس رہا ہے، راستے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں، نواب صاحب کو تنہا بغیر بستر و چادر کے کوہالہ کی سرحدوں پر تنہا چھوڑ دیا گیا۔ پہلے تو حیدر آباد دکن کے عوام کو صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ حکومتِ کشمیر نے نواب صاحب کے کشمیر میں داخلے پر پابندی عائد کر دی

ہے تو مجلس نے اس خصوص میں ایک وفد روانہ کیا تھا تاکہ نواب صاحب کو مری ہل پہنچ کر دکن کے مسلمانوں کے اور مقامی مسلم رہنماؤں کے احساسات سے واقف کروایا جا سکے کہ موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال کے پیش نظر ہم نواب صاحب سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں وہ کشمیر تشریف نہ لیجائیں اس خصوص میں "قائد ملت" حکومتِ کشمیر کے رویہ پر حیرت اور ناراضگی کا اظہار' کے زیر عنوان اخبارات مقامی میں جلی حروف میں یہ خبر شائع ہوئی:

" حیدرآباد ۸ ۔ مہر ۔ یہ خبر کہ مولوی بہادر خاں صاحب صدر کل ہند ریاستی مسلم لیگ کو ریاست کشمیر میں داخل ہونے کی ممانعت کی نوٹس دی گئی ہے ۔ یہاں بہت حیرت اور ناراضی کے ساتھ سنی گئی بالخصوص امر واقعہ کے مدنظر کہ اسٹیٹس پلیپس کانفرنس کے برخلاف والیان ریاست کے ساتھ کل ہند ریاستی مسلم لیگ اور اس کے صدر کا طرز عمل ہمیشہ ہمدردانہ اور دوستانہ رہا ہے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی تازہ ترین مثال مولوی بہادر خاں صاحب کا وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں کا دورہ ہے ۔ مسلم لیڈروں کا خیال ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا دورۂ کشمیر وہاں کے مسلمانوں کے کئی پیچیدہ مسائل حل کرنے میں بہت ممد ہوتا اور ممکن تھا کہ اس دورہ کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ ہوجاتا ۔ انہی کے بیان کے مطابق اس موقعہ پر یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ حکومتِ حیدرآباد نے حال حال میں ڈاکٹر مونجے، مسٹر گھنشیام داس گپتا، شری شنکراچاریہ اور دوسرے سربرآوردہ ھندو لیڈروں کو ہندو عوام سے ربط قائم کرنے کی اجازت دی ۔ اس امتناع پر اگرچہ ناراضی زیادہ ہے لیکن موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال کے پیش نظر مقامی مسلم لیڈروں نے مولوی صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ کشمیر نہ جائیں ۔

مولوی سید فضل حسین صاحب ایڈوکیٹ رکن عاملہ کل ہند ریاستی

مسلم لیگ آج "مری ہلز" روانہ ہوئے جہاں سمجھا جاتا ہے کہ مولوی بہادر خاں صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کی روانگی کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانان حیدرآباد کے احساسات مولوی صاحب موصوف تک پہنچا دیں۔ ضرورت ہو تو کوئی مشورہ دیں اور وہاں کی صورت حال کا مطالعہ کریں" (اورینٹ پریس) رہبر دکن ۹ رمہر ۱۳۵۲ف مطابق ۱۶ راگسٹ ۱۹۴۳ء دوشنبہ"

سب سے پہلے کشمیری عوام کو حکومتِ کشمیر کی اس کمینگی کا علم ہوا کہ رات کی تاریکی اور موسلادھار بارش میں نواب صاحب کو کوہالہ پل کے پار تنہا چھوڑ دیا گیا، کھلے اجلاس میں حکومت کے اس ناروا اور غیر شریفانہ برتاؤ پر بطور احتجاج اجلاس برخواست کر دیا گیا۔ شدّتِ جذبات نے کشمیری عوام کو بے قابو کر دیا۔

حکومتِ کشمیر کے اس غیر انسانی طرزِ عمل نے سارے ہندوستان میں اور خصوصاً دکن کے مسلمانوں میں غیض و غضب کی آگ بھڑکا دی، ۱۵ راگسٹ سے ۲۲ راگسٹ تک نواب صاحب کہاں تھے کسی کو کوئی پتہ نہ تھا، اضلاع و تعلقہ جات سے ہزاروں تار مجلس کے معتمد مولوی یامین زبیری کو ملے۔ خود مجلسی قائدین متفکر تھے۔ صورتِ حال سے واقفیت کے لئے مجلس نے مولوی سید فضل حسین، مولوی رشید ترابی صاحب کو روانہ کیا اس کے تیسرے ہی دن قائد ملت کی خیریت کی اطلاع ملی۔

وہ دن مسلمانانِ دکن کے لئے عید کا دن تھا جس دن نواب صاحب کی خیریت کی انہیں اطلاع ملی۔ نمازِ شکرانہ ادا کی گئی، روزے رکھے گئے غربا کو کھانا کھلایا گیا، غربا میں غلّہ تقسیم کیا گیا، خوشی میں آتش بازی کی گئی ــــــــ حکومتِ کشمیر کے تعلق سے عوامی جذبات نفرت کی آخری منزل تک پہنچ چکے تھے، اس خصوص میں کئی شعرا نے اپنے

احساساتِ قلبی کا اس موقعہ پر اظہار فرمایا۔ ایک مقامی شاعر کے تین[۳] شعر ان ہی احساسات کے ترجمان ہیں ؎

کہتے ہیں کشمیر کو جو گلشنِ ہندوستاں
کیا کریں ایسا چمن صیّاد بستے ہوں جہاں
طائرِ آزاد کا اس جا گذر ہوتا نہیں،
نغمۂ حق کا وہاں دل پر اثر ہوتا نہیں
آئینِ انصاف کچھ ایسے نرالے ہیں وہاں
مانگتا سر حد پہ جس کی ہے ما فرالاماں

قائدِ ملّت ۲ ستمبر ۱۹۴۳ء کو حیدرآباد تشریف لائے۔ وہ صبح کبھی بھلائی نہیں جاسکتی جس صبح کو شامِ غربت کے مسافر کو اہلِ وطن، وطن میں دیکھ کر کتنے شاد ہوئے۔ نامپلی اسٹیشن پر، اسٹیشن کے باہر اور سڑک پر بچّے، بوڑھے اور جوان، ملّت کے نگہبان کے استقبال کے لئے اپنی آنکھوں کو فرشِ راہ کئے ہوئے گاڑی کے آمد کی انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ بعض اہلِ وطن ناگپور تک گئے، ناگپور سے قاضی پیٹ اور جو جو اسٹیشن نامپلی سے پہلے آتے گئے ہر جگہ دکنی مسلمان اپنے قاید کیلئے ؎

راہ میں ان کے بچھا رکھی ہیں پلکیں ہیں نے

کے مصداق، ان کے منتظر رہے۔ منزل بہ منزل نگاہوں کی پیاس بجھی، آلیر، بھونگیر (وغیرہ میں) بھی استقبال کی تیاریاں بڑے تزک و احتشام سے ہوئیں، ریل گاڑی کو پوری طرح سجایا گیا۔ انجن پر چاند تارہ لگایا گیا کہ یہ خنجر ہلال کا جو قومی نشان ہے۔ پرچم آصفی لہرایا گیا۔ رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے گاڑی کو عروسِ نو بنا دیا گیا۔

خیریت آباد سے عوام نامپلی اسٹیشن تک نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، قایدِ ملّت زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے دکن کی زمین گونج اٹھی۔

جب نگاہیں اٹھ گئیں اللہ رے معراجِ شوق
دیکھتا کیا ہوں وہ جانِ انتظار آہی گیا

نعروں کی گونج میں انیس الغربا کے معصوم بچوں نے بہ جماعت سلامی دی، پھولوں کے ہار اس کثرت سے پہنائے گئے کہ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پھولوں سے آراستہ موٹر میں قایدِ ملّت کو بٹھا دیا گیا، اس موقعہ پر نواب صاحب کا تبسّم، اپنی قوم سے ان کی بے پناہ محبت وعقیدت کا حسین اقرار تھا، کوئی نہ تھا جو فرش راہ نہ ہو رہا ہو۔ آگے بڑھنے کیلئے راستہ نہیں، بڑی مشکل سے نواب صاحب کی گاڑی رایل ہوٹل سے آگے بڑھ سکی، پھر گاڑیوں، موٹر سیکلوں اور سیکلوں پر یہ تیز رفتار قافلہ بیت الامت پہنچا ناپملی سے بیت الامت تک عوام کے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور شیرِ اسلام زندہ باد سے فضائیں گونجتی رہیں۔

اپنی آمد کے دوسرے ہی دن قایدِ ملّت نے پریس کے نمائندوں کو کشمیر سے نواب صاحب کے اخراج اور اس کے پسِ منظر کے بارے میں حالات وواقعات سے واقف کروایا۔

پریس کانفرنس میں قائدِ ملّت کا بیان

کشمیر سے اخراج اور اس کا پسِ منظر

حیدرآباد ۳ ستمبر، آج صبح گیارہ بجے بیت الامت میں قائدِ ملّت نے کشمیر سے اخراج اور اس کے پسِ منظر کی وضاحت فرمانے کی خاطر ایک پریس کانفرنس طلب کی تھی جس میں مختلف نقاط نظر کی ہم آہنگی صحافتی تاریخ میں ایک درخشاں باب کا اضافہ کر رہی تھی، عظیم الشان مسلم قوم کے ہر دلعزیز قائد نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اخبار نویسوں کے اجتماع

کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا کہ میں ہندوستان اور حیدرآباد کے پریس اور تمام ہندوستان کی پبلک کا عموماً اور حیدرآباد کی پبلک کا خصوصاً شکر گذار ہوں۔ میرے متعلق انہوں نے جس ہمدردی کا اظہار کیا ہے اس کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کے مسلمانوں نے ان واقعات سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار نہ کیا ہو۔ اس کے بعد مری ہلز کی غلط اطلاع دہی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مجھے سخت افسوس ہے کہ مری ہلز کے ڈاکخانہ کی ایک غلط اطلاع نے بجاطور پر میرے ساتھیوں اور پبلک کو پریشان کیا۔ میں ۱۵ راگست سے ۲۲ راگست تک مری ہلز میں مقیم رہا اور اس عرصہ میں ریاست کشمیر صوبہ سرحد پنجاب، دہلی اور دوسرے اقطاع ہند سے جو تار اور خطوط میرے نام آئے وہ سب کے سب انہی تاریخوں میں مجھے پہونچائے گئے۔ لیکن میں نے نہایت حیرت کے ساتھ مجلس کے فائیل میں ایک سے زیادہ اطلاع نامے اسی ٹیلی گراف آفس کے دیکھے ہیں جن پر ۱۶ر سے ۱۸ راگست تک کی تاریخیں پڑی ہوئی ہیں جن میں یہ کہا گیا کہ میں مری سے پشاور روانہ ہوگیا ہوں۔ میں حیران ہو کہ مری کے پوسٹ آفس نے اتنی صریح غلط بیانی اور دھوکہ دہی کی کیوں کوشش کی۔ اس سلسلہ میں "رہبر" یا "وقت" کی یہ قیاس آرائی صحیح نہیں تھی کہ میں نے مری کے ڈاکخانہ کو اپنی روانگی کی اطلاع دیدی۔ لیکن کسی وجہ سے پشاور نہ جاسکا اور نہ میرے احباب کی پریشانی عشق است و ہزار بدگمانی کا مصداق تھی۔ بلکہ جو واقعات پیش آئے ان کا صحیح اور فطری نتیجہ یہی ہو سکتا تھا۔ میں نے ڈاکخانہ کی اس غلطی پر نوٹس دی ہے۔

حکومتِ کشمیر کے سارے طرزِ عمل میں انسانیت کا شائبہ بھی نہ تھا،

کشمیر کے موقف پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ کشمیر کے واقعات سے متعلق مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔

مقامی اخبارات میں اورینٹ پریس کی جو تفصیلی خبر شائع ہوئی وہ حرف بہ حرف صحیح ہے، جیسا کہ میں نے لاہور کی پریس کانفرنس میں کہا، مجھے اس کا رنج نہیں ہے کہ حکومتِ کشمیر نے مجھے اپنی ریاست سے خارج کیا میں اس کی اس حرکت کو غریب مسلمانانِ کشمیر پر ایک احسان تصوّر کرتا ہوں۔ میں اگر کشمیر میں ایک مہینہ بھی رہتا تو مسلمانانِ کشمیر کی امداد نہیں کر سکتا جتنی مجھے نکال کر حکومتِ کشمیر نے ان کی مدد کی ہے۔ ناعاقبت اندیش حکومتوں کی ایسی ہی حرکتیں قوموں کی مضبوطی اور تنظیم کا باعث ہو جایا کرتی ہیں مجھے رنج اس کا ہے کہ میں نے حکومت کشمیر کے اس سارے طرزِ عمل میں انسانیت کا شائبہ بھی نہیں پایا، میری توجہ حکومت کشمیر کے پریس نوٹ کی طرف مبذول کرائی گئی ہے اس پریس نوٹ میں جہاں تک میرے خطابات اور جاگیر سے دست برداری کے متعلق دروغ بیانی کی گئی ہے اس کا بہت اچھا جواب مولوی یامین زبیری صاحب کے بیان میں موجود ہے۔ میں حکومت کشمیر کے اس پریس نوٹ کو شروع سے آخر تک جھوٹ اور دروغ بیانی کا مجموعہ پاتا ہوں جو ایک منظم حکومت کے لئے قابلِ شرم ہے۔ اس کمیونکے میں حکومت نے کہا:

"نواب صاحب نقل و حرکت کا اطمینان دلانے سے قاصر جو کہ وہ آسانی سے کر سکتے تھے" ——— میں حیران ہوں کہ کس طرح ایک حکومت کو دن کی روشنی میں ہمالیہ کے برابر جھوٹ بولنے کی جرأت ہو سکتی ہے جب کہ گرفتار ہونے سے قبل وزیرِ اعظم کشمیر کے نام لکھا ہوا میرا مکتوب ان کی فائیل میں موجود ہے جس میں میں نے اپنے کشمیر آنے کے مقصد آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کی عام پالیسی اور جنگی خدمات کے سلسلے میں اس کے پروگرام کی کافی وضاحت کر دی ہے، حکومت کشمیر کا یہ کہنا کہ مسلم کانفرنس پر عائد کردہ پابندیوں کے بعد مجھے کشمیر جانا ہی نہ تھا بڑی عجیب منطق ہے۔ اگر کسی کانفرنس میں بیرونِ ریاست کے باشندوں کی شرکت ممنوع ہو تو کیا اس کے معنیٰ

یہ ہیں کہ اس کانفرنس کے دوران میں ان اشخاص کا داخلہ بھی ممنوع تصور کیا جائے۔ حکومت کا یہ کمیونکے سمجھدار آدمیوں کے نزدیک خود حکومت کا بے نقاب ہو جانا ہے۔"رہبر" نے اپنے ایڈیٹوریل میں خوب کہا کہ دنیا کا کوئی آدمی حکومت کے اس بات کا یقین نہیں کرسکتا کہ ایسی حالت میں جبکہ میرے ملازم ابھی سرینگر پہونچے تھے اور میری رفیق حیات وہاں تنہا تھیں، میں نے حکومت سے یہ کہہ دیا کہ ان کے دوسرے روز علیحٰدہ آنے کا انتظام کردیا ہے۔ برخلاف اس کے عہدہ داران حکومت کشمیر نے میری موجودگی میں بہت دیر تک غور کرنے کے بعد یہ "تصفیہ" کیا کہ بیگم میرے ساتھ نہیں جائیں گی۔ یہ صحیح ہے کہ میری غیرت نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ میں سرینگر سے نکالے جانے کے بعد رامپور (کشمیر کا ایک گاؤں) میں حکومتِ کشمیر کا مہمان بنوں اور میں نے چاہا کہ مجھے کوہالہ پہنچا دیا جائے۔ لیکن اس کے معنی یہ کب تھے کہ حکومتِ کشمیر مجھے اپنے ساتھ بستر بھی نہیں لینے دیتی۔ ممکن ہے کہ حکومت نے موٹر میں اپنے ملازمین کے لئے بلانکٹس رکھ دیئے ہوں لیکن وہ میرے کس کام آسکتے تھے بلکہ موٹر کو کوہالہ کے پل سے ایک انچ آگے حرکت نہیں دی گئی اور موٹر کو آگے لیجانے سے روک دیا گیا، مجھے موٹر میں ڈاک بنگلہ تک پہونچانے کی نسبت حکومتِ کشمیر کا پریس نوٹ شاید اچھا عذر ثابت ہوتا لیکن حکومت اس کا کیا جواب دے سکتی ہے کہ جب میں اور ٹیکسی ڈرائیور اپنی ذمہ داری پر برطانوی علاقہ میں موٹر لیجانے کیلئے تیار تھے اور میں نے ڈرائیور سے کرایہ بھی طے کرلیا تھا تو اس میں حکومت کو کیا عذر ہوسکتا تھا۔ ایک طرف میرے ساتھ بستر، چھتری، واٹر پروف کا نہ دینا دوسری طرف بارش کے عالم میں ڈرائیور کے آمادگی کے باوجود موٹر کو آگے جانے سے روک دینا اور مجھے مجبور کرنا کہ ۲ بجے رات کو ایک نئے مقام پر بارش میں بھیگتا ہوا ڈاک بنگلہ جاؤں کیا اس سے بڑھ کر خلافِ انسانیت کوئی فعل ہوسکتا ہے۔

آخر میں قاید موصوف نے صحافیوں سے خواہش کی کہ میں آپ حضرات سے اس گفتگو کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے چاہتا ہوں کہ کشمیر سے میرے اخراج اور اس سلسلے میں میری تکلیف کا باب آج ختم کر دیا جائے، میرے نزدیک یہ واقعہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا خود کشمیر کے مسلمانوں کی زبوں حالی، ان کی مفلسی ان کی جہالت اور ان پر عائد شدہ ظالمانہ قوانین اہم ہیں۔ میری تمنا ہے کہ میرے اخراج کا یہ واقعہ تمام مسلمانانِ ہند کو مسلمانانِ کشمیر کی امداد کی طرف متوجہ کرے ۔ میں اس کے لئے عنقریب ایک پروگرام پیش کروں گا

بیان کے اختتام پر سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا جو حسبِ ذیل ہے :-

ایک سوال پر قائد ملت نے فرمایا کہ مری ہلز سے جتنے خطوط اور تار میں نے بھیجے اور اقطاع ہند سے میرے نام آئے تھے ان کی تقسیم عمل میں نہیں آئی ۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ کئی خطوط اور کئی تار تھے جو مجھے قطعاً نہیں دیئے، جب آپ سے ریاستی پالیسی کی وضاحت چاہی گئی .... کہ کیا آپ کو وزیر اعظم کشمیر کی جانب سے قبل از وقت امتناعی احکام وصول ہوئے تھے تو آپ نے نفی میں جواب دیا اور شہری آزادی کی توضیح فرماتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا کہ ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنے باشندوں کو جائز آزادی تحریر اور تقریر سے استفادہ اٹھانے کا موقع دے ورنہ اکثر صورتوں میں اشتعال پیدا ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے ۔ چنانچہ آپ نے حیدر آباد کو مثالی حیثیت دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر مونجے اور مہیشور دیال، جواہر لال نہرو جیسے افراد کو بھی یہاں آنے سے روکا نہیں جاتا البتہ ایسے افراد جن کی مفسدانہ پالیسی کا اظہار ہو چکا تھا اُنہیں یقیناً روکا تھا، لیکن حکومت کشمیر کے اس واقعہ سے اس مسئلہ کا کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا جب کہ میں نے اپنی صلح جویانہ پالیسی کا اظہار کر دیا تھا، کاش حکومت کشمیر میرے آنے

سے پہلے وہ طریقہ اختیار کرتی جیسا کہ حکومتِ حیدرآباد نے کیا، ایڈیٹر دکن نیوز کے ایک سوال پر آپ نے فرمایا کہ مسلم کانفرنس پر میرے جانے کے بعد پابندیاں عائد کی گئیں۔ اور مسلمانانِ کشمیر اس واقعہ کی وجہ سے بے حد جوش میں تھے۔ جب آپ سے حکومت سرکارِ عالی کی آئینی کارروائی کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس کے بعد دوسری ریاستوں کے طرزِ سلوک کے متعلق آپ سے استفسار کیا گیا تو آپ نے بڑی فراخدلی کے ساتھ فرمایا کہ دوسری ریاستوں نے اس قسم کی تنگدلی کا کہیں بھی مظاہرہ نہیں کیا، خود ریاستوں نے مجھے آفر کیا کہ میں ان کے یہاں رہوں، چنانچہ جودھ پور اور اودے پور میں مجبوراً حکومت کا مہمان ہونا پڑا اگرچہ کہ یہ میری پالیسی کے بالکل خلاف تھا۔ جب سکھوں کے استقبال کے متعلق آپ سے تصدیق چاہی گئی تو آپ نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ راولپنڈی میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہیں، چنانچہ انہوں نے مجھے ایک پارٹی بھی دی تھی کشمیر جانے کی وجہ دریافت کئے جانے پر آپ نے فرمایا کہ وہاں کا صحیح مطالعہ اور ممکنہ اخلاقی امداد دینا تھا۔ اپنی شرکت کے متعلق آپنے کہا کہ میری شرکت خاموش شرکت ہوتی، آپ نے آخر میں یہ بھی کہا کہ عنقریب وہ خط ریلیز کردوں گا جو وزیر اعظم کے نام بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد کانفرنس اختتام کو پہونچی۔

طے تو ہوا تھا کہ برصغیر میں کشمیر ڈے منایا جائے اور سارے عوام کشمیر جنت نظیر میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور جو غیر انسانی سلوک نواب بہادر یار جنگ صدر اسٹیٹ مسلم لیگ کے ساتھ روا رکھا گیا اس سے عوام کو واقف کروائیں تاکہ عوام اس حقیقت سے واقف ہوجائیں کہ ؎

دوزخِ کشمیر کو دیتے ہیں جنّت کا خطاب

. . . .

مگر حصولِ پاکستان کے مسئلہ میں مسلم لیگ اور قاید اعظم کے انہماک اور سیاسی مصلحتوں کے باعث "کشمیر ڈے" کا پروگرام عمل پذیر نہ ہو سکا۔ لیکن اس خصوص میں قائداعظم نے قاید ملت نواب بہادر یار جنگ کے کشمیر بدر کیئے جانے پر واسیرائے سے باضابطہ مراسلت فرمائی۔ (قاید اعظم) نے اپنے مراسلے میں واسیرائے کو لکھا کہ:

چند ماہ سے کشمیر نظم و نسق بہت خراب ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق قابل اعتماد ذرائع سے مجھے بہت سے خبریں ملی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ واسیرائے اس سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اگر واسیرائے اسے ضروری سمجھیں تو اس کا ایک نوٹ مرتب کر کے روانہ کروں گا۔ مجھے پوری توقع ہے کہ واسیرائے بطور خاص دلچسپی لے کر ان خرابیوں کو جلد سے جلد رفع کرنے کی کوشش فرمائیں گے وغیرہ"

اس کے جواب میں واسیرائے نے لکھا کہ:

"کشمیر کے حالات سے میں باخبر ہوں اور اس خصوص میں آپ کی توجہ دہانی پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

سیاسی یادداشتیں (قاید اعظم محمد علی جناح سے حضرت قاید ملت کی ملاقات، کشمیر اور حیدرآباد پر تبادلۂ خیال سے متعلق یادداشت)
۱۰۲ - ۱۰۳، مرتبہ نذیرالدین احمد)

شاعرِ صوفی سرمدِ ہند حضرت امجد حیدرآبادی نے نواب صاحب کی کشمیر بدری کے بعد حیدرآباد تشریف آوری پر ایک قطعہ لکھا اور خط بھی:

پروانہ شمع نبوی کے آگے
چاند اور سورج کو ماند دیکھا ہم نے
انتیس اور تیس کو تو بدلی میں رہا
پہلی رمضان کو چاند دیکھا ہم نے

نواب صاحب نے جوابی خط لکھا:

۱۰ ارادی بہشت ۱۳۵۳ ف م ۱۴ مارچ ۱۹۴۴ء

مولوسید احمد حسین صاحب امجدؔ

مکان نمبر (۱۷۰۷) عقب خطہ صالحین

جناب مکرم!

مکتوب گرامی ایک طویل سفر سے واپسی کے بعد نظر سے گذرا، پہلے قطعہ سے لفظاً لفظاً متفق ہوں۔ صرف لفظ "حسنتا" کی تشریح کرنی پڑے گی، جو لوگ ترکِ دنیا کے قائل ہیں وہ بھی ترک دنیا کو ضروری سمجھتے ہیں، ورنہ لفظ "دنیا" جس معنی میں اس آیت شریفہ میں مستعمل ہے اس کا ترک بغیر خودکشی عملاً ممکن نہیں۔

آپ کے معمہ پر میں نے دیر تک غور کیا جو آپ سے حل نہ ہوا وہ مجھ سے کیا حل ہوگا۔ بظاہر معنی فی لبطن الشاعر معلوم ہوتے ہیں اور اگر پروانہ شمع نبوی ؐ سے مراد شمع نبوی ؐ کی ضیار صوم سے متنور ہونے والا پروانہ ہے تو معنی صاف ہو جاتے ہیں۔ جس دن آپ اس کو حل کرلیں مجھے محروم نہ رکھیں۔ فقط

بہادر یار جنگ

حضرت امجد کا خط نواب صاحب کے نام۔

جناب محترم زاد اللہ اخوانکم فی الدارین

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

پروانہ شمع نبوی ؐ کے آگے
چاند سورج کو ماند دیکھا ہم نے

انتیس اور تیس کو تو بدلی میں رہا
پہلی رمضان کو چاند دیکھا ہم نے

اس معمہ کی تشریح یہ ہے کہ اس دفعہ ۲۹ اور ۳۰ شعبان کو ابر کی وجہ

سے ہمارے ہاں چاند نظر نہیں آیا۔ بجائے اس کے پہلی رمضان کو ایک سوختہ جان (جس کو پروانۂ شمعِ نبوی سے تعبیر کیا گیا ہے) منازل کشمیر کے ہبوط سے نکل کر حیدرآباد کے منازل سعود میں نمودار ہوا۔ مشتاق اور دیدار طلب آنکھوں نے اس چاند کو اس طرح دیکھا کہ شاید کبھی کسی چاند کو نہ دیکھا ہوگا۔ خدا چشم بد سے بچائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہمارے اس چاند کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر آپ اس کو دیکھنا بھی چاہیں تو کچھ دیر کے لئے ہم سے ہماری نگاہیں مانگ لیجئے۔

زمغربی نظرے دام کن بدولت نگر
کہ تا بدیدۂ کامل کمال او بینی

رباعی

ہے اپنے وجود پر تبسّم مجھ کو تقدیر نے مجھ سے کردیا گم مجھ کو
اپنی صورت کسی نے دیکھی ہی نہیں
میں دیکھ رہا ہوں تم کو، اور تم مجھ کو

آپ کا امجدؔ

حضرت امجدؔ کے اخلاص نامے کا جواب۔

۴ر خورداد ۱۳۵۳ف
(مطابق ۸ر اپریل ۱۹۴۴ء)

حضرت امجد زاد اللہ مجدکم!

معمہ کا حل باعث افتخار ہوا۔ آپ نے چاند سے تعبیر کر کے داغوں کو نمایاں کر دیا۔ کتنی صحیح تشبیہ۔ اس سے ایک اور بات کا پتہ چلا کہ روشنی ذاتی نہیں مستعار ہے۔ دیکھنے والے کس قدر دھوکہ میں ہیں۔ دعا کیجئے کہ جلوۂ حقیقت کا آفتاب اپنے اندر اس طرح چھپالے کہ دنیا نورِ مہتاب کی متوالی نہ رہے اور سب کی نگاہیں اسی ایک سمت اٹھ جائیں جدھر سے چاند پر ضیاء افگنی ہو رہی ہے۔ بے شک کبھی جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو

دیکھوں لیکن کبھی قرضدار نہیں ہوا ہوں اس لئے نگاہ غیر کا مقروض ہونا بھی گوارا نہیں اور پھر اعلیٰ ہمتی کے بھی خلاف ہوگا کہ جس کو سب کی نگاہیں احاطہ کرلیتی ہیں اسی کو میں بھی تکا کروں ۔ آفتاب کی ہر جھلک سے چھپکنے والی نگاہ کو کیوں نہ خوگر جلوہ آفتاب ہی بنایا جائے ۔ کیا آپ اس میں میری کچھ مدد کرسکتے ہیں ۔ اللہ آپ کی فکر کو بلند تر اور آپ کے کلام کو مقبول تر بنائے ۔

فقط

بہادر یار جنگ

کشمیر بدری کے بعد نواب صاحب کی اپنے وطن یعنی دکن کو واپسی کا واقعہ، قلوب کی دنیا پر بادشاہت کرنے والے بے تاج کے بادشاہ محمّد بہادر خاں کی عظمت وعزت اور عوام کی ان سے والہانہ وابستگی وعقیدت کا ایک یادگار باب ہے ؎

شاد ہیں اہل دکن تجھ کو دکن میں دیکھ کر
شام غربت کے مسافر کو وطن میں دیکھ کر

مُسلم لیگ کے اجلاس کراچی کے موقعہ
پر
یادگار جلوس

۲۴ رڈسمبر سے ۲۶ رڈسمبر تک کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ کراچی کے موقعہ پر جو یادگار جلوس نکالا گیا تھا وہ وقت کے نگارخانے کا ایک یادگار نقش ہے۔

وقت کے نگارخانے میں ایک نقش ایسا بھی ہے جو مسلم لیگ کے ۳۱ر ویں سشن کی یاد دلاتا ہے جو دسمبر ۱۹۴۳ء کو کراچی میں منعقد ہوا تھا، نقوش بہت واضح ہیں، قائداعظم کا جلوس اسی بندر روڈ پر نکلا تھا، جی، ایم، سیّد استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے اور یوسف ہارون معتمد نواب صدیق علی خاں اور حاجی عبدالکریم باڈی گارڈ کی حیثیت میں قائداعظم کے ساتھ تھے، جلوس لی مارکیٹ سے ہوتا ہوا نیپئر روڈ پر آیا اور پھر بندر روڈ سے سیدھے ہارون آباد کی طرف چلا جہاں جلسہ گاہ کے لئے ایک شاندار دروازہ باب السّلام کے نام سے ایستادہ کیا گیا تھا، سڑکیں تماشائیوں سے اَٹ گئی تھیں، گھروں کی چھتیں، دکانیں، عمارتیں اور راستے، مردوں، عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں، جلوس کیا تھا، ہر پیشہ اور ہر فرقے کی نمائندگی اس میں تھی، گاڑی بان، ماہی گیر، شتر سوار، شتربان، نجار اور صناع، اپنی اپنی نمایاں خصوصیات کے ساتھ جلوس کے ہمراہ تھے، آغاخانی بینڈ نغمہ سرا تھا، جب یہ عظیم الشان جلوس ہارون آباد پہنچا تو شام کے ساڑھے سات

بجے تھے، پرچم کشائی کی رسم ادا کی گئی، اس رسم کے آغاز میں جناب سرور شاہ گیلانی نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور قائدِاعظم نے پرچم کشائی کے لئے اس کی ڈوریاں کھینچتے ہوئے کہا "سندھ پاکستان کا باب الداخلہ ہے اور کراچی اس کی کلید" اس کے بعد قائدِاعظم جلسہ گاہ میں آئے۔ ایک چاندی کی کرسی جو جیکب آباد کے ایک سردار نے اس موقعہ کے لئے بھجوائی تھی، صدرِ جلسہ کے لئے رکھی گئی، قائدِاعظم اس پر تشریف فرما ہوتے اور جلسے کی کارروائی شروع کی گئی، سب سے پہلے انور قریشی نے قرأت کی، اقبال کا ترانہ "چین و عرب ہمارا"، ترنم کے ساتھ پڑھا گیا، جی، ایم سیّد نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا، ہاشم ... گذدر نے جو اس زمانے میں سندھ کے وزیر تھے، قائدِاعظم کو پھول پہنائے، ایک سو سے زیادہ جریدہ نگار اور صحافی جلسہ کی روداد لینے کے لئے بیٹھے تھے، بے پناہ ہجوم تھا، قائدِاعظم نے ایک گھنٹہ ۴۴ منٹ تقریر کی اور آخر میں نواب بہادر یار جنگ نے قائدِاعظم کی تقریر کا مطلب برجستہ اور بامحاورہ اُردو زبان میں پیش کیا، چوں کہ اس کارروائی کے دوران، رات کے بارہ بج چکے تھے، نوابزادہ لیاقت علی خاں نے قائدِاعظم کو ان کی ۶۱ ویں سالگرہ پر کل ہند مسلم لیگ کی طرف سے مبارکباد پیش کی، اور نواب نے اپنی تقریر میں دعا کی کہ " اے اللہ، تو میری عمر کے باقی سال بھی لے لے اور میرے قائد کو عمر طویل عطا کر۔"

(حوالہ: کراچی حسین صمدانی نقوی، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی، ص ۱۹۲، ۱۹۳)

اجلاس کراچی کے جلوس کا ایک اور آنکھوں دیکھا حال مزید...... تفصیلات پر مبنی ہے۔

"دسمبر ۱۹۴۳ء کے اواخر میں کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اکتیسواں سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اگلے روز شام کو لیمار سے مسلم لیگ کا

ایک جلوس نکلنا تھا جو پوری شان و شوکت کے ساتھ جلسہ گاہ تک جانا تھا، جلوس کے راستے کو رنگ برنگی جھنڈیوں، سوت کے لچھوں اور خوبصورت کپڑوں سے سجایا گیا تھا، راستے میں جا بجا آرائشی دروازے بنائے گئے تھے، جو مختلف شخصیتوں کے نام سے منسوب کئے گئے تھے۔ شام کو نماز عصر کے بعد جلوس کا آغاز ہوا، نیشنل گارڈ اور خاکساروں کے دستے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے گذرے، لوگوں نے تالیوں اور نعروں کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا، سب سے آخر میں ایک اونٹ گاڑی آئی جسے اکتیس[۳۱] اونٹ کھینچ رہے تھے، اس گاڑی کو بڑی مہارت کے ساتھ پھولوں سے سجایا گیا تھا، گاڑی کے دونوں جانب پھول اس سلیقے سے لگائے گئے تھے کہ پاکستان کا ناخدا پڑھا جاتا تھا، گاڑی پر پھولوں سے لدی ہوئی ایک بڑی سی چھتری کے نیچے قائد اعظم ایک کرسی پر تشریف فرما تھے، کراچی کی فضا قائد اعظم زندہ باد اور لے کے رہیں گے پاکستان، کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی، جلوس آہستہ آہستہ چلتا ہوا بلکہ رینگتا ہوا جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا، پنڈال سے باہر ایک بہت بڑا دروازہ بنایا گیا جس پر باب الاسلام لکھا ہوا تھا قائد اعظم وہاں پہنچ کر گاڑی سے اترے اور انھوں نے باب الاسلام پر اپنے ہاتھوں سے مسلم لیگ کا پرچم لہرایا، اس وقت ہجوم کا جوش قابل دید تھا، پرچم کشائی کے بعد قائد اعظم نے اُردو میں مختصر سی تقریر کی، اسٹیج پر مسلم لیگ کے عمائدین، خاں لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر، غلام حسین ہدایت اللہ، آئی، آئی چندریگر خواجہ ناظم الدین نواب افتخار حسین ممدوٹ، چودھری خلیق الزماں اور نواب بہادر یار جنگ تشریف فرما تھے۔

قائد اعظم نے انگریزی زبان میں تقریباً گھنٹہ بھر تقریر کی، حاضرین میں بہت سے لوگ انگریزی سے نابلد تھے، اس لئے جوں ہی

قائد اعظم نے تقریر ختم کی، حاضرین جلسہ نے اُردو ترجمہ، اُردو ترجمہ اور نواب بہادر یار جنگ کی صدائیں بلند کیں، قائد اعظم نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب کی طرف دیکھا اور وہ مسکراتے ہوئے ڈائس پر تشریف لائے۔

میرے خیال میں اس وقت اسٹیج پر جتنے عمائدین موجود تھے ان میں قد وقامت کے اعتبار سے نواب بہادر یار جنگ منفرد تھے، انہوں نے براؤن رنگ کی دھاریدار اچکن اور چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔

ان کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی نورانی داڑھی بڑی خوبصورت دکھائی دیتی تھی، انہوں نے جب قائد اعظم کی انگریزی تقریر کا ترجمہ شروع کیا تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سامعین کو سانپ سونگھ گیا ہو، ان کی تقریر میں دکن کے پانچ دریاؤں نربدہ، تاپتی، مہاندی، کرشنا، کاویری کی مجموعی روانی تھی، الفاظ ومعانی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ایسی فصیح وبلیغ تقریریں نے نہ اس سے پہلے کہیں سنی تھی اور نہ ہی اس کے بعد کبھی سننے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ابتک یاد ہے کہ انہوں نے قائد اعظم کی تقریر کے ایک فقرہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا تھا "ان کے گھر کی دیوڑھی کی چوکھٹ کے سامنے کی سڑک کے آخری کنارے پر" اس پر سامعین نے تحسین کے ڈونگرے برسائے، نواب صاحب کو یوں داد ملتی دیکھ کر قائد اعظم اور ان کے رفقاء بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

(حوالہ: میں نے بہادر یار جنگ کو دیکھا، از پروفیسر محمد اسلم روزنامہ جنگ کراچی)

اب ہم ۲۴ر ڈسمبر ۱۹۴۳ء کے اجلاس مسلم لیگ میں نواب صاحب کی تاریخی تقریر کا آنکھوں دیکھا حال، قائد ملت کے شیدائی ابراہیم جلیس کی زبانی سننے گئے سے ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بہادر یار جنگ کی ایک غضبناک تقریر

"یہی شہر کراچی ہے اور اَب سے کوئی ۱۶ برس پہلے کا زمانہ ہے، کیلنڈر میں تاریخ ۲۴ر ڈسمبر ۱۹۴۳ء ہے، وقت رات کا ہے اور گھڑی میں نو۹ بج رہے ہیں۔

صدر میں پیراڈائیز سینما سے قریب ایک کف بہ دست میدان ہے (جہاں آج سکریٹریٹ کی عمارتیں کھڑی ہیں) انسانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اس میدان میں جمع ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ کا آخری جلسہ عام ہو رہا ہے۔

انسانوں کے اس وسیع سمندر میں ڈائس ایک جزیرہ کی طرح ابھرا ہوا ہے۔ قائدِاعظم کرسی صدارت پر متمکن ہیں اور ان کے اردگرد دوسرے زعمائے ملت خاں لیاقت علی خاں، نواب اسمٰعیل خاں، چودھری خلیق الزماں، جمال میاں فرنگی محلی، حضرت حیات خاں ٹوانہ، وزیراعظم صوبہ پنجاب، سر غلام حسین ہدایت اللہ، وزیراعظم صوبہ سندھ، سردار اورنگ زیب خاں، وزیراعظم صوبہ سرحد، سعید اللہ، وزیراعظم صوبہ آسام اور خواجہ نظام الدین وزیر اعظم صوبہ بنگال متمکن ہیں، ان کے علاوہ لیڈر خواتین بھی ایک طرف تشریف فرما ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ قائدِاعظم کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک جلسہ ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ کا موڈ کچھ بگڑا ہوا ہے، جاننے والوں کو پتہ ہے کہ آج شام آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں مہمان خصوصی نواب بہادر یار جنگ نے ایک قرارداد پیش کی تھی کہ "پاکستان کا طرز حکومت اسلامی اور قرآنی ہونا چاہیئے"۔

لیکن قرارداد مسترد ہوگئی تھی اور اس وقت سے نواب صاحب کا

موڈ بگڑا ہوا ہے اور وہ اپنے چند دوست رہنماؤں سے کچھ کھنچے کھنچے ہیں ،

قائداعظم کے حکم سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ قائداعظم نے ہر مقرر کے لئے صرف پندرہ منٹ کا وقت مقرر کر دیا ہے اس لئے بطور خاص ان کے سامنے ایک ٹائم پیس اور ایک گھنٹی رکھی ہوئی ہے ۔

سارے مقررین تقریریں کر چکے، رات کے دو بج کر دس منٹ ہو رہے ہیں اب مجمع شور مچا رہا ہے :

نواب یار جنگ ــ نواب یار جنگ

قائداعظم، نواب بہادر یار جنگ کو تقریر کا حکم دیتے ہیں، اور جب بہادر یار جنگ ڈائس پر مائیکروفون کے سامنے آتے ہیں تو قائداعظم مسکراتے ہوئے سامنے سے ٹائم پیس اور گھنٹی ہٹا کر ایک کارکن کے حوالے کر دیتے ہیں اور مجمع میں ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے ۔

نواب بہادر یار جنگ قائداعظم کو مخاطب کرتے ہوئے یوں آغاز تقریر فرماتے ہیں :

قائداعظم! آپ نے مجھے اس وقت تقریر کرنے کا حکم دیا ہے جب کہ لیلیٰ شب کی زلف اس کی کمر سے بھی نیچے لہرانے لگی ہے ۔

اس کے بعد نواب بہادر یار جنگ جب اپنی تقریر کے اس حصے پر پہنچے جو پنجاب میں خواتین کے حقوق سے متعلق تھا فرمایا :

پنجاب پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو گا، آپ کو اللہ نے موقع دیا ہے ، اسلامی قوانین کو جاری وساری رکھیں تاکہ پاکستان بننے کے بعد آسانی ہو ۔

لیکن مجھے افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ آپ کی حکومت میں شریعت سے زیادہ رواج کو ترجیح دی جاتی ہے اور وہی پنجاب جو پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو گا اس میں عورت کے لئے باپ کے ورثے میں

کوئی حصہ نہیں ہے حالانکہ یہ شریعت کے خلاف ہے، نواب بہادر یار جنگ کا اتنا ہی کہنا تھا کہ خواتین لیڈروں نے شیر دکن زندہ باد، شیر دکن زندہ باد کے نعرے لگائے، نواب صاحب نے پلٹ کر ان خواتین کی طرف دیکھا اور پوچھا، کیا قرآن کی روشنی میں حقوق طلب کر رہی ہو؟ عورتوں نے جواب دیا "قرآن کے احکام پر ہم جان دینے کے لئے تیار ہیں"۔ تب نواب صاحب نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا:

توسنو قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ عورت کو شمع محفل نہیں چراغ خانہ ہونا چاہیئے۔

نواب صاحب کا اتنا ہی کہنا تھا جیسے جلسہ گاہ میں ہنگامہ سا مچ گیا، لیکن نواب صاحب کی جادو بیانی نے فوراً ہی جلسے پر قابو پالیا، ویسے حاضرین نواب صاحب کی خلاف توقع برہمی مزاج کو محسوس کر چکے تھے اس کے بعد نواب صاحب نے ان مسلم لیگیوں کا ذکر کرنا شروع کیا جو بظاہر تو مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور اندرونی طور پر مسلم لیگ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

اسی ذکر کے دوران نواب صاحب نے خاص طور پر سر خضر حیات خاں ٹوانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

ایسے مسلم لیگی حضرات کو یہ چاہیئے کہ وہ یکطرفہ فیصلہ کریں ورنہ پھر مؤرخ لکھے گا۔

خضر نے اپنے ہاتھ سے آب حیات کا جام پھینک کر خود اپنے آپ کو شریک قسمت سکندر کر لیا۔

اس موقعہ پر ڈائیس سے ایک رہنما اٹھے اور قائداعظم کے قریب گئے اور ان کے کان میں کچھ کہا جس پر قائداعظم نے ایک چھٹی لکھی اور اس رہنما کے ذریعے نواب بہادر یار جنگ تک پہنچادی۔

نواب بہادر یار جنگ تقریر کرتے کرتے رکے، قائداعظم کی وہ چھٹی پڑھی اور حاضرین جلسہ سے معافی مانگتے ہوئے بولے ۔

معاف کرنا حضرات! اب اچانک میری پٹھان رگ پھڑک اٹھی ہے، اَب میں آپ کی بجائے اپنے چند دوستوں سے مخاطب ہوں ۔

(چھٹی میں قائداعظم نے یہ لکھا تھا کہ آپ تقریر کا موضوع بدل کر چندے کی اپیل کر کے بیٹھ جائیے)

اَب مائیکروفون کا منھ ڈائس کی طرف ہے اور نواب بہادر یار جنگ کی پیٹھ حاضرین جلسہ کی طرف ہے اور نواب صاحب نے براہ راست قائداعظم کو مخاطب کر کے آغاز تقریر کیا:

میرے پیرو مرشد قائداعظم! آج زندگی میں پہلی بار آپ سے گستاخی کر رہا ہوں، اگر میرے الفاظ آپ کے بعض رفقاء کو ناگوار خاطر گذرتے ہیں تو میری التجا ہے کہ آئندہ مسلم لیگ کا دعوت نامہ مجھے نہ بھیجا جائے، میرے قائداعظم! بصد آداب گذارش کرتا ہوں کہ میں کوئی بھانڈ نہیں جو جلسے میں چندے کی اپیل کروں اور چلا جاؤں، میں جانتا ہوں بقول اقبالؔ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے اور بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اور میرا مسلک: آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

قائداعظم! اگر آپ کے پاکستان کی سیاست قرآن کے منبع فیض سے سیراب نہیں ہوتی ہے تو میں اسے سراب سے زیادہ ترجیح نہیں دیتا ۔

ممکن ہے زمانہ راستوں میں کچھ تبدیلیاں کر دے لیکن اگر منزل قرآنی منزل نہیں ہے تو ذلت و خواری کے جہنم کے سوائے کچھ نہیں ہے ۔

قائداعظم! میں بعض رفقاء کی چشم و آبرو کی جنبش سے یہ اندازہ

لگا رہا ہوں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ میں آپ سے اور مسلم لیگ سے غداری کر رہا ہوں اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو ہموار کر کے حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ کا طلبگار ہوں۔

میں اپنے انہیں رفقاء سے مخاطب ہوں کہ میری وفاداری کے دامن سے جھٹکی ہوئی خاک بھی ان کی نمائشی وفاداری کی پیشانی کا جوہر نہیں بن سکتی جہاں تک حیدر آباد کی وزارتِ عظمیٰ کا تعلق ہے میں اس ذمہ دارانہ پلیٹ فارم سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں کرسی وزارت پر بیٹھ کر مہمات سلطنت پر غور کرنے کیلئے نہیں بلکہ گردِ کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کیلئے پیدا کیا گیا ہوں۔ میرا مقام صرف دامنِ کوہ اور وسعتِ صحراہے، میں وہ مزدور ہوں جو راستہ تیار کرتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی گاڑی آسانی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے اور میرے لیئے یہی فخر کافی ہے کہ میں وابستہ دامنِ محمدیہ سے ہوں۔

قائداعظم! میں آپ کے توسط سے انہیں یہ سنانا چاہتا ہوں کہ سن لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر نہیں بلکہ وہ شیطانی سیاست ہے، جسمانی ناپاکی دور ہو سکتی ہے لیکن ذہن و فکر کی گندگی وہ گندگی ہے جس کو دھونے کے لئے انبیاء جیسی ہستیاں مبعوث کی گئی تھیں۔

قائداعظم! میں پھر آپ کے توسط سے ان رفقاء سے مخاطب ہوں جو شجر ملت بن کر مہکنا چاہتے ہیں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہیں ـــــ لیکن آج ہمیں ایسی کھاد کی ضرورت ہے جو جڑوں میں جذب ہوتی ہو، درخت کو تناور کرتی ہو، خود فنا ہوتی ہو اور دوسروں میں لذت و شیرینی پیدا کرتی ہو۔

ہمیں ایسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہ نظارہ باز کی آنکھوں کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں، بلکہ ہمیں

بنیاد کے ان پتھروں کی ضرورت ہے جو زمین میں خود دفن ہو کر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہوں ۔ عین اسی وقت قریب کی مسجد سے صبح کی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے ۔

بہادر یار جنگ کا سارا غصہ جیسے کافور ہو جاتا ہے اور وہ بڑے شوخ لہجے میں مؤذن کو مخاطب کرتے ہیں ۔

ذرا ٹھہر جا مؤذن میرا دل لرز رہا ہے
کہیں کعبہ گر نہ جائے تیری مستی اذاں سے

(حوالہ: نواب بہادر یار جنگ کی ایک غضبناک تقریر، از ابراہیم جلیس روزنامہ جنگ ۲۶ رجون ۱۹۵۹ء)

قائد ملت کی کراچی کی یادگار تقریر کے سلسلے میں کراچی کے ایک قدیم باشندے ابوبکر کے تاثرات، عوامی تاثرات کے مکمل ترجمان ہیں کہ جس طرح پڑھے لکھے عوام ان کی تقریروں سے متاثر ہوتے تھے وہیں عوام بھی اسی تاثر کو قبول کرتے تھے ۔

"بندر روڈ پر پلازا سینما کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر پنواڑی ابوبکر کا پان کا کیبن ہے ۔ اس کے کیبن میں پچھلے بیس برس سے صرف ایک تصویر لگی ہوتی ہے اور یہ تصویر ملتِ اسلامیہ کے عظیم مصلح اور فقہ المثال خطیب نواب بہادر یار جنگ کی دستخط شدہ تصویر ہے ۔ ابوبکر کراچی کا بہت پرانا باشندہ ہے، اس نے کراچی میں تحریک پاکستان کے سلسلے میں ہونے والے تمام جلسوں مین شرکت کی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اس نے لیاقت علی خاں، قائداعظم، راجہ غضنفر علی خاں اور مولانا ظفر علی خاں جیسے شعلہ بیاں مقرروں کو سنا ہے اور بہت سے خطیبوں کی گھنٹوں تقریریں سنی ہیں، لیکن نواب بہادر یار جنگ کی تقریر سننے کے بعد اس نے پھر کسی کی تقریر سننی پسند نہ کی ۔

ابوبکر نے نمائندہ مشرق کو بتایا کہ ۱۹۴۲ء کو جب شاہراہ عراق اور پیراڈائز سینما کی جگہ ایک بڑا میدان تھا۔ میں نے پہلی بار بہادر یار جنگ کو سنا۔ پہلے قائداعظم نے انگریزی میں تقریر کی اور پھر نواب بہادر یار جنگ نے تقریر کی، ابوبکر نے کہا میں گجراتی ہونے کی وجہ سے اُردو کا پورا لطف تو نہ اٹھا سکتا تھا مگر جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو جیسے ان کی آواز کا جادو میرے رگ و پے اور دل و دماغ میں سرایت کر گیا، مجھے بیٹھنے کی جگہ نہ ملی میں کھڑا کھڑا سنتا رہا یہاں تک کہ کئی گھنٹے گذر گئے اور جلسہ ختم ہوگیا، اس کے بعد میرا دل کسی اور کی تقریر کو سننے کے لئے نہ چاہا، اس نے بتایا وہ تقریر کے دوران جیبوں میں انگوٹھے ڈال کر گھنٹوں بلا تکلف بولتے رہے، جب وہ تقریر میں بگڑتے تو ان کے الفاظ اس طرح دلوں پر اثر کرتے جیسے خون کی حدت تیز ہو رہی ہو اور جسم میں ولولے کی کوئی رَو دوڑ رہی ہو۔"

(حوالہ: انٹرویو شائع شدہ روزنامہ مشرق کراچی، مورخہ ۲۶ر جون ۱۹۶۸ء)

اسی تقریر کے تعلق سے آواز دوست کے مصنف مختار مسعود کے قلب میں اس یادگار تقریر کے طوفان کی ایک لہر جو آج بھی ان کے دل میں موجزن ہے، اس کا عکس جمیل ان کے احساسات قلبی کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر لفظوں کی صورت میں متاع بے بہا اور حرف آخر ہے۔

"بہادر یار جنگ کا قد لانبا اور بدن دہرا تھا، وہ خدوخال سے معمر، فربہی سے معتبر اور ملبوس سے معزز نظر آتے تھے، لوگ انہیں مقرر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ ایک بار عہدے کی پیشکش ہوئی تو کہا "مجھے کرسی وزارت پر بیٹھ کر امور مملکت پر غور کرنے کے لئے نہیں بلکہ گرد کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔"

بہادر یار جنگ نے یہ طوفان اپنی تقریروں سے اٹھایا تھا، اسے

سال گذرنے کے باوجود اس طوفان کی ایک لہر آج بھی میرے دل میں موجزن ہے میں نے انہیں کئی بار سنا تھا، ان کی تقریر کبھی آتش فشاں ہوتی اور کبھی آبشار، بعض تقریروں میں یہ دونوں صورتیں جمع ہو جاتیں۔

۲۶ ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے موقعہ پر کراچی میں کی گئی تھی، یہ بلاشبہ ان کی نہایت کامیاب تقریر ہے، خرد اور جنوں کا جو امتزاج اس تقریر میں ملتا ہے اس کی مثال اردو ادب میں جو چند تقریریں محفوظ ہیں ان میں نہیں ملتی۔

عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان، گفتار میں فرد اور کردار میں مرد' ہم نے جو کچھ انہیں سمجھا تھا وہ ان کے مرتبہ سے کم تھا، افسوس کہ ہم ان کے مقام اور ان کی منزل کو نہ پہچان سکے"۔ (حوالہ: آواز دوست از مختار مسعود)

قائد ملت کی یہ یادگار تقریر مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی طبع نازک پر گراں گذری مگر شیوہ حق پرستی تو اقبال کی زبان میں یہی کہتی ہے کہ:

؎ آئیں جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی،

عوام بھی اس حقیقت سے باخبر تھے کہ قائد ملت کی اس جرأت رندانہ نے کرگسوں میں پلے اور صحبت زاغ میں پرورش پائے ہوئے مسلم لیگی لیڈروں کو ناخوش کیا، اس خصوص میں ایک صاحب کے استفسار پر نواب صاحب نے جواباً لکھا:-

"مکرمی! مجھے آپ کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی، کراچی میں میرے اور مسلم لیگ کی ہائی کمان کے درمیان الحمدللہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا حسبِ عادت آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کو ختم کرنے کے بعد پبلک کے مطالبہ کی تکمیل کے طور پر قائد اعظم نے مجھے تقریر کا موقعہ عطا فرمایا اور میں نے وہ تقریر کی جو اورینٹ پریس کی طرف سے تمام و کمال سارے ہندوستان کے

اخبارات میں شائع ہو چکی ہے، اگر آپ کے یہاں تبادلہ میں "رہبر دکن" آتا ہو تو اس کی اشاعت مؤرخہ ..... میں اس تقریر کو ضرور پڑھیئے، بعض احباب اس کو ضرورت سے زیادہ سخت اور پرجوش تصور کرتے ہیں اور ایسا اختلاف میرے بیانات اور تقریروں کی نسبت ہمیشہ ہوا ہے۔ میں خود اس کا معترف ہوں کہ اپنے نظریوں اور عمل کے اعتبار سے اپنی عمر کے تقاضے کی بنا پر مسلم دنیا کے موجودہ زعماء سے میں زیادہ تیز اور پرجوش ہوں۔ اور اس پر مجھے افسوس نہیں ہے چوں کہ ہمیشہ سچی اور کھری بات کہتا ہوں اس لئے بقول اقبالؔ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش "

(حوالہ: خط نمبر ۳۸۳ ص ۴۹۹ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول
مؤرخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۴۴ء)

۱۱ر فروری ۱۹۴۴ء کو قائد اعظم کے نام اپنے مکتوب میں کراچی کی تقریر کے بارے میں قائد اعظم کو اس حقیقت سے آگاہ فرمایا کہ "مسلم لیگ کی بے عملی اور بے جا مصلحت اندیشی کا جو غلط تصور آپ کی پالیسی اور حکمت عملی سے ناواقفیت کی بنا پر عوام اور خصوصاً نوجوانوں میں پیدا ہو گیا تھا اس کا اس تقریر نے بڑی حد تک ازالہ کر دیا ہے"!

مسٹر جناح ا...

کراچی میں تفصیلی ... کا موقع نہ ملا، اپنی رفیقۂ حیات کی علالت کی وجہ سے مجبور ہوا کہ جس دن آپ کے ساتھ کراچی کلب میں ڈنر... کھانے کی مسرت حاصل ہوئی تھی اس کے دوسرے ہی دن ہوائی جہاز سے واپس آجاؤں، کراچی میں مسلم لیگ کے آخری اجلاس میں میں نے جو تقریر آپ کے حکم سے کی تھی اس کی نسبت آپ کی ورکنگ کمیٹی کے کئی ارکان کو خفا پایا۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ خود آپ اس کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں لیکن اس کے جو اثرات میں محسوس کر رہا ہوں وہ یہ ہیں کہ ہندوستان

کے ہر گوشہ سے میرے پاس اس وقت تک سینکڑوں خطوط وصول ہوئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کی بے عملی اور بے جا مصلحت اندیشی کا جو غلط تصور آپ کی پالیسی اور حکمت عملی سے ناواقفیت کی بنا پر عوام اور خصوصاً نوجوانوں میں پیدا ہوگیا تھا۔ اس کا اس تقریر نے بڑی حد تک ازالہ کر دیا ہے"۔

مسلم لیگ کے اجلاس کراچی کی تقریر لیگی رہنماؤں کی غیر اسلامی طرز فکر کے خلاف ایک مجاہد کی وہ آواز تھی جو قرآنی انقلابی ذہن و فکر کی آئینہ دار تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ لیگی رہنما "ان کی سیاست قرآن سے دور، ان کا عمل اسلام کے سخت مخالف، جس دن جماعت کی روحِ اسلامی بیدار ہو جائے گی وہ اپنے لئے سچے زعیم خود تلاش کرلے گی۔ (خط نمبر ۵۴ ص ۱۴۵ مکاتیب بہادر یار جنگ۔

کراچی کی آخری تقریر میں قائد ملت نے جس جرأت و بیباکی سے قائد اعظم اور مسلم لیگی رہنماؤں کی اسلامی طرز فکر کی روشنی میں رہنمائی فرمائی اس غضبناک تقریر سے یہ تاثر بھی لیا گیا کہ کراچی میں قائد ملت اور مسلم لیگ کے ہائی کمان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جس پر قائد ملت نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "کراچی میں میرے اور لیگ کی ہائی کمان کے درمیان الحمدللہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ حسب عادت آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کو ختم کرنے کے بعد پبلک کے مطالبہ کی تکمیل کے طور پر قائد اعظم نے مجھے تقریر کا موقعہ عطا فرمایا بعض احباب اس کو ضرورت سے زیادہ سخت اور پر جوش تصور کرتے ہیں اور ایسا اختلاف میرے بیانات اور تقریروں کی نسبت ہمیشہ ہوا ہے، میں خود اس کا معترف ہوں کہ اپنے نظریوں اور عمل کے اعتبار سے اپنی عمر کے تقاضے کی بنا پر مسلم دنیا کے موجودہ زعما سے میں زیادہ تیز اور پر جوش ہوں اور اس پر مجھے افسوس نہیں ہے، چوں کہ سچی اور کھری بات کہتا ہوں اس لئے بقول اقبال ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

(حوالہ: خط نمبر ۴۸۳ ص ۴۹۹ مکاتیب بہادر یار جنگ)

اجلاس مسلم لیگ کراچی

منعقدہ ۲۶ ڈسمبر ۱۹۴۳ء

مسلم لیگ کے اجلاس میں قائد ملّت کی آخری یادگار تقریر۔

برادرانِ ملّت! مسلم لیگ کا اجلاس ہو چکا اور حسب روایت قدیم میں آپ کو مخاطب کرنے کھڑا ہوا ہوں، اس اجلاس کو میں مسلم لیگ کی زندگی کا نیا باب تصور کرتا ہوں اور اس کی منظور کردہ چھ میں سے تین قرار دادیں میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیّت رکھتی ہیں، یعنی کونسل آف ایکشن کی قرار داد، پنج سالہ پروگرام بنانے والی کمیٹی کی قرار داد اور نئے الیکشن کے مطالبہ کی قرار داد، آخرالذکر کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کروں، صرف اسی قدر کہنا کافی تصور کرتا ہوں کہ میرے پنجابی احباب سر فضل حسین کی روح پُرفتوح کے لئے چاہے کتنے شکر گذار ہوں پھر بھی اگر نئے الیکشن ہوئے تو بقول غالبؔ ؎

بھرم کھل جائے نہ ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرّۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

صبحِ امید مجھے دوسری دونوں قرار دادوں کے متعلق گفتگو کرنی ہے میں ان قرار دادوں کو دورِ نو کا آغاز صبحِ امید کا نشان تصوّر کرتا ہوں، مسلم لیگ کے مستقبل کی درخشانی کی علامت سمجھتا ہوں اور اپنے قائد سے داغؔ کے الفاظ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ؎

تیور ترے اے رشکِ قمر دیکھ رہے ہیں
ہم شام سے اندازِ سحر دیکھ رہے ہیں

حضرات! مسلم لیگ کا احیاء اور ترقی ایک فطری احیاء اور فطری ترقی ہے جو بتدریج اور بہ استقلال عمل میں آئی اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ اس نے ہماری سیاسی حیات کو اچانک اور یکدم منقلب نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ ہمیں منزل کی طرف بڑھایا تاکہ ہمارا قدم آگے بڑھے اور ہم پیچھے نہ ہٹنے پائیں۔

دو قومی نظریہ

قائداعظم نے جس وقت لیگ کے زمام اپنے ہاتھوں میں لی، ہمارے دماغوں پر مختلف باطل تصورات چھائے ہوئے تھے، برادرانِ وطن نے بہ انداز دوستی ہم کو یقین دلایا تھا کہ ہم دس کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوستان میں ایک اقلیت ہیں، یہ احساس کمتری ہمارے ہر چھوٹے بڑے میں سرایت کر گیا تھا، قائد اعظم نے ہم کو یہ بتلایا کہ ہم اقلیت نہیں ہیں، دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی کوئی جماعت اقلیت نہیں کہلا سکتی۔

"تم تو ایک قوم ہو مستقل قوم، جس کا قوام اقوام عالم سے بالکل ..... مختلف اور جدا ہے اور جس کی بنیاد دو ترتیب جغرافیہ، نسل و رنگ کی ادنیٰ تفریقات سے بالاتر ہے۔"

اقبال کا خواب

جب قوم میں یہ خیال عام ہو گیا کہ ہم ایک اقلیت نہیں، ہم ایک مستقل قوم ہیں تو انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ جس ملک میں دو قومیں آباد ہوں اور دونوں کے مذہبی اور ثقافتی تصورات میں بُعد المشرقین ہو تو اس ملک میں جمہوریت صحیح طرز حکومت نہیں ہو سکتی۔ جب اس نظریے نے بھی مسلم عوام کے قلوب میں جگہ پیدا کر لی تو قائداعظم نے اقبال کے خواب کو آشنائے تعبیر کیا اور ہندوستان کے

شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں میں آزاد مسلم ریاستوں کا مطالبہ کیا جس کو اب عرفِ عام میں پاکستان کہتے ہیں۔

نعرۂ جنگ

آج سے تین سال پہلے خود ہم میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ پورا نہ ہو سکے گا، لیکن ہندوستان میں کرپس کی آمد اور موجودہ پُر امید حالت نے پاکستان کے عنقریب حاصل ہونے کا تیقن پیدا کر دیا ہے، مسلمان زیادہ سے زیادہ اس مطالبہ سے وابستہ نظر آرہے ہیں۔ اَب وقت آگیا تھا کہ مسلم لیگ اس جنگ کی تیاری کا آخری قدم اٹھائے، دہلی میں ہم نے حکومتِ برطانیہ کو آخری تنبیہ دی اور آج آل انڈیا مسلم لیگ نے کونسل آف ایکشن کی تجویز پاس کر کے اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر پاکستان افہاماً نہیں مل رہا ہے تو ہم بہ بزور بازو حاصل کریں گے۔

حضرات! وہ قائد یا سالار جس کے سپاہی مفلوج و ناکارہ ہوں، کسی مہم کو کامیابی کے ساتھ سر نہیں کر سکتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ نعرۂ جنگ بلند کرنے سے پہلے اپنی فوجی طاقت کا اندازہ کر لے، یہ کونسل آف ایکشن اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ وہ ہر ایک صوبہ میں نہ صرف اپنی طاقت کا اندازہ کر لے بلکہ نئی طاقت پیدا کرے اور اس کو اس کیلئے تیار کرے جب قائد کی طرف سے کوچ کا حکم ملے۔

میدانِ کارزار

مسلمانانِ ہند! جلسوں کا منعقد کر لینا، تجاویز پاس کر لینا، تقریریں کرنا، تقریریں سننا، کسی قوم کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتا، جہاں تک آپ کے ذہن اور فکر کی تربیت کا تعلق تھا وہ منزل گذر چکی، اب عمل اور صرف عمل کا وقت ہے، اگر آپ اس کی طاقت نہیں رکھتے تو پاکستان کا مطالبہ کر کے اسکو ذلیل نہ کیجئے ـــــــــــــــ،

داغؔ گو شاعرِ بزم تھا مگر بعض دفعہ اس نے بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں، کہا تو اس نے رندی اور سرمستی کے انداز میں ہے لیکن شاید ہم ہی سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ ؎

نہ تھی تاب اے دل تو کیوں چاہ کی
بڑا تیر مارا اگر آہ کی

اس لئے تیار ہو جاؤ اور اپنے محتاط اور عاقبت بین قائد کو یقین دلاؤ کہ اس کی پوری قوم ہر مرحلے میں اس کے ساتھ ہے۔

قائدِ اعظم آپ مایوس نہ ہوں، آپ کے دوست اور پرانے ساتھی حضرت اقبالؔ نے شاید آپ ہی سے مخاطب ہو کر کہا ہے ؎

اے رہبرِ فرزانہ مایوس نہ ہو ان سے
کم کوش سہی لیکن بے ذوق نہیں راہی

ممکن ہے آپ کو اس طبقہ سے آپ کے کام کے آدمی نہ ملیں جن کو اعلیٰ طبقہ کہتے ہیں لیکن آپ کی قوم جانباز سپاہیوں سے خالی نہیں ہے۔

عہدِ وفا

قائدِ اعظم آپ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے میں اپنے آپ کو پیش کردوں جو فہرست آپ کی کونسل آف ایکشن مرتب کرے اس کے لئے حکم دیجئے کہ آپ کے اس سپاہی کا نام سب سے پہلے درج کر لیا جائے، میں آپ کو اس اجلاس کے سارے شرکار کو سنسناتی ہوئی ہواؤں کو اس پنڈال پر چمکتے ہوئے سورج، چاند و ستاروں کو، سارے کروبیوں کو اور خود خدائے قادر و قیوم کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے اس راستے کی کسی کٹھن منزل میں کبھی پیچھے نہ پائیں گے۔

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کہ اندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

نذرانۂ جاں

قائدِ اعظم! وہ دن میرے لئے عید کا دن ہوگا جس دن ملّت محمّدی کے راستے میں اپنے گرہ کی آخری پائی اور اپنے خون کا آخری قطرہ نچھاور کرکے فخر و ناز کروں گا جس دن میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور میرے پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی اور جس دن میرا جسم زخموں سے چور ہوگا۔ (مجمع سے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں)

اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے، میں نے اپنے جس عزم کا اظہار آج کیا ہے، وہ میرے بارہ سال کی شبانہ روز غور و فکر کا نتیجہ ہے، میں نے اس کی تیاری کی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو دیکھو، اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو اپنی زندگی کی ہر خوشی کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو، اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا بغور تصوّر کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو۔

مُسلمانو! وہ فیصلے جو جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں بسا اوقات آنی اور اسی لئے فانی ہوتے ہیں، آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے جو شجر ملت پر پھول بن کر مہکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہیں، ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں، جو خود فنا ہوتے ہیں، اور پھول میں لذت و شیرینی پیدا کرتے ہیں، ہم کو ان کی ضرورت نہیں، جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہِ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں، ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر استحکام عمارت کی ضمانت دے سکتے ہوں، میں نے کل کہا تھا اور آج پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ ؎

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے ∴ بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

پاکستان کا تعمیری لائحہ عمل

حضرات! اس اجلاس کی دوسری خصوصیت پلاننگ کمیٹی یعنی پنجسالہ پروگرام یا لائحہ عمل مرتب کرنے والی جماعت کا قیام ہے فارسی کا قول ہے سہ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

آج دنیا میں وہ لوگ بھی جو عالمگیر جنگ کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور جس کی فتح و شکست کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اس وقت جب کہ ان کی کشتئ حیات گرداب فنا میں چکر کھا رہی ہے ساحل کے نقشے تیار کر رہے ہیں، ہر جگہ تعمیر بعد از جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ہم نے بھی پاکستان کو اپنے سامنے پاکر اگر پاکستان کے مستقبل، ترقی و خوشحالی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تو حقیقت یہ ہے کہ بہت صحیح قدم اٹھایا ہے۔

پاکستان کا دستوری نظام

حضرات! پاکستان کا حاصل کر لینا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ پاکستان کو پاکستان بنانا اور قائم رکھنا مشکل ہے، آپ کے قائد نے ایک سے زائد مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا ہے کہ مسلمان اپنی حکومتوں میں .... کسی دستور اور قانون کو خود مرتب کرنے کا حق نہیں رکھتے، ان کا دستور مرتب و متعین ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ قرآن مجید ہے کتنی صحیح نظر اور کتنے صحیح فیصلے ہیں، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم پاکستان صرف اس لئے نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی جگہ حاصل کر لیں جہاں وہ شیطان کے آلۂ کار بن کر ان ہی دساتیر کا فرانہ پر عمل کریں جس پر آج ساری دنیا کاربند ہے، اگر پاکستان کا یہی مقصد ہے تو کم از کم میں ایسے پاکستان کا حامی نہیں ہوں، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ وہاں

قرآنی نظام حکومت قائم ہو۔ یہ ایک انقلاب ہوگا، یہ ایک نشاۃِ ثانیہ ہوگی، یہ ایک حیاتِ نو ہوگی جس میں خوابیدہ تصورات اسلامی ایک مرتبہ پھر جاگیں گے اور حیاتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لیں گے، پلاننگ کمیٹی آپ کے لئے جو دستوری اور سیاسی نظام مرتب کرے گی، اس کی بنیادیں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر ہوگی، سُن لیجئے اور آگاہ ہوجائیے کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر نہیں ہے وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

(قائدِ اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکّا مار کر فرمایا "تم بالکل درست کہتے ہو")

لیجئے قائدِ اعظم نے میرے اس قول پر مہر تصدیق ثبت کر دی'

پاکستان کا تعلیمی نظام

اس پلاننگ کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانانِ ہند کو عموماً اور مسلمانانِ پاکستان کو خصوصاً پاکستان میں زندہ رہنے کے قابل بنائے اور پاکستان کے لئے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی نظامِ عمل مرتب کرے۔

دنیا جانتی ہے کہ دنیا کا کوئی انقلاب عملی صورت نہیں اختیار .... کرسکتا جب تک پہلے ذہنی حیثیت سے مکمل نہ ہوجائے، تاریخِ عالم گواہی دیتی ہے کہ ہر انقلاب کو عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے ذہنی انقلاب سے گزرنا پڑتا ہے۔

تاریخ انقلاب میں صرف محمدیؐ انقلاب ہی ایک ایسا انقلاب تھا جس نے بائیس برس کی قلیل مدت میں ان دونوں منزلوں کو طے کیا۔ ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کی ایک صورت تو یہی اجتماعات اور محفلیں ہیں لیکن انقلاب کو وجود میں لانے کا مستقل اور بنیادی ذریعہ

صحیح اور مؤثر تعلیمی نظام کی ترویج ہے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی بدبختی یہی تھی کہ یہاں کا تعلیمی نظام اس قوم نے مرتب کیا جو نہ صرف ہندوستان کی سرزمین اور اس کے معاشی ذرائع پر قابض ہونا چاہتی تھی بلکہ اس کی ذہن وفکر پر بھی اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی اس مقصد کے لئے اس نے ہماری تاریخ کو اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کیا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن اور خون کے پیاسے بن کر رہ گئے جس نے ہم میں خود فراموشی کو بڑھایا اور خود اعتمادی کو گھٹایا، جس نے ہماری مشرقی خصوصیات کو فنا کیا اور ہمیں مغربی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا، ضرورت ہے کہ مستقبل کے لائحہ عمل میں سب سے پہلا مقام تعلیمی نظام کو دیا جائے، ایسا تعلیمی نظام جس کی بنیاد کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ پر ہو، جس نظامِ تعلیم سے گذرنے کے بعد مسلمانوں کا بچّہ اسلامی نظام میں نشوونما پائے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں ملّتِ اسلامیہ کی صحیح خدمت انجام دے سکے۔ میں اعلیٰ تعلیم کے مقابلہ میں ابتدائی تعلیم کو زیادہ اہمیّت دیتا ہوں، ابتدائی تعلیم بنیاد ہے، جس کی مضبوطی پر عمارت کے استحکام کا انحصار ہے، ہم واردھا اسکیم کی مخالفت میں آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، اس کے مصنفین کے خلاف سب وشتم کا ہنگامہ بپا کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے پنڈال کی فضا گونجنے لگتی ہے لیکن اگر کوئی پوچھے کہ تم کیا چاہتے ہو تو ہمارے پاس متبادل اسکیم کی صورت میں کوئی جواب نہیں ہوتا، آپ کی یہ پلاننگ کمیٹی مفکرین اسلام کے مشورے سے پاکستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اپنا ہی نظام مرتب کرے گی، یاد رکھو، قوم کے بے عملی صرف اخلاقی پستی پیدا نہیں کرتی بلکہ اس قوم کی سیاسی غلامی کا سب سے بڑا سبب ہوتی ہے، آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے تمام وسائل اس کمیٹی کی کامیابی کے لئے استعمال کریں۔

پاکستان کا معاشی نظام

دوسرا اہم مسئلہ جو اس کمیٹی کے دائرہ کار میں شامل ہوگا، آپ کی معاشی تنظیم کا ہے، آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ کشمکش سرتاسر معاشی ہے جو لڑائی اس وقت لڑی جا رہی ہے اس کے اسباب پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشی اور صرف معاشی مسائل اس کی تہہ میں کارفرما ہیں۔

اسلام کا آفتاب دنیا کے افق پر اس وقت طلوع ہوا جب کہ دنیا کے ایک طرف سیم و زر کے فلک بوس پہاڑ تھے اور اس کی دوسری طرف نکبت و افلاس کے عمیق غار نظر آ رہے تھے، نام نہاد پیشواؤں نے مذہب کو آلۂ کار بنا کر بنی نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور خود ساختہ اصول کے تحت اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز قائم رکھا تھا، شہنشاہیت اور سرمایہ داری کا دَور دورہ تھا، محمدؐ رسول اللہؐ نے بہ یک جنبش لب لاالٰہ الاّاللہ کہہ کر عظمت و جلال حق سے باطل کی ساری عمارتوں کو مسمار کر دیا اور تبلیغ و توحید سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان غاروں کو بھرا جو افلاس و نکبت نے پیدا کر دیئے تھے اور انسانیت کی سطح ایک کر دی تھی، محمدؐ عربیؐ کی محفل میں ہم بلال حبشیؓ کو ہم دوش ابوبکرؓ اور عمار یاسرؓ کو ہم نشیں ابن خطابؓ دیکھتے ہیں، امتناعِ سود سے سرمایہ داری کی جڑیں کٹ گئیں، وراثت کے قانون نے دولت کے جمع ہونے کے راستے روک دیئے، زکوٰۃ نے اس دولت کو جو کسی نہ کسی طرح ان موانع کی موجودگی میں جمع ہوتی جبراً تقسیم کر دیا اور ارتکاز دولت یا جمع مال کی مذمت اور انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین نے مدینہ میں عہد رسالت کے آخری ایّام کو مسکین کے وجود سے خالی کر دیا، الارض لِلّٰہ کا قرآنی پیغام سنا کر نبی امیؐ نے زمین کی ملکیت

صرف خدا اور اس کے خلیفہ یعنی اسلامی اسٹیٹ کے لئے مخصوص کر دی، نہریں جنگل، معدنیات وغیرہ یہ سب اسٹیٹ کی مشترک ملک قرار پائے اور کسی فرد واحد کا یہ حق نہ رہا کہ ان کے ذریعہ دولت کے ڈھیر جمع کرے، زکوٰۃ کے تعلق سے اجمالاً و اشارتاً یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ اسلامی ٹیکس آمدنی پر وصول نہیں کیا جاتا بلکہ سرمایہ پر وصول کیا جاتا ہے اور ان سارے ٹیکسوں سے بڑھ جاتا ہے جو آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد انسانیت نے اپنی ترقی یافتہ ضرورتوں کے مدنظر وضع کئے ہیں کیا اس نظام کی موجودگی میں کسی اور معاشی نظام کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت ہے؟

میں محسوس کر رہا ہوں اور پوری شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ روس کی اس جنگ میں انگلستان کے ساتھ شرکت نے ہندوستان کے لئے کمیونزم کی تبلیغ اور دعوت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور کمیونسٹ مبلغین کو موجودہ گرانی اور قلّت اجناس نے موقع بہم پہنچایا ہے کہ غریبوں کے سامنے روٹی اور کپڑے کا نعرہ بلند کر کے ان کو کمیونزم کی طرف گھسیٹیں، میں اپنے نوجوانوں کو ہندو نوجوانوں سے زیادہ اس مذہب معاش کی طرف متوجہ ہوتا دیکھ رہا ہوں اگر کمیونزم کے معنی صرف یہ ہیں کہ دنیا سے غربت و افلاس کو مٹایا جائے اور ہر انسان کو روٹی اور کپڑا مہیا کیا جائے تو میں اپنے آپ کو سب سے بڑا کمیونسٹ کہہ سکتا ہوں، اور اگر اس کے پیچھے یہودی کارل مارکس کا وہ فلسفہ کام کر رہا ہے جس کی بنیاد انکار خدا پر ہے تو میں کمیونزم سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

اسلام کی بنیاد وجود باری کے عقیدے پر رکھی گئی ہے اور اگر مسلمان اس سے ہٹ رہا ہے تو اسلام سے ہٹ رہا ہے، سیدھے راستے سے ہٹ رہا ہے، خیر سے ہٹ کر شر کی طرف جا رہا ہے، سلامتی کی منزل سے منہ موڑ کر تباہی کے غار میں گرنا چاہتا ہے، میں اس

اجلاس میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ :

"ہمارے پنڈال سے وہ لوگ اُٹھ جائیں جو خدا کے انکار پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں، قرآن کے واضح اور اٹل احکامات میں تحریف و اضافہ کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور جو روٹی کپڑے کے بدلے مسلمان کا ضمیر اور اس کا ایمان خریدنا چاہتے ہیں"

(مجمع سے بے پایاں شور بلند ہوتا ہے "ہم صرف اسلامی نظام چاہتے ہیں")

مجھے یقین ہے کہ ہماری پلاننگ کمیٹی جب پاکستان کے لئے معاشی نظام مرتب کرے گی تو اس کی بنیاد قرآنی و اسلامی نظام معاشی پر ہوگی۔

(قائدِ ملت زندہ باد، قائدِ اعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعرے)

قائدِ اعظم! میں نے پاکستان کو اسی طرح سمجھا ہے اور اگر آپ کا پاکستان یہ نہیں ہے تو ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے۔

(قائدِ اعظم نے مسکراتے ہوئے فرمایا "آپ مجھے قبل از وقت کیوں چیلنج دے رہے ہیں")

نہیں قائدِ اعظم! میں چیلنج نہیں دے رہا ہوں، میں اس چیلنج کے ذریعہ آپ کے عوام کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ آپ ایسا ہی پاکستان چاہتے ہیں جس کا اس وقت اجمالی تصوّر پیش کیا گیا ہے۔

نشأۃ ثانیہ

برادرانِ ملت! یاد رکھئے پلاننگ کمیٹی کا تقرر آپ کی سیاسی زندگی کی نشأۃ ثانیہ ہے وہ قوم جو تعلیمی اور معاشی حیثیت سے آزاد نہ ہو سیاسی حیثیت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتی، تعلیمی اور معاشی غلامی کے ساتھ

سیاسی آزادی غلامی کی بد ترین قسم ہے،

اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے میں آپ کی توجہ اس امر کی جانب خصوصیت کے ساتھ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کا مطالبہ کر کے اگر آپ ایسا ملک چاہتے ہیں جس میں پاک لوگ بستے ہوں اور جو خیالات کے اعتبار سے افکار و اعمال اور کردار کے لحاظ سے پاک ہوں تو میرے دوستو یاد رکھو کہ جسمانی ناپاکی دور ہو سکتی ہے اور آسانی سے دور ہو سکتی ہے لیکن ذہن و فکر و عمل کی ناپاکی وہ گندگی ہے جس کو دور کرنے کے لئے خدا نے انبیاء جیسی ہستیاں پیدا کی ہیں وہ اسی وقت دور ہو سکتی ہے جب نبی کی اتباع کی جائے، کیا ان ناپاکیوں میں آلودہ ہو کر جھوٹ کو اپنا شعار بنا کر مکر و فریب میں مبتلا رہ کر ظلم و استبداد کو جاری رکھ کر کیا ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے اور ہمیں ہندوستان کے دونوں گوشوں میں خود مختار حکومت بھی مل گئی ہے تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہو گی؟

پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کر دو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کیلئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے، مکر و فریب کی سیاست طالبانِ پاکستان کی سیاست نہیں ہو سکتی۔

آپ کی کونسل آف ایکشن کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج سے پاک بنانا شروع کر دے، مگر آہ! یہ ایک حقیقت ہے کہ سپاہی اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایک سپہ سالار پاک نہ ہو جائے۔

سن لو اور یاد رکھو! اسلام کے عہدِ حاضر کا سب سے بڑا مفکر کیا کہہ رہا ہے:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو ∴ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

داراو سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ .:. ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

دشہ نشیں پر بیٹھنے والوں کی طرف مخاطب ہو کر قائد ملت نے فرمایا)

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

نوائے سروش

برادرانِ ملت! اس زندگی ناپائیدار میں انسان کا عمل ہی اسے حیاتِ دوام بخشتا ہے، آپ نے جس توجہ، خلوص اور محبت کے ساتھ میرے خیالات کو سنا ہے اس کے لئے میں آپ کا بہ صمیم قلب شکر گذار ہوں۔

ہماری منزل اگرچہ نمایاں ہو کر نگاہوں کے سامنے آچکی ہے اور ہمیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ ہم اپنے عظیم قائد کی رہنمائی میں منزل سے ہمکنار ہو کر رہیں گے لیکن راستے کے خطرات سے آگاہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا، وقت کے تند و تیز طوفانوں میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ابتلاء و آزمائش کی کٹھن ساعتوں میں کتنے ہی سپاہی بچھڑ سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آئندہ آپ کے درمیان نہ رہوں، اسی لئے میں نے آپ کا بہت وقت لیا ہے، میری آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے عظیم مقصد میں عظیم کامیابی عطا فرمائے۔

آخر میں اس مختصر سی دعا کے ساتھ جس کی برکات بے اندازہ ہیں رخصت ہوتا ہوں۔

یا ربنا یا ارحم الراحمین
رحم کن بر حالِ ما یا رحمۃ للعالمین

خدا حافظ

حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں نواب بہادر یار جنگؒ کا حصّہ

" دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان اگرچہ صرف ایک ہی رات میں معرض وجود میں آیا تاہم جب کبھی بھی میں ماضی کی دھندلکوں میں جھانکتا ہوں تو مجھے مسلمانوں کے اس سب سے بڑے اور عظیم الشان وطن کے نشانات برسوں دور سے نظر آتے چلے جاتے ہیں۔

برسوں دور سرزمین ہمالہ کے دامن میں جناب شہید سلطان ٹیپو کے مقدس لہو کے سرخ سرخ پھول کھلے ہیں، ٹھیک وہیں سے گلستانِ پاکستان کی مہک محسوس ہونے لگتی ہے۔

اُس زمانے میں پاکستان کے کئی نام تھے، ٹیپو کا قلعہ سرنگا پٹم ــــ پاکستان، سراج الدولہ کا میدان پلاسی ــــ پاکستان، بہادر شاہ ظفر کا زندان ــــ پاکستان، سرسیّد کی درسگاہ علیگڈھ ــــ پاکستان، حالی کی مسدس ــــ پاکستان، محمد علی جوہر کا ہمدرد ــــ پاکستان، اقبال کا خواب ــــ پاکستان، اور بہادر یار جنگ کی آواز کا شعلہ ــــ پاکستان۔

ہندوستان کے سیاسی اندھیرے میں مسلمانوں کے اقتدار کا پہلا چراغ سلطان ٹیپو شہید کے لہو سے جلا اور اس چراغ کے اُجالے میں سرسیّد احمد خاں سے اقبال تک، اقبال سے بہادر یار جنگ تک اور بہادر یار جنگ سے قائدِ اعظم

تک ــ ان محسن رہنماؤں کے قدموں سے مسلمانوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا ایک نیا راستہ ہموار ہوتا چلا گیا اور بالآخر یہ راستہ جب بحیرۂ عرب کے ساحلی شہر کراچی تک پہنچ گیا تو ٹھیک آدھی رات کو اچانک ساری دنیا "پاکستان زندہ باد" کے گرجدار نعروں سے گونج اٹھی، اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے سورج کا اجالا پھیلتے ہی دنیا والوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ دنیا کے نقشے پر ایک نیا اور سب سے بڑا اسلامی ملک معرضِ وجود میں آچکا ہے اور دنیا کے دوسرے سارے ملکوں کے رنگ برنگے جھنڈوں میں ایک نیا سبز ہلالی پرچم بھی بڑی شان سے بلند ہو کر بڑے کروفر سے لہرا رہا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی سرزمین پر ٹیپو کا لہو نہ گرتا سرسیّد نے درسگاہ علیگڈھ کی بنیاد نہ رکھی ہوتی؛ بی اماں نے محمد علی جوہر کو نہ جنم دیا ہوتا، اقبال نغمہ سرا نہ ہوتا اور بہادر یار جنگ کی گرجدار آواز سرزمین ہمالہ کو نہ جھنجھوڑتی ــ تو کیا پاکستان بن سکتا تھا؟؟۔

لیکن یہ کیسے بے لوث اور بے نیاز محسن ہیں، خود تو دو دو گز کی مختصر سی قبروں میں سمٹ گئے اور دس کروڑ مسلمانوں کے لئے اتنا بڑا اور ایسا عظیم الشان وطن لے کر دے دیا، خود ایک نظر بھی اسے نہیں دیکھا۔

میں ہر اس مسلمان کے لئے عقیدت سے اپنا سر جھکا دیتا ہوں جس نے اپنے لہو سے پاکستان کی سرحد کو اور زیادہ تابانی عطا کی ہے، خواہ وہ مسلمان ٹیپو شہید ہو، خواہ وہ گمنام شہید جو ہندوستان سے پاکستان کے سفر میں ۱۹۴۷ء کے سنگ میل کے آس پاس کہیں بھی شہید ہوا ہو۔

لیکن اس وقت تو میرا سر دوسرے ٹیپو نواب بہادر یار جنگ کے آگے خم ہے جن کی آواز کے دہکتے شعلوں نے جہاں غیر ملکی غلامی کی زنجیریں پگھلا دیں وہاں ان تابناک شعلوں نے پاکستان جانے والے ہر راستے کو فروزاں اور جگ مگ کر دیا۔

پہلے پہلے تو اس آواز کی گھن گرج صرف کوہستان، بندھیاچل کی وادیوں میں گونجتی رہی، لیکن جیسے جیسے یہ آواز جواں ہوتی گئی اس کا جادو بھی سر چڑھتا گیا اور پھر تو ایورسٹ اور ہندوکش کی چوٹیاں بھی لرزنے لگیں، خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب تک اس آواز نے بَلا کا تموج پیدا کر دیا تھا اور اس آواز کو قائد اعظم محمّد علی جناح تک نے خراج تحسین پیش کیا۔

(حوالہ: پاکستان زندہ باد از ابراہیم جلیس ص ۴۱، ۴۲ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

تحریک پاکستان کو برصغیر پاک و ہند کے عوام میں مقبول بنانے میں جو کردار نواب صاحب کا رہا اس کو تاریخ تحریک پاکستان کا مؤرخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا، نواب صاحب نے تحریک پاکستان کے نازک دَور میں جو خدمات انجام دیں اس کا اعتراف خود قائد اعظمؒ نے بارہا کئی مواقع پر کیا، قائد اعظمؒ کا یہ اعتراف تاریخ میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عقیدت و محبت کی قدرِ مشترک تحریک پاکستان تھی، ملّتِ اسلامیہ پاک و ہند کی قیادت کا سارا بوجھ قائد اعظم کے نحیف و ناتواں کندھوں پر تھا، تاریخ کی اس عظیم تحریک کیلئے ایسی شخصیّات کے اشتراک و تعاون کی شدید ضرورت تھی جن کا کردار بے داغ اور جن کا خلوص تحریک کے ساتھ بے لوث ہو۔ قائد اعظم جیسے جوہر شناس کو ایسے جواہر کی تلاش تھی جو قدر و قیمت میں بے بہا اور جن کی آب و تاب لازوال ہو قائد اعظم کی گہر شناس نظروں نے بہادر یار جنگ کا انتخاب کیا، مسلم لیگ کے ہر اجلاس کے موقعہ پر نواب صاحب مرحوم موجود ہوا کرتے تھے اور اجلاس کے ختم پر قائد اعظم نواب صاحب مرحوم کو خطاب کی دعوت دیا کرتے تھے۔ تحریک پاکستان اپنے سفر کے دوران بڑے نشیب و فراز سے گذری۔ بعض ایسے مواقع آئے کہ اگر مسلم لیگ کو سنبھالا نہ ملتا تو مسلم لیگ افتراق و

انتشار کا شکار ہو جاتی، اسی لئے قائد اعظم نے نواب صاحب مرحوم کے متعلق ارشاد فرمایا کہ :-

"بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین و رہبر ثابت ہوئے"

سرحد میں انتخابات ہونے والے تھے، وہاں کی فضا مسلم لیگ کیلئے سازگار نہیں تھی، خدائی خدمت گاروں نے مسلم لیگ کے کارکنوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ قائد اعظم کی تمنا تھی کہ مسلم لیگ انتخاب جیت لئے، انہوں نے سردار اورنگ زیب کو عیادت کے جواب میں لکھا کہ :-

"میرے زخم اسی وقت مندمل ہوں گے جب کہ چاروں انتخابات مسلم لیگ جیت لئے"

قرعۂ فال بہادر یار جنگ کے نام نکلا، نواب صاحب نے ایک دو ماہ میں پشتو زبان سیکھی اور صوبہ سرحد کا دورہ کیا، ان کی تقاریر کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلم لیگ نے بھاری اکثریت سے انتخاب جیت لیا۔

بہادر یار جنگ کا تحریک پاکستان کے سفر میں مجاہدانہ کارنامہ یہ ہے کہ ان کی بدولت سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مسلم لیگ کا وہ سالانہ اجلاس منعقد ہوا جو تحریک پاکستان کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس اجلاس میں قرار داد پاکستان پیش کی گئی۔

(حوالہ : نواب بہادر یار جنگ اور تحریک پاکستان، از محمد عبدالہادی صدیقی ص ۴۹ تا ۵۲، مضمون مشمولہ تاریخ و تحریک پاکستان، ناشر گورنمنٹ نیشنل کالج، شہید ملت روڈ، کراچی)۔

گنگا جمنا کے سنگم پر کھڑے ہو کر جب اقبال نے پاکستان کا خیال پیش کیا تو اسے شاعر کے خواب سے تعبیر کیا گیا لیکن صرف دس برس بعد اقبال کی ابدی آرام گاہ لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں قرار داد پاکستان پیش

کی گئی، اور یہی قرار داد مسلمانوں کا نصب العین قرار پائی، لیکن جن حالات میں یہ قرار داد پیش کی گئی اور مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا وہ ناقابلِ فراموش ہیں اور اس جلسہ کے انعقاد اور کامیابی میں بھی حیدر آباد کے ایک فرزندِ جلیل کی فراست اور خطابت کا بڑا دخل ہے - صرف بہادر یار جنگ کی تنہا ذات تھی جو اجلاس کے التوا کی مخالف تھی، انہوں نے قائد اعظم کو اپنی ذاتی عقیدت اور اثر کی وجہ سے اجلاس کو ملتوی نہ کرنے پر راضی کر لیا اور مسلم لیگیوں کی اسپیشل ٹرین لاہور کی جانب روانہ ہوئی، پاکستان کا پہلا کاروان اور ہراول دستہ جو اپنے رہنما، سالار اور ہمسفروں، سپاہیوں اور حدی خوان پر مشتمل تھا، اقبال کی ابدی آرام گاہ لاہور کی طرف چل پڑا، ایک شاعر اعظم کے خواب کو قوم کا نصب العین بنانے کے لئے!

اس کاروان کے حُدی خوان بہادر یار جنگ تھے، انہوں نے لاہور پہنچتے ہی خاکساروں کے ایک ایک کیمپ کا دَورہ کیا اور اپنی عدیم المثال خطابت سے نوجوانوں کے سُلگتے ہوئے جذبات کو سَرد کر دیا۔ تکدر اور بے یقینی کی فضا ختم ہو گئی اور پہلے اجلاس عام کی پہلی تقریر بھی بہادر یار جنگ کی تھی، اس تقریر نے جادو کا اثر کیا، پنڈال قائداعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگا، حتیٰ کہ چند گھنٹے پہلے تک سر سکندر کے نام سے بھڑکنے والے سکندر زندہ باد کا نعرہ لگانے لگے اور غلط فہمیوں کا پیدا کردہ ماحول خوشگوار عقیدت سے بَدل گیا۔

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر
مُرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صِلہ

(حوالہ :- اقبال اور حیدر آباد، از نظر حیدر آبادی ص ۱۷۷ــــ ۱۸۸)

علمی، ذہنی اور لسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس مقصد اعلیٰ یعنی قیامِ پاکستان کو جسے وہ مُسلمانانِ ہند کی بقا کا واحد حل سمجھتے تھے اپنا

نصب العین بنالیا تھا، اس کی خاطر انہوں نے تمام ہندوستان کی خاک چھانی اپنی سحر بیانی اور زور خطابت سے مسلمانانِ ہند کے دل گرمائے اور ان کے جوشِ ایمانی کو جھنجھوڑا، یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی فصیح و بلیغ تقریروں سے ہمیشہ "لسان الامّت" ہونے کا ثبوت دیتے رہتے لیکن قرار داد لاہور یعنی عرف عام میں تجویز پاکستان کے پیش ہونے کے موقعہ پر اور دلّی کے رام لیلا گراؤنڈ کی تقریریں ایسی معرکۃ الآراء تھیں کہ اسلامی مملکت پاکستان کا عالم وجود میں آنا یقینی ہوگیا تھا۔

لاہور میں حکومت سر سکندر حیات خاں کی خاکساروں سے خونیں جھڑپ دوسری ہولناک جنگِ عظیم کی وجہ اور مرکزی و صوبائی حکومتوں کی سخت مخالفت کے پیش نظر اگر آل انڈیا مسلم لیگ کا لاہور اجلاس نہ ہوتا تو خدارا بتلائیے آج پاکستان کہاں ہوتا، نواب صاحب نے ہی اس آڑے وقت میں قائدِ اعظم کا ہاتھ بٹا کر پاکستان بنادیا۔

(حوالہ: حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں بہادر یار جنگ کا حصہ ص ۱۸۷، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں قائد ملّت نواب بہادر یار جنگ قائداعظم کے دوش بدوش رہے، قدر مشترک تدبر سیاسی کا تقاضہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان ایک مکیّ دور سے گذر رہا ہے اور اس کے لئے ایسے مدینے کی ضرورت ہے جہاں قدم جما کر وہ بدر و اُحد کی تیاری کرسکے، اس مرحلہ پر قائداعظم کے تدبر سیاسی کی روشنی میں وہ یہ جانتے تھے کہ اس نازک موڑ پر قائداعظم محمد علی جناح کی صورت میں خدا نے ہمیں ایک بیدار ناخدا عطا کیا ہے، ایسے وقت میں جب کہ کشتی امت شب تاریک میں ہوائے مخالف اور بحر طوفاں خیز کے تھپیڑے کھا رہی ہے۔ اس منزل میں سوائے قائداعظم کے ناخن تدبیر کے کوئی اور عقدکشائی کے موقف

میں نہیں، کیوں کہ ان ہی کی ذات اس منزل میں نعمتِ خداوندی ہے، مالا بارہل سے اترنے والے کلیم سیاست کے نعرۂ پاکستان نے وار دھا سامریت کے ظلم توڑ ڈالے اور ساتھ ہی مسلمان کی آنکھ کے پردے بھی یک بار کی چاک کر دیئے، اسی تأثر اور حصولِ پاکستان کی جدو جہد کی اہمیت کو تاریخ کی روشنی میں مسلم قیادت کے رجحانات کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ دس کروڑ مسلمانوں کے واحد رہنما کے نظریہ پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"تحریر کا منشا صرف یہ ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کی موجودہ قیادت کے ان رجحانات کو پیش کروں جو تدریجی طور پر گذشتہ دس برس میں ترقی پاتے رہے ہیں۔

ہندوستان میں سب سے پہلی مرتبہ انگریزوں کی حکومت نے تصور جمہوریت کو روشناس کیا، ہندوستان کی تاریخ کا متعلم جانتا ہے کہ بادشاہت دنیا میں کسی اور جگہ اس شدّت و اقتدار کے ساتھ قائم نہیں رہی جتنی ہندوستان میں تھی۔ ہندو مذہب کی کتابیں بادشاہ کی عظمت و مرتبہ کا پتہ دیتی ہیں فرعنہ مصر نے برخود غلط خدائی کا دعویٰ کیا تھا لیکن ہندوستان کے راجہ آج تک خدا کی حیثیت سے پوجے جارہے ہیں، ہندو مذہب نے بادشاہ کو خدا کا مظہر قرار دیا اس کی اطاعت خدائی احکام کی تعمیل کے برابر تصوّر کی گئی اور اس کا انکار یا اس سے سرتابی دنیا کا سب سے بڑا گناہ سمجھی جاتی رہی۔ یہ تصورات صرف ہندو راجاؤں کے ساتھ قائم نہیں رہے بلکہ اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد خود مسلمان بادشاہوں کی نسبت سارے مذہبی اختلافات کے باوجود ہندو رعایا کا تصور یہی رہا، جب انگریزوں نے ہندوستان میں جمہوریت کو روشناس کیا تو ہندوستان کے حالات بدل چکے تھے، تقریباً ایک ہزار سال کی اسلامی حکومت نے ہندوستان میں اسلامی تہذیب

تمدّن کی جڑیں مضبوط کر دی تھیں، اور آریائی باشندوں کی طرح ہندوستان مسلمانوں کا مستقل وطن بن گیا تھا اور ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی موجود نہ ہو ممکن نہ تھا کہ مسلمانوں کو پھر سے ڈھکیل کر ہندوستان سے باہر نکالا جائے، یا بدھ مت کی طرح اسلام کو ہندوستان سے خارج کیا جائے، اس لئے جمہوریت ہندو سیاسی زعماء کے نزدیک پھر سے ہندو اقتدار کو زندہ کرنے کا ایک اچھا ذریعہ سمجھی گئی اور انہوں نے اس کا دل سے خیر مقدم کیا اور جو تدریجی اصلاحات ہندوستان میں جاری ہوئیں اُن میں پورے جوش کے ساتھ حصّہ لینا شروع کیا۔

مسلمان اپنی حکومت کھو کر نہ صرف مال و دولت کے اعتبار سے مفلس ہو چکے تھے بلکہ ان کے ذہنی انتشار نے فکر و عمل کے لحاظ سے بھی ان کو مفلس بنا دیا تھا، جمہوری تحریک کے سَیلاب میں دوسروں کے ساتھ بہنے لگے اور اسی نقطۂ نظر سے اپنے مستقبل کا جائزہ لینے لگے۔ ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کی ساری سیاسی تحریک کے رجحان کے نتائج و عواقب میں جمہوریت مسلمان کے لئے یوں بھی جاذب توجہ ہو گئی کہ اسلامی نظامِ حکومت بگڑ جانے کے بعد سلاطین کے استبداد نے مسلمانوں کو بادشاہت سے ایک حد تک بیزار کر دیا تھا، وہ پھر اس دَور کی طرف دیکھنا چاہتے تھے جب کہ عوام کو پوری آزادی کے ساتھ حق رائے دہی حاصل تھا اور خلیفۃُ الرسول بھی ایک خمیدہ کمر و لرزہ براندام بڑھیا کی حق بات ماننے پر اور ایک کالے کلوٹے حبشی غلام کا ممبر خلافت سے جواب دینے پر مجبور ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ملک کے خاص حالات کا جائزہ لئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں نے بھی جمہوری نظام حکومت کا خیر مقدم کیا اور اس کا ساتھ دینے لگے۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُن کی نگاہ دور بین نے ہندوستان کے خاص حالات کا جائزہ لیا اور دُنیا

کے عام تصوّر کے خلاف نہایت جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ جمہوریت ہندوستان کے لئے موزون نظامِ حکومت نہیں ہے ۔

تصوّرِ جمہوریت کا لازمی نتیجہ اکثریت واقلیت کا سوال تھا جہاں ایک مذہب، ایک نسل، ایک زبان اور ایک تہذیب رکھنے والی قومیں آباد ہوتی ہیں وہاں جماعت بندی، سیاسی اختلافات کی بنیاد پر ہوتی ہے لیکن ہندوستان ایک ایسا ملک تھا جہاں ایک سے زیادہ نسلی، مذہبی اور تہذیبی اختلاف رکھنے والی جماعتیں موجود تھیں، اسی لئے جمہوریت کے روشناس ہوتے ہی یہاں سیاست کی بجائے مذہب وتہذیب کی بنیاد پر جماعت بندی شروع ہوئی اور اُسی نقطۂ نظر سے اکثریت واقلیت کے سوال پر غور کیا جانے لگا اور ہندو زعماء نے نہایت تدبر و دور اندیشی کے ساتھ مسلمانوں کے ذہن و فکر کو مسموع کرنا شروع کر دیا کہ وہ ایک اقلیت ہے اور بدقسمتی سے خود مسلم زعماء نے تعداد کی قلّت وکثرت کو معیارِ تفوق وکمتری قرار دیکر اپنی گتھیوں کا حل تلاش کرنا شروع کیا، اس کا نتیجہ ۱۹۱۶ء کی ہندو مسلم مفاہمت تھی، اسی نے ۱۹۲۶ء کی آل پارٹیز کانفرنس کو ناکام کیا اور اسی کے آخری نقوش کمیونل ایوارڈ کی صورت میں قانون حکومتِ ہند ۱۹۳۵ء پر مرتسم ہوئے، قانون مذکور کے نفاذ سے ۱۹۳۷ء میں جو صوبہ دار حکومتیں قائم ہوئیں ان کے تقریباً تین سالہ دَور نے ثابت کر دیا کہ یہ سارے نقوش پانی کی سطح پر بنے تھے، مسلمان چونکا اور قائدِ اعظم نے اپنی قیادت کا دوسری مرتبہ کمال دیکھایا، جب انہوں نے صاف طور پر اعلان کیا کہ دس کروڑ کی تعداد میں بسنے والی ایک جماعت جو ثقافتی اور مذہبی امتیازات کی حامل ہے ایک اقلیت نہیں بلکہ مستقل قوم ہے، مالا بارہل سے اترنے والے کلیم سیاست کے اس نعرے نے ورد ھائی ساحریت کے سارے طلسم کو توڑ دیا اور مسلمان کی آنکھ کے ... پردے یک بارگی چاک ہو گئے۔

کوئی قوم ذہنی انقلاب کے بغیر عملی انقلاب کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔

جمہوریت نے بغاوت اور ایک مستقل قوم ہونے کے دعوے نے مسلمانوں کی فکر کے زاویئے درست کر دیئے، اب وقت آگیا تھا کہ ایک منزل مقصود اس کے سامنے رکھی جائے، سیرت نبویؐ کی اصطلاحوں میں اگر گفتگو کی جائے تو بلا شبہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں ایک مکّی دَور سے گذر رہا تھا اور اس کے لیئے ایک ایسے مدینہ کی ضرورت تھی جہاں اپنے قدم جما کر وہ بدر و اُحد کی تیاری کر سکے، اور خدائے قدیر سے "سلطانِ نصیر" کا اُمیدوار ہو سکے، محمّد علی جناح نے آغوش مغرب میں تربیّت پائی تھی، اُن کے دماغ کا ایک ایک گوشہ فکر مغرب کا مرہون منت تھا اور ان کے جسم کی ایک ایک پود تمدن مغرب کی آئینہ دار تھی لیکن ان کا نام محمد اور علی سے نسبت رکھتا تھا اس لیئے ان کا دل فکر محمدؐ اور عزم علیؓ کے پَرتو سے خالی نہ تھا، اعتباری اور اصطلاحی حیثیت سے چاہے انہوں نے تعلیماتِ محمدیؐ سے کوئی بہرہ نہ پایا ہو لیکن اُن کے قلب کی گہرائیاں روح تعلیمات محمدیؐ سے محروم نہ تھیں وہ غیر شعوری یا نیم شعوری طور پر اسی طرف گئے جدھر ایک اصطلاحی عالمِ دین شعوری طور پر جاسکتا۔ اور اعلان کیا کہ ہر قوم اپنے لیئے ایک مستقر چاہتی ہے اور اپنے تہذیب و تمدن کو ترقی نہیں دے سکتی جب تک کہ کسی جگہ اپنے اختیارات کو کامل طور پر استعمال کرنے کے قابل نہ ہو اس لیئے مسلمان ان علاقوں میں جہاں ان کی عددی اکثریت ہے ایک آزاد سلطنت چاہتے ہیں، یہی بنیاد ہے ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی گوشوں میں آزاد اسلامی حکومتوں کے مطالبہ کی جس کو ہندوؤں نے پاکستان کہا اور اب انہی کو سمجھانے کے لیئے انہی کی اصطلاح میں مسلمان بھی پاکستان کہتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ صدیوں کی تفریق و تشتّت کے بعد ہندوستان کے مسلمان پھر ایک مرکز پر جمع ہو گئے، مذہبی اختلاف نے جو گروہ بندیاں پیدا

کردی تھیں وہ ٹوٹ گئی ہیں، اور مسلمانوں نے ایک مدبر امیر کی قیادت میں اپنی منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا ہے۔ مسلمان اس نعمت کی قدر کریں جو خدا نے ان کو عطا کی ہیں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کی صورت میں ہمیں ایک بیدار ناخدا عطا کیا جب کہ کشتی امت اسلامی شب تاریک میں ہوائے مخالف اور بحر طوفاں خیز کے تھپیڑے کھا رہی تھی، مجھے قائد اعظم کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے، اور میں اپنے قلب و ضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ایک ایسے سالار کے کامل صفات موجود ہیں جو عقل و تدبیر کی اس جنگ میں عساکر اسلامیہ کو لڑا سکے، اب ہمارا کام ہے کہ ان کے اطراف جمع ہو جائیں، اپنے باہمی اختلافات کو رفع کریں اور ان کے احکام و ہدایات کی تعمیل کر کے ان کے ہاتھوں کو مضبوط کریں اور منزل کو قریب تر لائیں اور یاد رکھیں کہ:-

ع ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(بہادر یار جنگ)

(حوالہ: تقاریر جناح مرتبہ عثمان صحرائی۔ دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن مقدمۃ الکتاب از قلم قائد ملت نواب بہادر یار جنگ، مشمولہ نگارشات بہادر یار جنگ، مرتبہ نذیرالدین احمد، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد صفحہ نمبر ۳ تا ۱۱)

وہ ۱۹۳۶ء ہی میں مسلم لیگ کے قائد مسٹر محمد علی جناح میں صحیح مسلم قیادت کے جوہر کی چمک دیکھ چکے تھے اس لئے ان کی فراست اور بے نفسی نے قائد اعظم کی سیاسی امامت فوراً تسلیم کر لی۔

بہادر یار جنگ مملکتِ آصفیہ کی رعایا ہونے کی وجہ سے لیگ کے

باضابطہ رکن تو نہ بن سکتے تھے، وہ قائد اعظم اور لیگ کے ایک غیر رسمی مخلص مشیر، عملی معاون اور بے نیاز صلہ رضاکار بن گئے، ایک باشعور اور پُرعزم رضاکار چنانچہ انہوں نے غیر شعوری لیگی قدم کو لڑکھڑانے، ٹھوکر کھانے یا بھٹک جانے سے صرف بچا لیا بلکہ عام مسلمانانِ ہند اور زعمائے لیگ میں ایمانی سیاست کی روح پھونک دی۔ انہیں فکر اقبال سے ہم آہنگ کیا، اپنے خداداد تدبر اور زورِ خطابت سے کانگریس کے سنگین قلعے فتح کر کے قائد اعظم کے حوالے کر دیئے ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ بہادر یار جنگ لیگ کی پشت پناہی پر اُتر آئے اور چار پانچ برس کے اندر اندر ان کے تدبر، فراست اور ولولہ باطل شکنی کی دھاک سارے ہندوستان پر ایسی بیٹھ گئی کہ وار دھا اور وائسریکل لاج کے گرگہائے باران دیدہ قائد اعظم کے بعد انہی کو اپنا سب سے زیرک حریف سمجھنے لگے۔

تحریک پاکستان کے واقف جانتے ہیں کہ مسلم لیگ کی ستائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور کو ایک تاریخ ساز اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ اسی اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پاس ہوئی تھی اور ایک دیانتدار مؤرخ یہ تسلیم کرنے پر مجبور رہے گا کہ یہ اجلاس صرف اور صرف قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کی اعلیٰ تدبر اور فاروقی جرأت و ہمت کا رہینِ منت رہا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلم لیگ پر اتنا عرصہ گذر چکا تھا مگر قائد اعظم کا جی چاہنے اور علامہ اقبال کی دلی تمنا کے باوجود اب تک لیگ کا کوئی سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد نہیں ہو سکا تھا۔ (حوالہ: مضمون شائع شدہ در اخبار نوائے وقت ۲۵ جون ۱۹۸۶ء بعنوان "بہادر یار جنگ تحریک پاکستان میں")

سشن کے تیسرے دن یعنی ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو کل ہند مسلم لیگ کا اختتامی اجلاس دن کے ساڑھے دس بجے ہوا۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ قائد اعظم کی تجویز تھی کہ ایک مجلس عمل

بنائی جائے جو لیگ کی حکمتِ عملی کو عام کرنے میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہے۔ اسی مسئلہ کے تعلق سے نواب بہادر یار جنگ نے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم سے فرمایا:

"قائد اعظم! آپ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے مجھے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کر دوں، جو فہرست آپ کی مجلس عمل مرتب کرے، حکم دیجئے کہ آپ کے اس سپاہی کا نام سب سے پہلے اس فہرست میں شامل کر لیا جائے، میں آپ کو اس اجلاس کے سارے شرکاء کو سنسناتی ہوئی ہوا کو، اس پنڈال پر چمکتے ہوئے سورج کو، سارے کروبیاں کو اور خود خدائے قادر و قیوم کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ، آپ مجھے اس راستے پر کٹھن سے کٹھن منزل میں بھی پیچھے نہ پائیں گے۔

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

(حوالہ: کراچی شش از صمدانی نقوی ص ۱۹۳ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک حصولِ پاکستان کی تاریخی جدوجہد میں جو تاریخی کردار بہادر یار جنگ نے ادا کیا، اس کا اعتراف خود قائد اعظم نے فرمایا۔ ان ہی سے عہد آزادی کی نمود ہوئی، انہوں نے کاروان قومی کو وہاں چھوڑا جہاں سے حریت و عمل کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

(حوالہ: پاکستان کا نقیب از رئیس احمد جعفری)

"تحریک پاکستان میں حیدر آباد نے بے شمار دولت کے علاوہ بہادر یار جنگ کو بھی دیا جن کی خطابت نے اس تحریک کو دس کروڑ مسلمانوں کا مقصدِ حیات بنا دیا تھا۔

(حوالہ: طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ کے جلسہ منعقدہ کراچی، ۱۹۵۶ء میں پیر علی محمد راشدی وزیر نشریات و اطلاعات پاکستان کا اظہار خیال صفحہ ۱۸۹)

پاکستان کے حصول کے لئے مسلمان زعمار کی کوششیں بہ حیثیت مجموعی پاکستان کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ نواب صاحب مرحوم بھی اسی قافلے کے سالاروں میں سے ایک تھے جس کی انتھک کاوشوں اور سردوشانہ مساعی کا ثمر ہم آج مملکت پاکستان کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

(حوالہ: نقیب پاکستان از صمدانی نقوی)

"وہ تحریک قیام پاکستان کے ان قائدین میں تھے کہ تاریخ پاکستان لکھنے والا مؤرخ تاریخ پاکستان میں نواب بہادر یار جنگ کو نہیں بھلا سکتا۔

(حوالہ: بے مثال خطیب از مولانا عبدالحامد بدایونی ص ۳۰۲، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

مسلم لیگ کی جب بھی کوئی مستند اور مکمل تاریخ لکھی جائے گی تو مؤرخ کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ تحریک پاکستان کے عروج و فروغ میں اسے عوامی تحریک بنانے میں اسے قلب مسلمان کی دھڑکن کی صورت دینے میں بہادر یار جنگ کی دولت و شخصیت اور خطابت کا بہت بڑا حصہ تھا۔

(حوالہ: یہ ایک نام نہیں ایک تاریخ ہے' از رئیس احمد جعفری، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں ص ۱۴۴، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

بہادر یار جنگ کا تصوّرِ پاکستان

"قائدِ اعظم کے بعد وہی مسلم لیگ کے محبوب ترین لیڈر بن گئے اور ان کی ذات سے مسلم لیگ، پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کی بڑی توقعات وابستہ ہو گئیں، قائدِ اعظم ان کے خلوص و دیانت، قیادت اور خداداد صلاحیت سے بخوبی واقف اور متأثر تھے اور دل سے ان کی قدر کرتے' قائدِ اعظم کی نظر میں بہادر یار جنگ کی جو قدر و منزلت تھی وہ کسی اور قاید کو نصیب نہ ہو سکی۔

بہادر یار جنگ قائد بھی تھے، مقرر بھی تھے اور سیاست داں بھی، مگر بنیادی طور پر وہ صرف سچے مسلمان تھے اور ان کی تمام سرگرمیاں کی تہ میں ان کا جذبۂ ایمانی کارفرما تھا، وہ مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کرتے اور اسی روشنی میں دیکھتے تھے، تحریک پاکستان سے ان کی وابستگی میں یہی جذبۂ کارفرما تھا، چنانچہ جب انہیں مسلم لیگ کے قائدین میں ایک ممتاز ترین مرتبہ حاصل ہو گیا اور وہ اسلامی ہند کے محبوب ترین رہنما بن گئے تو انہوں نے مسلم لیگ کی سیاست کو بھی اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد شروع کر دی، ان کا یہ ایمان تھا کہ "جو سیاست قرآن کے منبع فیض سے سیراب نہیں ہوتی وہ سراب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی"، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد کا سرچشمہ صرف مغربی افکار و نظریات نہ ہوں بلکہ وہ ان حدود سے آگے بڑھ کر اپنی تنظیم

میں ایمانی قوت بھی پیدا کرے اور اس کے نصب العین کی حقیقی اساس اسلامی تصورات ہوں، چنانچہ وہ اس مقصد کو ذہن نشیں کرانے کے لئے پوری جدوجہد کرنے لگے تاکہ مسلم لیگ جب اپنے نصب العین یعنی پاکستان کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس سرزمین کو صحیح معنوں میں پاکستان بنا سکے اور پاکستان کے متعلق ان کا تصوّر یہ تھا کہ :

"پاکستان ایک انقلاب ہو گا، ایک نشأۃ ثانیہ ہو گی، ایک حیاتِ نو ہو گی، جہاں خوابیدہ تصورات اسلامی ایک مرتبہ پھر جاگیں گے اور حیاتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لے گی۔

چنانچہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ پاکستان کی منزل قریب تر آ رہی ہے تو انہوں نے اس بات پر پوری شدت سے زور دینا شروع کیا کہ تحریک پاکستان کا اصل مقصد اسلامی نظامِ حیات کی تجدید ہے اور یہ کوشش کرتے رہے کہ یہ تحریک غلط راستے پر نہ جا پڑے۔ اور پاکستان صحیح معنوں میں پاک انسانوں کی پاک سرزمین بن کر دنیا کے سامنے اسلامی مملکت اور اسلامی زندگی کا قابلِ تقلید نمونہ پیش کر سکے، یہی وہ نصب العین تھا جس کیلئے بہادر یار جنگ نے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دی تھیں...........

اور اسی مقصد کے لئے وہ تمام عمر جدوجہد کرتے رہے"

(حوالہ: پاکستان، مضمون بعنوان قائداعظم اور بہادر یار جنگ از شاہد رزاقی، مشمولہ اخبار الہلال، پاکستان)

اس خصوص میں جہاں بھی اور جب بھی (تقریر و تحریر میں) انہیں تصور پاکستان کا نقشہ پیش کرنا ہوتا، وہ الہٰی اور قرآنی پاکستان کا پاکیزہ تصوّر پیش فرماتے۔ زمزم کے مدیر کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ہندوستان کی تمام سیاسی کشمکش کا واحد حل، پاکستان کو سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں پاکستان کے لئے ہر قسم کی سعی اور کوشش حرام ہے، اگر پاکستان سے الہٰی اور قرآنی حکومت مراد نہیں ہے جس میں قانون سازی

کا بنیادی حق صرف خدائے قدوس کو حاصل ہو اور ہمارے بتائے ہوئے قوانین اس کی توضیح و تشریح کریں، میں زندگی کے ہر گوشہ اور حیات کے ہر پہلو کے لئے قرآنی نظام کو کافی اور شافی سمجھتا ہوں، چاہے حیات انسانی کا وہ گوشہ اخلاقی ہو یا علمی، اقتصادی ہو یا سیاسی، حالتِ امن سے متعلق ہو یا حالتِ جنگ سے اور یہی وجہ ہے کہ روسو کا قائل ہوں نہ کارل مارکس کا، نہ لینن کا قائل ہوں نہ ٹالسٹائے کا، نہ اینی بسنٹ کا قائل ہوں نہ گاندھی کا، اور اپنی اس بغاوت کا اقرار کرتا ہوں کہ اگر جناح بھی اس کے سوا کوئی اور نظام حیات چاہتے ہیں تو ان کا بھی قائل نہیں ہوں۔

(حوالہ: مکتوب ۱۶۲ ص ۲۰۹ تا ۲۱۱ موسومہ مدیر زمزم مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

"مجھے اپنی قوم کے نوجوانوں پر اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ پاکستان کے سورج کو فرنگی استعمار اور ہندو سرمایہ داری کے تاریک آسمان سے چھین کر اپنے ملت کے افق پر سجادیں گے اور یوں اسلام کو ایک خطۂ ارضی نصیب ہو جائے گا جس کو دیکھ کر بصیرت رکھنے والے آنکھیں پکار اٹھیں گی کہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے روشن ہو گئی ہے۔"

"یہ تھا بہادر خاں کا تصور پاکستان ــــ وہ بہادر خاں جو اقبال کا مردِ مؤمن تھا۔ وہ بہادر خاں جس نے اپنی زندگی کا قبلہ نما قرآنِ حکیم کو بنایا تھا، وہ بہادر خاں جس کی کارگہِ فکر میں ہماری قسمت کے ستارے ڈھلتے تھے۔"

(حوالہ: الہ آباد اسٹیشن از سید ابوالخیر کشفی ص ۳۹، مضمون مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

یہی جذبہ تھا جس کے تحت انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۴۱ء میں ایک تحریک پیش کرنے کی کوشش کی، جس میں کہا گیا تھا کہ

پاکستان کا دستور قرآن اور سنت کے مطابق ہوگا مگر نواب صاحب کی اس تحریک کو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ "یہ قبل از وقت ہے" اسی ناکامی کا ردعمل وہ معرکۃ آرا تقریر ہے جو کراچی میں مسلم لیگ کے آخری اجلاس میں نواب صاحب نے فرمائی، یہ تقریر مؤاخذہ بھی ہے اور منشور پاکستان بھی، اس تقریر میں پاکستان کے تعلیمی نظام، معاشی نظام اور ہر شعبۂ حیات سے متعلقہ قوانین کے الٰہی قوانین ہونے کی ضرورت پر بڑی تفصیل سے اظہار خیال فرمایا یہ نوائے سروش مسلم لیگ کے آخری اجلاس میں، نواب صاحب کی آخری آواز حق تھی، بالآخر لیگ کے پلیٹ فام سے قائداعظم نے قائد ملت کی تائید میں اس امر کا اعلان فرمادیا کہ پاکستان کا دستور الٰہی دستور ہوگا۔

علامہ اقبال کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کا سہرہ بہادر یار جنگ کے جذبہ ایمانی کے سر ہے۔ اقبال کے تصور پاکستان کو دنیا نے شاعر کا حسین خواب سمجھ رکھا تھا۔ سنہ ۱۹۴۴ء سے دس برس قبل تک "خود قائداعظم ہندوستان میں انگلستانی پارلیمانی جمہوریت کا تجربہ کرنے پر مصر تھے اور جداگانہ انتخابات کے قائل ہو چکے تھے لیکن اقبال کے تصور قومیت کو اس کی بنیاد پر ہندوستان کے شمالی مغربی گوشے میں اسلامی سلطنت کے قیام کو ایک ناقابل عمل لیکن خوش آیند نظریہ تصور کرتے تھے اور مسز سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں "ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر بنے ہوئے تھے، مجھ اقبال کے حلقہ بگوش کو ان کی سیاست اپنی طرف زیادہ مائل نہ کرسکی اور میں اس ملاقات کی یاد لئے ہوئے بمبئی سے حیدرآباد واپس آیا۔"

(حوالہ: جناح پہلی نظر میں — ایک تاثر ص ۴۶، مشمولہ نگارشات بہادر یار جنگ، مرتبہ نذیر الدین احمد، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدرآباد سنہ اشاعت ۱۹۶۸ء)

لیکن بعد ازاں قائداعظم کی عقابی روح کی بیداری نے پاکستان

کے حصول کو، برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی صیانت کا واحد وسیلہ سمجھا اور قائدِ ملّت کی رفاقت نے قائدِ اعظم کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ اب منزل دور نہیں ہے، قائدِ اعظم کو قائدِ ملّت کیا ملے ؎

موجِ نشاط آئی، کلی دل کی کھل گئی

تعبیرِ خوابِ حضرتِ اقبال مل گئی

علامہ اقبال کی صداقت مآب رہنمائی، بہادر یار جنگ کے عزائم کے لئے مہمیز ثابت ہوئی۔

"کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بابت ۱۹۳۰ء میں جو حکیم الاسلام علامہ اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں اسلام اور قومیت اور ہندوستانی قومیت اور اس کی فرقہ پرستی کی نوعیت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس امر کا اعلان کر دیا کہ ہندوستان میں یورپین اصول کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ مختلف فرقوں کے جداگانہ وجود کو تسلیم نہ کر لیا جائے، لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ حق بجانب ہوگا کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کو وجود میں لایا جائے۔ علامہ نے مزید فرمایا کہ وہ اپنی ذات کی حد تک ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی اس آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر جو اکثریت کے صوبے ہیں ایک مستقل ریاست قائم کی جائے" ہندوستان کو برطانیہ کے زیر سایہ حکومت خود اختیاری ملے یا کچھ اور ملے، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کا مقدّر بن چکا ہے۔"

حضرت اقبال کی یہ خالص صداقت مآب رہنمائی بہادر یار جنگ کے عزائم کے لئے مہمیز ثابت ہوئی، اسی وقت سے وہ پاکستان کا نقشہ تیار کرنے لگے، پاکستانی حکومت الٰہی حکومت ہوگی، اس کا دستور قرآنی دستور

ہوگا۔ وہاں کے باشندے منفرداً اور مجتمعاً صحیح معنوں میں مسلمان ہوں گے، وہاں کے معاملات علیٰ منہاج نبوت طے پائیں گے۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور میں قیام پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی، لیگ کے اجلاس کی رسمی کارروائی کے اختتام کے بعد قائدِ اعظم نے نواب بہادر یار جنگ کی تقریر کا اعلان کیا۔ ہر سال لیگ کے اختتامی اجلاس کے بعد اس سحر البیان خطیب کی تقریر ایک مستقل روایت بن گئی تھی، نواب صاحب نے "مغربی طرز جمہوریت اور اسلامی جمہوریت" کے عنوان پر ایمان افروز تقریر کی جس کے دوران آپ نے فرمایا کہ "پاکستان کی قرارداد منظور ہو چکی ہے اور پاکستان کا قیام انشاء اللہ عمل میں آئے گا۔ میرا ایقان ہے کہ وہاں کی حکومت حکومتِ الٰہیہ ہوگی، اس کا دستور قرآنی دستور ہوگا۔ اگر ایسا نہیں تو ہمیں ایسے پاکستان کی ضرورت نہیں ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ اپنے بیان کی توثیق کے لئے میکروفون قائدِ اعظم کے قریب کر دیا، قائدِ اعظم نے نہایت ہی معنیٰ خیز جواب دیا WHY DO YOU CHALLENGE BEFOREHAND........ یہ سنتے ہی نواب صاحب نے اعلان فرمایا کہ "میں قائدِ اعظم کے ان الفاظ کو اپنے بیان پر مُہرِ تصدیق تصور کرتا ہوں"

کراچی کے اجلاس میں اپنی تقریر کا حال نواب صاحب خود بیان کرتے ہیں:- "لیگ کے پلیٹ فارم سے اللہ نے میری زبان سے اعلان کرا دیا کہ پاکستان کا دستور الٰہی دستور اور وہاں کی حکومت قرآنی حکومت ہوگی، اور سب سے بڑھ کر قابلِ مسرت یہ کہ جب میں دورانِ تقریر میں اس مقام پر پہنچا تو قائدِ اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکّا مار کر فرمایا YOU ARE QUITE RIGHT یعنی تم بالکل درست کہتے ہو اور میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ قائدِ اعظم سے میرے قول پر سندِ تصدیق مل گئی"

اُن کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی تصوّر پاکستان قرآن کی تصریحات

پر مبنی تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا جو مقصد آیت ھوالذی ارسل رسولہ بالہدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون سے ظاہر ہے اس کی تشکیل ان کے پیشِ نظر تھی، ان کی جدو جہد کا تمام تر یہی مقصد تھا کہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے، اسلام اور مسلمانوں کی برتری ان کا ایمان اور ایقان بن گیا تھا، چنانچہ حیدر آباد کے مجوزہ قانون اصلاحات کے خلاف جہاد کر کے مسلمانوں کی اکثریت کا ضابطہ مرتب کیا اور اس کو رو بہ عمل لانے کے لئے تحریری تیقن حاصل کیا، اسی آیت کو وہ پاکستان میں بھی متشکل دیکھنا چاہتے تھے۔ نواب صاحب نے پاکستان کا جو نقشہ بنایا تھا اُس میں زندگی بھر اپنے خونِ جگر سے رنگ بھرتے رہے، حیدر آباد، ناگپور، دہلی، علیگڈھ لاہور، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلم لیگ کے ترجمان اور پاکستان کے نقیب کی حیثیت سے مطالبۂ پاکستان کی واجبیت کو تسلیم کرانے میں اپنی خطابت کا سارا زور صرف کر دیا، ان کا صرف تخیّل ہی نہیں ایقان تھا کہ پاکستان اسلامی ریاست ہوگی، وہاں کا دستور قرآنی ہوگا، پاکستان کا ہر باشندہ توحید کا علمبردار ہوگا۔ قرآن نے کنتم خیر اُمۃٍ اُخرجت للناس کا جو تاج خاتم النبیین کی امّت کے سر پر رکھا ہے، پاکستان کے اس وقار کو قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوگا، ہر فرد اپنے طرزِ عمل کو اسلامی نصب العین کے سانچہ میں ڈھالے گا۔ ..... اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی تعمیل کا احساس پیدا کیا جائے گا، عسکریت اس کا شعار ہوگی، اس کی فضا میں روحِ جہاد زندہ ہوگی، حسنات کا دور دورہ ہوگا، سیّئات کا وجود باقی نہ رہے گا، عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، نظریات، علوم وفنون، قانون تہذیب وتمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست، الغرض حیات کے ہر شعبہ میں انقلاب علیٰ منہاج نبوت عمل میں آئے گا، یعنی قرآنِ حکیم کی تصریح کے مطابق تلاوتِ آیاتِ تزکیۂ نفس، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت

کے مراحل میں اس کی تکمیل عمل میں آئے گی، اولاً فکر کی، ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ کی محکم اساسات پر تعمیر ہو گی تاکہ قلب نور ایمان سے منور ہو جائے اور ہر عمل سے اسلامی کردار کی عکاسی ہونے لگے جس کے نتیجہ میں فرقہ بندی اور صوبہ واریت کا خاتمہ ہو جائے، اللہ کی بخشی ہوئی امامت کے اقتضائات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پاکستان کے اربابِ بست وکشاد اللہ کی زمین پر فتنہ و فساد کا قلع قمع کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں گے تاکہ عرصۂ حشر میں شہداء علی الناس کے امتحان میں اہل پاکستان کی سرخروئی ان کا مقدر بن جائے۔

جہاں تک مادی حیات کا تعلق ہے، تسخیر کائنات کے پہلو سے صرفِ نظر نہیں کی جائے گی، پاکستان کی نئی نسل سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو وقف کر کے تحقیقات اور انکشافات اور ایجادات کے میدان میں ہمعصر اقوام سے مسابقت میں اپنے وطن کا نام روشن کریں گے، موجودہ اسلامی ریاستوں سے پاکستان کا حلیفانہ تعلق قائم ہو گا تاکہ معاندین اسلام پر وہ اتحاد کے ذریعہ برقِ خاطف بن کر مسلّط ہو جائیں۔

غرض وہ ارض پاکستان میں عہد خلافتِ راشدہ کی خصوصیات کو زندہ کرنا چاہتے تھے، ان ہی کی نوائے سرودش سے سرحد میں مسلم لیگ کو انتخابات میں کامیابی نصیب ہوئی، فقیر ایپی کی دہشت ناک سرگرمیوں سے سرحد کا ہر فرد لرزاں و ترساں تھا اور نگ زیب خاں اور قاضی عیسیٰ جیسے قائدین بھی اس کے نام سے چونک پڑتے تھے، پاکستانی وفد جب نواب صاحب کی قیادت میں سرحد کا دورہ کر رہا تھا تو اُس نے آپ کی خدمت میں سَلام کے ساتھ پیام بھیجا تھا کہ ان کی تشریف آوری کی اطلاع ملنے پر امن کے انتظامات کر دیئے گئے ہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کی خدمت اور اس کو بیدار کرنے کا ایک جذبۂ بے پایاں تھا کہ ان کو دشت و صحرا کا مسافر اور رزم و بزم کا قائد بنا دیا تھا۔

"ملک است تن خاکی و دین روح و روان است" کی حقیقت ان پر منکشف ہو چکی تھی، ان کا پیام و کلامِ مجاہد کی شمشیرِ بے نیام تھا جو باطل کو خس و خاشاک کی طرح کاٹ کر حق کا بول بالا کر دیتا تھا، پاکستان کی ہر جہتی تعمیر کے لئے انہوں نے معاشرے کے کیسے کیسے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے، کراچی کے سالانہ اجلاس میں ان کے نعرۂ حق کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے، فرماتے ہیں:

"سن لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر نہیں وہ شیطانی سیاست ہے۔ دوستو! جسمانی ناپاکی دور ہو سکتی ہے لیکن ذہن و فکر اور قول و عمل کی ناپاکی و گندگی ہے جس کو پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل مبعوث کئے، کیا ناپاکیوں کا مرکز بن کر جھوٹ کو روز مرّہ کا شعار بنا کر مکر و فریب میں مبتلا رہ کر، ظلم و استبداد کو جاری رکھ کر ہم یہ دعویٰ ... کر سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں؟ اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے اور ہمیں ہندوستان کے دونوں گوشوں میں خود مختار ریاستیں مل بھی گئیں تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہوں گی؟ آج سے پاک بننے کی کوشش کرو، یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے، مکر و زور کی سیاست طالبان پاکستان کی سیاست نہیں ہو سکتی، آپ کی کونسل آف آکشن کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج سے پاک کرنا شروع کر دے مگر آہ! یہ حقیقت ہے سپاہی اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ سالار پاک نہ ہو جائے ۔ سنو! اسلام کے عہد آخر کا سب سے بڑا مفکّر کیا کہہ رہا ہے:۔

عطّار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی طبیعت میں بوئے اسد اللّٰہی

شہ نشیں پر بیٹھنے والوں کو مخاطب کر کے:۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی .:. جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"

لیگ کے ایک اور سالانہ اجلاس میں نواب صاحب کی تقریر کیا تھی گویا ایثار و فدویت کی روح بول رہی تھی:۔

"آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں جو شجر ملّت پر پھول بن کر چمکنا اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہیں، ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بنیں جو زمین میں جذب ہوتی ہے جو خود فنا ہوتی ہے اور پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتی ہے ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ وایوان کے نقش و نگار بن کر نظارہ باز کی آنکھوں کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں، ہم کو بنیاد کے اُن پتھروں کی ضرورت ہے جو ہمیشہ کیلئے زمین میں دفن ہو کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں"

"نواب صاحب قول کے دھنی اور اپنی بات کے پکے تھے، جو کہتے تھے کر دکھاتے تھے، انہوں نے جہاد کا عمل جاری رکھتے ہوئے جان، جان آفریں کے سپرد کردی، اگر اللہ نے انہیں کچھ اور زندگی دی ہوتی تو پاکستان کی تعمیر میں وہ اپنا کردار ادا کرتے، یہی نہیں بلکہ حیدرآباد، جنوبی ہند میں ایک اور پاکستان کی صورت میں جلوہ گر ہوتا، وہ ایک طوفان کی طرح حیدرآباد کے افق پر نمودار ہوئے، سحابِ رحمت بن کر غیر منقسم ہندوستان پر برسے، مسلم ہندوستان کے بارہ میں حضرت اقبال کی پیشین گوئی کو حقیقت بنانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، قائداعظم کے مشیرِ خاص اور دستِ راست کی حیثیت سے پاکستان کے لئے مردانہ وار میدانِ جہاد میں سر اور دھڑ کی بازی لگادی اور اسی کوشش میں وہ مردِ غازی شہید بھی ہوگیا۔"

ہونگی اَے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت | لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دِل پر تیر کون | ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون

(حوالہ: بہادر یار جنگ کا تصوّر پاکستان ۔ از مولوی عبدالرحمٰن سعید صدیقی۔ مشمولہ ہفتہ روزہ پاکستان یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء شکاگو)۔

آخری نظام کے دور کی ریاست حیدرآباد کا جغرافیائی خاکہ

مغربی گھاٹ اور مشرقی گھاٹ کے درمیان ایک تکونی شکل کی سطح مرتفع واقع ہے جو سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے، اسی کے وسط میں ریاستِ حیدرآباد واقع تھا۔ تراسی ہزار مربع میل پر محیط ۱۶ ضلعوں اور چار صوبوں پر یہ ریاست مشتمل تھی اور یہ ریاست ممالک محروسہ سرکار عالی کہلاتی تھی۔ زبانوں کے اعتبار سے کرناٹک، مرہٹواڑہ، تلنگانہ تین حصوں میں منقسم تھی (لسانی بنیادوں پر تقسیم کی بنیاد پر یہ تینوں علاقے تقسیم ہو گئے اور اب آندھرا پردیش (تلنگی) حکومت کرناٹک میسور (کنڑی) حکومت مہاراشٹر (مرہٹی) میں ضم کر دیئے گئے۔ اس ریاست میں ۵ دریائیں تھیں جو دریائے گوداوری، دریائے کرشنا، دریائے پورنا، دریائے مانجرا اور دریائے مانیر کے ناموں سے موسوم تھیں اور پہاڑ بھی پانچ تھے۔ سیادری پربت، بالاگھاٹ، یامنی گرڈھ، راکی گرڈھ، کنڈیکل گرڈھ۔ ندیاں، جھیل اور تالاب اور باؤلیاں بھی پینے کے پانی اور زراعت کے لئے معاون حیثیت کے حامل تھے۔

ریاستِ حیدرآباد ایک زرعی ملک تھا اس کی ۹۰٪ آبادی کھیتی باڑی کر کے گذر بسر کرتی تھی۔

نیشکر، گورانی روئی، تمباکو، ارنڈی، کمبودیا روئی، ہڈیوں کی کھاد، ریشم کے کیڑے، میووں کے باغات، ترکاری کے کھیت کے علاوہ اناج (غلہ) میں چاول، گیہوں، جوار، باجرا، مکئی، اُرد،

مونگ، تل، جو، چنا، کرڑ، السی کی پیداوار شامل تھی۔ سال میں دو فصل ہوتے تھے (۱) خریف (۲) ربیع۔

میووں میں آم، امرود، بیر، جامن، سیتا پھل، انجیر، سنگترے، نارنگی، خربوزے، تربوز، کھیرے، سنگھاڑے، کویٹ، رام پھل، منجل، گیگل اور روغنی تخم میں السی، ارنڈی، مونگ پھلی اور بنولہ شامل ہیں۔

ریاست کے گھنے جنگلات میں کارآمد لکڑی بکثرت پائی جاتی تھی ساگوان، بیجاسال، آبنوس، شیشم ساتھ ہی ان جنگلات سے ٹسر، شہد، موم، لاکھ، گوند، روسہ، نیل، ببول، سیاہ ہلیلہ، ترورٹ، املتاس، کُسم کے درختوں کی چھال پتے اور گوند سے بھی حکومت کو بڑی آمدنی ہوتی تھی۔

ان گھنے جنگلات میں شیر، چیتا، تیندوا، جنگلی سور، بھیڑیا، جنگلی بکری، بندر، ریچھ، گیدڑ، ارنا بھینسا، نیل گائے، سانبھر، چیتل، ہرن بارہ سینگھے اور پرندوں میں، تیتر، بٹیر، کبوتر، بلبل، طوطا، مینا، کویل فاختہ، مرغابی، سارس، سرخاب، قاز، بط، اسناف، ہریل، شکرا، باز بکثرت پائے جاتے تھے۔

معدنی ذخائر میں کوئلہ، سنگ سیلو، سونا، گرافائیٹ، لوہا، تانبا، ابرک، پوٹاش، سفید کھریا، بلغم، گیرو، کوئلہ شامل ہیں۔

ممالک محروسہ سرکارعالی کی صنعت وحرفت میں (یعنی دستکاری میں پیتھمبر، ریشمی کپڑے، ہمرو، مشروع، کمخواب، ریشمی اور سوتی ساڑیاں، ٹسر کے کپڑے، تیلیا اور سادہ رومال، قالین، چاندی کے تار کا کام (کریم نگر جال کا کام) بدری صنعت، پیتل کے برتن، دیسی کاغذ، کپڑا بننے کی صنعت، روئی صاف کرنے اور روئی سے دھاگہ بنانے کی صنعت، سونے کے زیورات، جڑوائی زیورات کی

صنعت، سگریٹ، دیاسلائی، سمینٹ، شکرسازی، کانچ، چینی کی صنعت انگریزی اور مغلائی کویلوسازی کی صنعت، اعلیٰ معیاری کپڑوں کی تیاری کی صنعت، اسبطاس کی صنعت اور دیگر ہر اہم قومی ضرورت کی کفالت کرنے اور برآمد کے ذریعے ریاست کی معیشت کو مستحکم بنانے میں ان صنعتوں سے کافی مدد ملی۔ اور ریاست کی تیار کردہ یہ اشیاء آج بھی ساری دنیا میں شہرت رکھتی ہے۔

رسل و رسائل میں بیل گاڑی سے ہوائی جہاز تک کی سہولتیں شہریوں کو حاصل رہیں۔ محکمۂ صنعت و تجارت، محکمۂ زراعت، محکمۂ اعداد و شمار، محکمۂ تعلیمات، محکمۂ طباعت، محکمۂ ٹپہ محکمۂ بلدیہ، محکمۂ پولیس، محکمۂ سمکیات، محکمۂ جنگلات، محکمۂ آبپاشی، محکمہ آب رسانی غرض ہر شعبۂ حیات سے متعلقہ محکمہ اپنے مفروضہ فرائض، ایک ترقی یافتہ حکومت کی اساس پر انجام دیتے رہے۔

مخفی مباد سارے ہندوستان کی ریاستوں میں ریاستِ حیدرآباد وہ واحد ریاست تھی جس کا سکہ، ٹپہ، ریل، پولس، فوج کا تعلق انگریزوں کے سکہ، ٹپہ، پولس، فوج اور ریل سے الگ اور آزادانہ تھا۔

یہ امتیاز صرف ریاستِ حیدرآباد کو حاصل تھا، ریاست کے رقبہ، آبادی، وسائل معاش اس کا مستحکم مالیہ اور حسنِ انتظام کے لحاظ سے انگریزوں کے لئے بھی ریاست حیدرآباد ایک قابلِ رشک ریاست رہی۔

اس شہر کی بنیاد محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ ہجری میں ڈالی، قطب شاہوں سے ساتویں نظام تک اس سابق فصیل بند شہر میں چار مینار، مکہ مسجد، جامع مسجد، دارالشفاء، گولکنڈہ، عثمانیہ دواخانہ عدالت العالیہ کی عمارتوں کے علاوہ تعلیم کے مسئلہ میں ہر ضلع میں مدارس

اور شہر حیدر آباد میں سٹی کالج اور جامعہ عثمانیہ کے قیام نے ایک تاریخی رول ادا کیا، جامعہ عثمانیہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کہلاتی ہے اس یونیورسٹی میں جملہ علوم بشمول سائنس کی و ڈاکٹری کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام کیا گیا اور مادری زبان (زبان اُردو) میں تعلیم کا انتظام و انصرام عمل میں آیا، اس یونیورسٹی کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی، سارے ہندوستان کے لائق ترین لوگ اس جامعہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور کئے گئے، جامعہ عثمانیہ کے قیام سے کالج کی سطح کی تعلیم کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور اس مادر جامعہ کے سپوتوں نے دنیا میں اپنی مادر جامعہ کے نام کو روشن کیا ملک میں ہر طرف امن و امان تھا۔ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح زندگی گذارتے تھے، ریاست کا وزیر اعلیٰ (صدر اعظم) ہندو طبقہ سے متعلق ہوتا، اضلاع میں پٹیل پٹواری اور پولس پٹیل کی جائیدادیں ہندوؤں کے لئے وقف تھیں، مسلم اوقاف سے ہندو اوقاف کی آمدنی ۷۰٪ بڑھی ہوئی تھی۔

سیاسی جغرافیہ

آخری تاجدار دکن انگریزوں کے یار وفادار تھے اور انگریزوں کے ہر اشارے پر ناچتے تھے، فرانسیسیوں سے انگریزوں کی جنگ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور ٹیپو سلطان شہید کے سلسلے میں جو کچھ سلطنتِ آصفیہ کے فرمانرواؤں نے کیا وہ داغ تاریخ کے صفحات سے مٹ نہیں سکتا۔ مگر اس کے باوجود جنوبی گوشہ ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ ساری دیسی ریاستوں میں معاہدات وسیع رقبہ، مالی استحکام اور انگریزوں سے وفاداری کے باوجود نظام الملک آصف جاہ اول بانی مملکتِ آصفیہ کے دور میں جس ریاست کے حدود سرنگا پٹنم، مچھلی پٹنم، برہان پور، برار

وغیرہ کے علاقوں پر مشتمل تھی۔

انگریزوں نے اس وسیع مملکت کو اپنی حکمت اور چالاکی سے اتنا مختصر کردیا کہ یہ ریاست صرف ۱۶ اضلعوں پر مشتمل باقی رہ گئی۔ اگرچہ دوسری جنگ سے قبل برار کو معاہدے کی صورت میں ریاست حیدرآباد میں شامل کردیا گیا۔ جب برار کو معاہدے کے تحت (بغیر اختیار وانتظام) نظام کی ریاست کا جز قرار دے دیا گیا تو نظام نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ:

"برار حیدرآباد کا جز لاینفک ہے، حالانکہ یہ جز کل سے جڑا نہیں بہرحال حیدرآباد اور برار کی شمولیت کے مفروضہ کے پس منظر میں ۴۵۹۰۰۱ مربع میل پر ریاست مشتمل ہوگئی۔ اور اس کی آبادی ۱۷۸۷۲۹۸۶ تھی۔ اس علاقے کو شامل کئے بغیر سلطنت کا رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل تھا، اس کی آبادی (۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں) ۱۴۴۳۶۱۴۸ تھی۔

سلطنت کے رقبہ کا ۵۸٫۵۰ فیصد خالصہ یا دیوانی علاقہ تھا اور باقی صرف خاص، پائیگاہوں، سمستانوں، جاگیرات، انعامات پر مشتمل تھا ریاست حیدرآباد میں مواضعات کی تعداد تخمیناً ۲۲۵۰۰ اور اس کی مجموعی آمدنی ۹۱۳۶۶۰۰۰ سالانہ تھی، حیدرآباد کی کل آبادی کا تناسب اس طرح تھا:- ہندو ۹۶۹۹۶۱۵۔ مسلمان ۱۵۳۴۶۶۶۔
عیسائی ۱۵۱۳۸۲۔ جین ۲۱۵۴۳۔ سکھ ۵۱۷۸۔
پارسی ۱۷۸۴۔ آریہ سماج ۳۷۰۰۔ برہمو سماج ۱۸۲۔
ادی ہندو ۲۴۷۳۲۲۳۰ پر مشتمل تھی۔

حیدرآباد کو اگرچہ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے دیسی ریاست کا نام دیا تھا لیکن اپنی وسعت آبادی، دولت کے قدرتی ذرائع، صنعت وحرفت، علم وفضل، تہذیب وتمدن کے لحاظ سے کامل اور آزاد مملکت کی پوری صلاحیتوں کی حامل ریاست تھی، رقبہ کے لحاظ سے یہ

یورپ کی اکثر آزاد اور خود مختار سلطنتوں سے بڑی اور بعض بڑی بڑی سلطنتوں کے برابر تھی، قدرتی ذرائع زراعت، معدنیات، جنگلات کی نعمتوں سے مالامال اور مالی استحکام کی حامل، لیکن انگریزوں کی پوری گرفت میں.

نظام اور ان کے اجداد انگریزوں کے ہمیشہ وفادار و تابعدار رہے اور ہر عوامی انقلاب کے موقعہ پر عوامی طاقت کو کچلنے اور انگریزوں کے اقتدار کو مستحکم بنانے میں رقمی اور فوجی مدد کی۔ اور اسی قومی غداری کی مسرت میں یار وفادار سلطنت برطانیہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے.

ریاستی نظم و نسق برطانوی نمایندے (وایسرائے) کے مشورے سے مقرر کردہ وزیر اعظم کے مشورے سے حکومت چلتی تھی۔

حکومت نظام کی سیاسی حیثیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ برطانوی حکومت کا نمائندہ قلب شہر میں معہ فوج (RESIDEN C Y FORT) سلطان بازار میں قیام پذیر رہتا.

ساتھ ہی برطانوی مفاد کی حفاظت کیلئے سکندرآباد، ترملگیری، لالہ گوڑہ اور دیگر مقامات پر انگریزوں کی فوجی چھاؤنیاں قائم تھیں.

اس فوج میں ہندو، راجپوت، ڈوگرا اور سکھ فوج متعین تھی.

حکومت آصفیہ انگریزوں کی کٹ پتلی حکومت تھی، ہر صدر اعظم وایسرائے کا منتخب اور مقرر کردہ ہوتا۔ یہ وہ شخصیتیں ہوتیں جو حکومتِ برطانیہ کے وفادار نمک خوار ہوتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ریاست پوری طرح انگریزوں کے ایماء واشارے کی محتاج ہوتی۔

" وزیر اعظم کو صدر اعظم پریسیڈنٹ آف دی کونسل کہتے تھے.

صدر اعظم کا تقرر نظام کرتے تھے مگر وایسرائے یا CROWN REPRESENTATIVE کے مشورہ سے اس واسطے صدر اعظم حیدرآباد گورنمنٹ برطانیہ کے اثر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا تھا، یہ بہت پرانا طریقہ چلا آرہا

تھا۔ لیکن لارڈ ریڈنگ کے زمانہ میں کسی ناسمجھ مشیر کے مشورہ سے حضور نظام نے ایک خط وایسرائے کو لکھدیا جس میں معاہدے جات کی بنار پر حضور نے برٹش حکومت کے ساتھ مساوات اور برابری کا مرتبہ تسلیم کرنا چاہا، یہ بات انگریزی حکومت کو گراں گذری اور ستم یہ کیاکہ اس خط کو اخبارات کو دیدیا، اس سے ناگواری ہوئی، لارڈ ریڈنگ نے ایک سخت خط نظام کو لکھا جس کا منشا یہ تھاکہ ان کی حیثیت بالکل اور والیان ملک کی حیثیت کے برابر ہے، برٹش حکومت سے کوئی سوال مساوات کا پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد نظام کے اختیارات پر مزید قیود لگائے گئے، ایک انگریز آئی، سی، ایس وزیر جو حکومتِ ہند کا تجویز کردہ ہوتا تھا، حضور نظام مقرر کرتے تھے اور ہمیشہ پولس مالگذاری اور جنرل ایڈمنسٹریشن کے محکمہ جات اس کے حوالہ کئے جاتے تھے اس طرح برٹش حکومت کا ایک افسر حکومتِ حیدرآباد کے درولبست پر اثرانداز ہوتا تھا، اس واقعہ سے پہلے فقط وزیراعظم کا تقرر وایسرائے کے مشورے سے ہوتا تھا، اب دوسرے وزرار کے تقرر میں بھی ریزیڈنٹ سے مشورہ لازمی ہوگیا۔

میں نے وہ معاہدے دیکھے ہیں جو زمانہ سابق میں برٹش اور حیدرآباد کے درمیان ہوئے ہیں، ان کی عبارت ایسی ہی ہے جیسی دو برابر کی حکومتوں میں ہونی چاہیئے لیکن MIGHT IS RIGHT یا ہماری زبان میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"، پہلے بھی صحیح تھا اور آج بھی ہے۔ ہمیشہ صحیح رہے گا۔ زبردست ناانصافی کے واسطے سینکڑوں بہانے بناتا ہے اور زیردست منہ تکتا رہ جاتا ہے"

(حوالہ: یادِ ایام از نواب صاحب چھتاری ص ۶۳ تا ۶۵)

اس طرح ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

حیدرآباد میں آبادی کا تناسب؟

سر علی امام کی تحریک کے احیاء کیلئے قائد ملت کی کوششیں

برصغیر کی سب سے بڑی ریاست، جس کو سلطنت کہا جاتا تھا کا رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل تھا اور اس کی آبادی ۱۴۴۳۶۱۴۸ نفوس پر مشتمل تھی، ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے ہندو ۹۶۹۹۶۱۵، مسلمان ۱۵۳۴۶۶۶، عیسائی ۱۵۱۳۸۲، جین ۲۱۵۴۲، سکھ ۵۱۷۸، پارسی ۱۷۸۴، آریہ سماج (ہندو) ۳۷۰۰، برہمو سماج (ہندو) ۱۸۲، ادی ہندو (ہندو) ۲۴۷۳۲۳۰ تھی۔

اس پس منظر میں، سر علی امام نے اقلیت کو اکثریت میں متبدل کرنے کا ایک عظیم منصوبہ بنایا مگر یہ تحریک پروان نہ چڑھ سکی اور اس تحریک کو سیاسی موت کی آغوش میں سلا دیا گیا۔

فراست کا تقاضا تھا کہ دکن میں مسلمانوں کی اقلیت سے پیدا شدہ مسائل کے حل کے لئے اس کام کی تکمیل کی جائے جس کی بنیاد سر علی امام نے رکھی تھی،

۱۹۳۸ء میں علاقہ ترکستان کے کئی ہزار جلاوطن تبت کے راستے کشمیر آئے، کشمیر کے راجہ نے ان مظلومین کا قافیہ حیات تنگ کر دیا، اس مسئلہ کی یکسوئی، ملی اور سیاسی ہر دو نقطۂ نظر سے قائد ملت کی توجہ کی محتاج تھی۔

قائد ملت نے صدر اعظم باب حکومت سر احمد سعید خاں نواب صاحب

چھتاری کو اس مسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے جو جملہ تحریر فرمایا تھا وہ اس مسئلہ کے حل کی ملی اور سیاسی اہمیت کی کامل وضاحت کا مظہر تھا کہ:

"یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی یہ خدمت تاریخ حیدرآباد میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اپنے اس تاریخی مکتوب میں قائد ملت نے نواب صاحب چھتاری کو اس مسئلہ کے پسِ منظر اور اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

ایک خاص مسئلہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں، آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ قازق علاقہ ترکستان کے کئی ہزار جلاوطن تبت کے راستے کشمیر میں وارد ہوئے ہیں، حکومتِ کشمیر نے تو ان پر بہت سے مظالم کئے لیکن حکومتِ برطانیہ نے اخباری اطلاعوں کے مطابق ان کو ہندوستان میں آباد کر لینے کا ارادہ کر لیا ہے، میرے خیال میں یہ بہترین موقع ہے کہ حیدرآباد ان پر اپنے دامن کا سایہ پھیلا دے، تھوڑا شور ضرور مچے گا لیکن کامیابی یقینی ہے اور فوائد ظاہر ہیں، آصف آباد اور نظام آباد میں ہزاروں ایکڑ اراضی افتادہ پڑی ہیں اور وہاں ان کو آسانی سے آباد کیا جا سکتا ہے، بیشک ابتدائے کار میں تھوڑا روپیہ بطور تقاوی وغیرہ خرچ کرنا پڑے گا، ضرورت صرف تھوڑی فراست اور جرأت کی ہے جس سے کام بہ آسانی پورا ہو سکتا ہے، میری رائے میں حکومت کے سامنے اس مسئلہ کو رکھنے سے قبل اگر جناب حکومت برطانیہ سے اپنے طور پر گفت و شنید فرمائیں اور اس کو آمادہ کر لیں تو بہت مناسب ہوگا، میں اس کام کی طرف آپ کی خاص توجہ کا متمنی ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی یہ خدمت تاریخ حیدرآباد میں ہمیشہ یادگار رہے گی اور آپ اس کام کی تکمیل کریں گے جس کی بنیاد سر علی امام مرحوم نے رکھی تھی، میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اس کی توفیق و طاقت عطا فرمائے۔

(حوالہ: خط موسومہ نواب صاحب چھتاری ص ۲۸۲ مکتوب نمبر ۲۵۶، مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ)

اسی طرح افریدیوں اور مہمندوں اور خٹک کے عوام کو بھی وہ دکن کی سلطنت سے قریب کرنے کی کوششوں میں رہے ایک خط میں اپنی اس تمنا کا اظہار فرمایا تھا کہ:

"میری اپنی تمنا ہے کہ افریدیوں اور مہمندوں کی طرح قوم خٹک کے تعلقات بھی دکن کی اسلامی سلطنت سے قائم ہوں، میں اسکے لئے کوشش کرونگا"

اپنے ایک مکتوب (خط نمبر ۵۲ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم) میں حیدر آباد میں مسلم آبادی کے اضافے کے ضمن میں وضاحت فرماتے ہیں:

"پٹھانوں کی بھرتی کی نسبت کوشش جاری ہے، پائیگاہوں اور صرف خاص کو بھی آمادہ کیا جا رہا ہے، مسلم آبادی میں اضافے سے متعلق بھی ایک سے زیادہ تجاویز پیش ہیں"

روسی علاقہ قازمستان کے جلاوطن مسلمانوں کو باز آباد کاری کے ضمن میں بھی قائد ملت نے کوئی دقیقہ فروگذاشت باقی نہ رکھا، مگر ان کی ساری کوششیں ناعاقبت اندیش حکمرانِ وقت اور خود غرض اربابِ حکومت کی ابلہ فریبی کے باعث شرمندہ معنی نہ ہوسکے۔

اپنے مکتوب (مکتوب نمبر ۱۴۲ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم) میں قازق جلاوطنوں کی باز آباد کاری کے ضمن میں حکومت کی سرد مہری پر اپنے تلخ احساسات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"قازق جلاوطنوں کی نسبت وعدے کئے گئے ہیں لیکن عقل وجرأت کی کمی ہے، بیشک اب وقت آگیا ہے کہ انتظار کے بغیر اس خود غرضی اور ابلہ فریبی کی دنیا کے زمین وزماں کو برہم کردیا جائے۔ خدا وہ وقت جلد لائے"

اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم

شمس الملۃ والدین شاہ دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

سلطنتِ آصفیہ کے ساتویں اور آخری فرماں روا نواب میر عثمان علی خاں صاحب تھے جن کے القاب بے شمار تھے۔ دورِ شہزادگی میں اُن کی تعلیم و تربیت مثالی ہوئی، وہ انگریزی، فارسی، اُردو اور عربی پر عبور رکھتے تھے، ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اپنے وقت کے لائق ممتاز علماء و اساتذہ سے انہیں استفادے کا موقعہ نصیب ہوا، شاہی خانوادے میں شاہی آداب اور امورِ مملکت کے رموز سے آگاہی کے باعث انہیں خود بادشاہ بن جانے کے بعد کسی رہبری و رہنمائی کی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔ درباری سازشوں اور سازشوں کے عواقب و نتائج سے بے خبر بھی نہ تھے اگر بے خبر ہوتے تو آصفی سلطنت کے جائز حق دار چھٹے بادشاہ نواب میر محبوب علی خاں کے جائز وارث نواب بسالت جاہ بادشاہِ وقت ہوتے بادشاہ بنتے ہی ان تماموں کو بے آبرو کیا جنہوں نے جان کی بازی لگا کر انہیں تخت پر بٹھایا تھا۔

چوں کہ ملوکیت کے شیطانی تصور نے مسلمان کو بادشاہ کا پرستار بنا دیا اس لئے ان کی ذات دکن کے مسلمانوں کے نزدیک قابلِ پرستش بن گئی۔ دکن کے مسلمان سے زیادہ سادہ لوح مسلمان دنیا کے کسی گوشے میں نہیں تھا، پوری ریاست کی رعایا پر جو حکومت کے خزانے پر خرچ آتا تھا اس سے دو چند نظام کے ذاتی خزانے میں جاتا تھا، دولت، سونا چاندی

ہیرے جواہرات کے مالک کی حیثیت سے دنیا کے متمول ترین انسانوں میں راک فیلر کے بعد ان کا شمار ہوتا تھا۔ نذرانوں کے ذریعے رقم جمع کرنا، صاحب حیثیت امراء عظام کی موت کے بعد ان کی دولت کو داخل خزانہ کرلینا' یہ ایک طویل تعارفی داستاں ہے جو بیسویں صدی کے متمول ترین لیکن کنگال بادشاہ کی ذات سے وابستہ کہانی ہے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی کی ہر مسجد میں خلفا کے ناموں کے بعد سرکار عظمت مدار قاقان ابن قاقان، سلطان ابن سلطان نواب میر عثمان علی خاں کا نام لیا جاتا تھا۔

جمعہ کے خطبہ میں اس شخص کا نام لیا جاتا تھا جس کی بیویوں کی تعداد ان گنت تھی جسکے خواص لاتعداد تھے اور بن خواص (جو تمتع بیجا کیلئے محل میں لائے گئے مگر جن سے نظام کا جسمانی تعلق پیدا نہ ہوا۔ وہ بھول گئے کہ کسی کو پسند کر کے میں نے محل میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا)

عام طور پر دعوتوں اور اجتماعات میں کسی عورت پر نظر پڑ جاتی تو حکم ہوتا کہ داخل محل کر دی جائے۔ دو سگی بہنیں بھی حرم سرا میں بیوی کی حیثیت سے شامل تھیں، ضعیفی کے دَور آغاز میں گلبرگہ کی ایک طوائف کو شریک حرم فرمالیا۔ نظام کے خانگی معاملات میں انگریزوں نے بھی کبھی مداخلت نہیں کی اور رعایا میں کس کی مجال تھی کہ انگلی اٹھاتے، تحتانیہ سے فوقانیہ تک اسکول شروع ہونے سے قبل حمد باری تعالیٰ پڑھی جاتی تھی جو بعد میں یہ نظم

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے
تجھ کو عثمان بصد اجلال سلامت رکھے
جیسے تو فخر سلاطیں ہے بفضل یزداں
یوں ہی ممتاز تیرا خانہ دولت رکھے،

پڑھی جانے لگی۔

امرار دولت آصفیہ، اہل علم، علمائے اکرام سے ربط و تعلق کی اہمیت اور جنگ کے خطاب سے نوازنے، منصب اور وظیفہ مقرر کرنے، تعریفی کلمات اور تعریف و توصیف کے ذریعے اپنے تعلق خاطر کو ہمیشہ باقی و برقرار رکھا اور اندرونی طور پر ہر قابل ذکر شخص کے شخصی و خاندانی حالات اور اس کے اثرات سے انہوں نے ذاتی طور پر واقفیت رکھی۔ عام طور پر یہ درباریوں سے "تو" سے مخاطب ہوتے اور ذرا درجہ دینا ہوتا تو تم آپ کا لفظ مشکل سے ان کی زبان سے ادا ہوتا۔ گفتگو کا لہجہ نہایت کرخت تھا۔ مختصر یہ کہ:

ذات ایسی جیسے گناہ سڑتے ہوں
بات ایسی جیسے گنوار لڑتے ہوں۔

کنگ کوٹھی میں ان کا محل تھا (جو نذری باغ کہلاتا تھا) جس میں یہ رہتے تھے، ہر طرف کچرا پڑا ہوا۔ گرد، مکڑے کے جالے، لباس میلہ، کبھی لنگی اور گریبان کھلا ہوا قمیص، ان کے محل کا سراپا، خود ان کے وزیر کے قلم سے بیان ہوا ہے۔

"اسی زمانہ میں حضور نظام کچھ علیل ہو گئے اور میں بجائے دفتر پیشی کے نذری باغ میں حاضر ہوا۔ مجھے یہ بھی اجازت دیدی گئی تھی کہ بغیر دستار بکلوس حاضر ہوں۔ حیدر آباد کے آداب کا یہ حصہ تھا کہ نظام کے سامنے جو کوئی جائے وہ دستار بکلوس لگائے۔ جہاں اس سے مستثنیٰ تھے اور بغیر دستار بکلوس حاضر ہونے کی اجازت ایک طرح کا اعزاز خیال کیا جاتا تھا، میرا موٹر مہتابی تک گیا۔ میرے ۱۶ رجون ۱۹۴۳ء کے روزنامچے میں درج ہے۔

سرکار نے علالتِ مزاج کی وجہ سے نذری باغ میں یاد فرمایا، میں نے موٹر سے اترتے ہی دیکھا کہ تمام کمرے، برآمدے اور مہتابیاں مختلف قسم کے سامان سے بھری پڑی ہیں۔ بکس، صندوق، بستے، پوٹلے، جملہ اقسام

کی چیزیں انہی کے ساتھ بوتلیں اور مرتبان رکھے ہوئے ہیں، ان پر گرد چڑھی ہوئی ہے، مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے ہیں، کبوتروں کی بیٹ پڑی ہوئی ہے خدا جانے کتنے عرصہ سے یہ چیزیں اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہیں۔ آگے بڑھا تو ایک بڑا بکرا کھڑا ہوا پتے کھا رہا تھا۔ اس موقع پر اس کی شان نزول کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اس بکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس وجہ سے وہ بطور پنشن خوار یہاں رہتا ہے) یہ پہلا موقع تھا جو بغیر دستار بکلوس کے حاضر ہوا۔ چھوٹے برآمدے میں سرکار ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور سامنے ایک کرسی گول سیٹ کی رکھی ہوئی تھی جس پر سلام کر کے میں بیٹھ گیا۔ میں نے آداب کے بعد امام ضامن پیش کیا، سرکار بہت کمزور نظر آتے تھے، فرمانے لگے کہ مجھے دست بھی آتے ہیں اور سو بخار بھی ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس برآمدے میں بھی بہت سے مقفل سربمہر صندوق اور سربمہر زر درنگ کی تھیلیاں رکھی ہیں۔

(حوالہ: یاد ایام حصہ سوم نواب صاحب شطاری ص ۱۳۹-۱۴۰)

ہوش بلگرامی جو نظام کے ۲۰ سال تک درباری رہے (جن کا تذکرہ آئندہ صفحات پر مطالعہ میں آئے گا) انہوں نے اپنی کتاب "مشاہدات" میں نظام کے درون خانہ کی بابت جو باتیں لکھی ہیں اس سے قبل دربار عثمانی کے زیر عنوان لکھا ہے کہ

"بیس سال تک بلاناغہ دربار عثمانی میں حاضر رہا اس نے وہاں دن کے اجالوں اور رات کی تاریکیوں میں کیا کچھ نہ دیکھا ہوگا۔" (حوالہ: مشاہدات از ہوش بلگرامی ص ۱۸۲۔)

اب ہم مشاہدات کی روشنی میں نظام کے حال و احوال سے آگاہی حاصل کریں گے۔

تھا اور کہیں ارضی وسماوی حادثات سے زیر وزبر ہو رہا تھا، دہلی میں جارج پنجم کی تاجپوشی ہو رہی تھی اور حیدر آباد میں نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصفجاہ عاشر بن رہے تھے۔

مسند آرائے حکومت ہونے کے تین ہی سال کے اندر پہلی جنگ عظیم ہوئی اور برطانوی حکومت کے لئے موت وزیست کا سوال اس لئے پیدا ہوگیا کہ ترکی برطانیہ سے برسر پیکار ہوگئی تھی جس کے سلطان کو مسلمانان عالم اپنا خلیفہ مانتے تھے، ایسے نازک موقعہ پر اعلیٰحضرت نے اپنے اثرات کو استعمال کر کے ہندی مسلمانوں کو سلطنتِ برطانیہ کی وفاداری پر ثابت قدم رہنے کی تلقین فرمائی اور تمام مالی و مادّی ذرائع بھی برطانیہ کے لئے وقف کر دیئے۔ ان خدمات کا صلہ یہ ملا کہ استرداد برار کے مسئلہ کا انکاری فیصلہ لارڈ ریڈنگ نے فریق اور جج دونوں حیثیتوں سے کر دیا۔ جب یہ مسئلہ کمیشن کے سپرد کرنے کے لئے لکھا گیا تو اس کو بھی اس استدلال سے نامنظور کر دیا گیا کہ اقتدار اعلیٰ کے مقابلہ میں ایک تابعانہ حیثیت رکھنے والی ریاست کو کب ایسا حق پہنچتا ہے۔ اسکے باوجود اعلیٰحضرت نے ع مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا گو کچھ نہ ہوا مگر اعلیحضرت اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوئے۔ لارڈ ریڈنگ کے فیصلہ نے ایک عارضی خاموشی تو طاری کر دی مگر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ برار کا ملک تو نہ ملا مگر برطانیہ نے اتنی سیادت منظور کر لی کہ سالگرہ کے موقع پر پرچم آصفی لہرایا جائے، نواب اعظم جاہ بہادر کو "ہز ہائی نس پرنس آف برار" کے لقب سے پکارا

جائے۔

آصفجاہ سابع (سلسلہ کے لحاظ سے عاشر) نے چوں کہ شاہی محل میں پرورش اور تربیت پائی تھی، جہاں "جو حکم" کے سوا اور کوئی الفاظ کانوں نے نہ سنے تھے اس لئے طبیعت کا اتار چڑھاؤ حکومت و اقتدار کا تقاضا تھا۔ شعور پیدا ہوتے ہی:۔

اے زر تو خدا نیست ولیکن بخدا
ستار العیوب و قاضی الحاجات

ولیعہدی کے زمانے میں جو جیب خرچ ملتا تھا اس نے پس اندازی کی عادت ڈالی تھی۔ جب حکومت ملی اور ڈیڑھ کروڑ سالانہ کے صرف خاص پر بلا شرکت غیرے قابض ہوئے تو اس کو بڑی احتیاط سے صرف کیا۔

جیب خرچ پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ کے لئے شادی سے قبل جیب خرچ اس لئے مقرر نہ کیا گیا تھا کہ کہیں یہ فضول خرچیوں کے عادی نہ ہو جائیں، بیویوں اور خواصوں کو بھی صرف ضروریات زندگی سے مطمئن رکھا گیا، یہ تو اولاد اور بیویاں تھیں، خود ذات اقدس نے کب "چھکے پنجے" کی زندگی بسر کی، کب امارت کی سنتوں پر عمل کیا اور کب شاہان سلف کی طرح دولت لٹائی۔ وہ راستہ اختیار کیا جو اپنا تلاش کیا ہوا تھا

انتخاب محلات "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے ضرب المثل یہاں صادق نہ آسکی جس کے باپ کے محلات میں ڈھائی سو کی بھیڑ لگی ہو اس کے بیٹے نے صرف "پون سو" پر قناعت کر کے مقلد دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ بزرگوں کا ہر فعل

قابل تقلید نہیں ہوا کرتا بلکہ حالات پر نظر کر کے قوت و استطاعت کا لحاظ کر کے عیش و راحت کی چاندنی راتوں کو دن کے آفتابی اجالے میں دیکھا جا سکتا ہے، یہ تاج و تخت کا ایسا لوازمۂ عیش ہے جس کی زینت پری جمالوں کے بغیر ہوتی ہی نہیں۔

اولاد:- ماشاء اللہ سے اعلیٰحضرت کثیر الاولاد ہیں، آپ کی شادی شدہ محل حضرت دلہن پاشاہ (جو نواب جہانگیر جنگ مرحوم کی صاحبزادی اور نواب قدرت نواز جنگ بہادر کی ہمشیرہ محترمہ ہیں) کے بطن سے ہز ہائی نس والاشان پرنس اعظم جاہ بہادر، والاشان پرنس معظم جاہ بہادر اور شہزادی احمد النساء بیگم صاحبہ ہیں۔ دیگر محلات سے بھی متعدد صاحبزادیاں اور صاحبزادے ہیں۔ لیلیٰ بیگم صاحبہ کے بطن سے بھی اس وقت ماشاء اللہ کئی صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہیں۔

پرنس اعظم جاہ بہادر کی شادی معزول خلیفہ ترکی کی صاحبزادی پرنسز دُرِّ شاہوار سے ہوئی جن کے بطن سے پرنس مکرم جاہ اور پرنس مفخم جاہ ہیں۔

پرنس معظم جاہ بہادر کی بھی شادی بڑے بھائی کے ساتھ ہی سلطان مراد ترکی کی پوتی پرنسز نیلوفر سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

ان دونوں بھائیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت خاندانی روایات کے مطابق ہوئی۔

اس کا افسوس ہے کہ شہزادی صاحبہ یا دوسری صاحبزادیوں کی شادیاں ابھی تک نہ ہو سکیں۔ پرنس معظم جاہ بہادر کو شاعری کا بہت ستھرا مذاق ہے جن کی صحبت میں کبھی جوشؔ بھی رہے ہیں اور

فانی بھی، اب نجم آفندی اپنا بڑھا پاگذار رہے ہیں، پرنس اعظم جاہ بہادر کی بھی طبیعت کبھی موزون ہو جاتی ہے۔

بیداری اعلیٰحضرت عموماً صبح چھ اور سات بجے کے درمیان سونے کے کمرے سے برآمد ہو جایا کرتے ہیں اور شہ نشین پر (ایک کرسی رکھی رہتی ہے) بیٹھ جاتے ہیں، منھ دھو کر چائے نوش فرماتے ہیں، کبھی کبھی میز خانے کے بنے ہوئے ایک دو بسکٹ کھا لیتے ہیں اس کے بعد افیون کی گولیاں چائے کے گھونٹ سے حلق میں اتار لیتے ہیں۔ گیارہ اور بارہ کے درمیان دوپہر کا خاصہ اور ۷½ اور آٹھ کے درمیان رات کا خاصہ نوش فرماتے ہیں، اسٹاف کی حاضری سے قبل پہرہ کے سپاہیوں سے بھی باتیں کر لیتے ہیں، ایسے سپاہیوں میں حسین خاں سپاہی سے مختلف قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس سے دوسرے سپاہیوں کے خانگی حالات دریافت کئے جاتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے حالات پوچھے جاتے ہیں، ان کے لڑکے لڑکیوں کی تعداد دریافت کی جاتی ہے، شادی بیاہ کے رشتے جڑوائے جاتے ہیں اور مذہب و سیاست کے مسائل بھی ان کو سمجھائے جاتے ہیں۔

جزئیات بیویوں، خواصوں اور لڑکے لڑکیوں میں جب کوئی بیمار پڑ جاتا ہے اور جن کا کھانا میز خانہ سے مقرر ہے۔ سب سے پہلے جنس تولنے والے کے نام ایک پرچہ لکھا جاتا ہے کہ فلاں کا کھانا نہ پکایا جائے اور فلاں چیز پرہیزی اس مقدار میں پکائی جائے۔ دماغ کی ہمہ گیری دیکھئے کہ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی حافظہ سے محو نہیں ہونے دیتے۔

لباس بہتر سے بہتر لباس توشک خانہ میں بھرا ہے۔ خود کرتہ پائجامہ اور نیم آستین کا کوٹ پہنتے ہیں اور

خاص موقعوں پر شیروانی ۔

شہ نشیں

شہ نشیں کے چاروں طرف پوٹلے، پوٹلیاں، صندوق اور مختلف قسم کا سامان رکھا رہتا ہے سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر پڑے رہتے ہیں، جو کوٹھڑی بند ہو گئی وہ برسوں نہ کھلی ۔ کمیاب قلمی کتابیں کیڑوں کی غذا بن گئیں، اور محبوب شاہی توشک خانہ میں قیمتی تھان کے تھان دیمک چاٹ گئی ۔

سردی میں "سردیا" رہے ہیں مگر نہ کوئی کشمیری دوشالہ اوڑھتے ہیں اور نہ کوئی گرم کوٹ پہنتے ہیں ۔

موسیقی

آصف جاہ سابع کی انگلیاں پتلی پتلی ہیں اور یہ خود فرمایا ہے کہ یہ انگلیاں طبلہ بجانے کے لئے نہایت موزوں ہیں ۔ ایک مرتبہ ہز ہائی نس آغا خاں کی فرمائش سے یہ محفل گرم ہوئی تھی جہاں امرار نے بطور تصدق اپنی اپنی مقررہ نذریں پیش کیں اور آغا خاں نے بھی کاغذی تصدق پیش کیا ۔ مہاراجہ بہادر اس لطف سے اس واقعہ کو بیان کرتے تھے کہ سننے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، کبھی کبھی گنگناتے بھی ہیں ۔ اور کرسی پر انگلیاں بھی چلتی رہتی ہیں ۔

تعلیم، شاعری اور مذہب

آصف جاہ سابع کو انگریزی تعلیم سر برائن سیجرٹن نے دی، علم ادب عماد الملک بلگرامی نے پڑھایا اور مذہبی درس نواب فضیلت جنگ نے دیا ۔ دو استاد تو اپنے وقت اور اپنے زمانہ کے مشاہیر علمار میں سے تھے ۔ دونوں نے پڑھایا اور دل لگا کر پڑھایا اور دوسرے فرمانروایانِ ملک کی طرح کسی کا محتاج نہ رکھا اور اپنے

مافی الضمیر کو ایک خاص طرز تحریر میں ظاہر کرنے کے قابل بنا دیا۔

مذہبی تعلیم تو "حنفی المذہب" طریقہ سے پائی اور ضرورتاً اس کی بہت کچھ پابندی بھی کی گئی۔ مگر "بطنی مذہب" کی خاموش چنگاریاں خانۂ دل میں ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ چنگاریاں شعلے بن کر بھڑک اٹھیں، ہر چند نماز میں حنفی طریق عبادت ہی کو جاری رکھا گیا مگر دکن کی مذہبی دنیا کو ان کے محرمی سلاموں سے مرتضوی منقبتوں سے اہل بیت کرام کی مدح و ثنا سے اور ان کے مذہبی حرکات و سکنات سے معلوم ہو گیا کہ ماں اور منھ بولی نانی کے ابتدائی اثرات تربیت کو مولوی انوار اللہ (فضیلت جنگ) کی تعلیم متاثر نہ کر سکی اور تہور جنگ کی اتالیقی "بطنی مذہب" کا ادب سکھا کے رہی۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیحضرت اہل بیت کے پرستار ہیں اور اس عقیدے میں اس قدر پکے اور اپنے والہانہ جذبہ میں اتنے سچے ہیں کہ نجف اشرف اور کربلائے معلی کی طلائی ضریحوں کے سامنے بلا ناغہ سجدہ ریز ہوتے ہیں اور "باپ بیٹے" کی ارواح مقدسہ سے "عرض معروض" کر کے اپنے مضطرب قلب کو سکون پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان کے "اہل بیتی عقیدہ" سے دکن کی مذہبی دنیا بظاہر تو کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کر سکی تھی مگر بباطن اس سے کچھ خوش نہ تھی، جس کے نتائج آنکھوں سے دیکھے بھی گئے اور کانوں سے سنے بھی گئے اس عقیدے کی پیروی نے اس ذات پر سر بازار آوازے کسوائے۔ خانہ باغ میں سازشیں کی گئیں یہ سب کچھ ہوا مگر اس عقیدے کو کوئی جنبش نہ دے سکا، یہ مذہبی کردار دوسرے کرداروں پر اس قدر چھا گیا تھا جس کو دیکھ دیکھ کر میرے انسانی عقائد کی کمزوریاں حیران بھی ہوتی تھیں اور شرمندہ بھی۔

میرے کانوں نے "سلطان الشعراء" کے کلام میں ایسے ادبی اختراعات سنے اور میری نظروں نے ایسے شاعرانہ اجتہاد دیکھے جو نہ متقدمین کے یہاں ملے اور نہ متاخرین کے یہاں نظر آئے، تعجب ہوتا تھا کہ حکمرانی کی مصروفیتیں ادب و شعر کے لئے بھی وقت نکال لیتی تھی اور نئی نئی ترکیبوں سے دنیائے شاعری کو روشناس کر دیتی تھیں۔

امرار ہوں یا عہدیدار، مصاحب ہوں یا ہم نشیں ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ داد دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جائے۔ میرے زمانہ میں بعض حضرات داد دیتے دیتے شہ نشیں سے پھاٹک تک پہنچ جاتے تھے۔ موٹاپے سے ہانپتے ہانپتے سر سے پیر تک پسینہ میں نہا جاتے تھے مگر داد دینے میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہنا چاہتے تھے۔

شاعری کا یہ شوق کچھ آصفجاہوں ہی میں تنہا نہ تھا بلکہ قطب شاہوں کے تو رگ و ریشہ میں یہ شیرازی ذوق سرایت کئے ہوئے تھا، بہادر شاہ ظفر بھی رنگون کی تنہائیوں میں اسی سے جی بہلایا کرتے تھے اور اودھ کے جان عالم بھی مٹیا برج میں نوحے مرثیے کہہ کر حسینؓ کے غم میں رو لیا کرتے تھے۔ مرحوم حامد علی خاں فرمانروائے رامپور داغیوں سے رشک کرتے تھے اور امیریوں سے غبطہ رکھتے تھے۔ ان کے جانشیں رجا پیا نے کبیری شاعری سے اس وقت رشتہ جوڑا تھا جب اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہی زبان آئندہ ہندوستان کی حکومتی زبان قرار پائے گی۔ دوسرے سلاطین بھی جب رنگین محلوں سے جمائیاں لیتے ہوئے برآمد ہوتے تھے تو شب گذشتہ کے واردات کا پردہ شاعری کے چونچلوں سے

فاش کرتے تھے اور جب تک مصاحبین اور درباریوں سے اپنے شاعرانہ راز و نیاز کی داد نہ لے لیتے تھے اس وقت تک امور مملکت کے رازداروں کو باریابی کی اجازت نہ ملتی تھی۔

بادشاہ اگر صرف بادشاہ ہی رہتے اور شاعری میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے، ملکی سیاست میں کمال پیدا کرتے۔ سعدیؔ سے اخلاق کے سبق لے کر رعایا کی بہتری کے مضامین سوچتے رہتے اور اپنے نفسانی خواہشات کو شاعرانہ نواسنجیوں سے تیز نہ کرتے تو یہ فرائض ان کو شاعری سے کہیں زیادہ محبوب خلائق بنا دیتے۔

ابتدائی زمانہ میں تو "دیوان عثمانی" سے عام نظریں مستفید نہ ہو سکتی تھیں مگر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ مقامی اخباروں کا پہلا صفحہ کلام شاہانہ سے مزین رہتا تھا اور رائے استاد جلیلؔ بھی نیچے لکھی رہتی تھی، ابتدائی کلام میں ایسا مقطع بھی موجود ہے کہ :-

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثمانؔ

مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

مگر جب سے فارسی زبان میں طبیعت موزون ہونے لگی تو اردو کی طرف سے توجہ ہٹ گئی، ہر لفظ کے معنی اس لئے لکھ دیئے جاتے تھے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کو نہ پروفیسروں سے پوچھنا پڑے اور نہ "غیاث اللغات" دیکھنا پڑے۔

خاصہ | غذا بہت سادہ نوش فرماتے ہیں، جس میں ایک قسم کا سالن ایک قسم کے کباب، باریک چاولوں کا "موتیا خشکر" پراٹھے اور شیر مال بس! ہاں بالائی ضرور ہوتی اور بہت لطیف ہوتی ہے۔

ایک شاہ کاسہ پانی سے بھرا ہوا پاس رکھا رہتا ہے جس سے بار بار انگلیاں دھوئی جاتی ہیں اور سر جھکائے ہوئے خاصہ میں مصروف رہتے

ہیں، سیب وغیرہ کے مربوں سے منہ میٹھا کر لیتے ہیں اور بالائی تو جان ہے جس کو بہت رغبت سے کھاتے ہیں اور اسی خاصہ میں سے تھوڑا تھوڑا کبھی ان کو اور کبھی ان کو سرفراز کرتے ہیں۔

سلطان الشعراء استاد جلیلؔ نے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ کر کے "سلطان الشعراء" کا لقب پیش کیا۔ اور اس لقب کی شاعرانہ مسرت میں حاضرین نے ایٹ ہوم سے بھی لطف اٹھایا، حکمائے یونانی نے "سلطان الحکمت" سے مخاطب کر دیا۔

نماز اعلیٰ حضرت نماز جمعہ ہاتھ باندھ کر مگر نماز جنازہ ہاتھ چھوڑ کر پڑھتے ہیں، محرم میں عزاخانہ زہراؑ میں اگر بتی خود جلاتے ہیں۔ ۱۲ر محرم کو فولادی علم کا وزن بڑی عقیدت سے سنبھالتے ہیں۔

شگون کوئی دن مشکل سے ناغہ جاتا ہوگا جس میں آیات قرآنی سے، فوجی پہروں کے سامنے سے گذرنے سے، مناری گھڑی کی ٹن ٹن آواز سے اچھے شگون نہ لئے جاتے ہوں۔ بلّی آنے جانے کے راستے سے اگر گذر جائے تو اس کا ٹوٹکا اس راستے میں ایک لوٹا پانی ڈال کر کیا جاتا ہے، عزاخانہ زہراؑ میں اور خلوت کے بارہ اماموں کے کمرے میں حسینی معجزے دیکھے جاتے ہیں۔ اور مسجد جودی کے "جوادی صحن" میں بھی نہ معلوم کس قسم کے جلوے نظر آتے ہیں۔

مذہبی عادات کسی کے سوم اور چہلم کے بتاشے ہوں یا کسی مجلس کا تبرک اس کو عقیدتاً وہیں نوش فرما لیتے ہیں۔ مُردہ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دعا پڑھتے ہیں، مقدس مقامات کے تبرکات (آبِ زمزم وغیرہ) مرنے والوں کی نجات کے لئے تقسیم

ہوتے ہیں۔ "کتنی قبر روشن ہے"۔ کا فقرہ جب کسی قبر کو ملاحظہ فرماتے ہیں ضرور فرماتے ہیں۔ قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں اور قبر پر ہاتھ رکھ کر شیعہ طریقے سے فاتحہ دیتے ہیں۔

لطیفہ محرم کا مہینہ ہے "عزاخانہ زہرا" میں روزانہ شام کو مجلسیں ہو رہی ہیں، حسینؑ کی مجلس میں نہیں بلکہ حضور نظام کو صورت دکھانے کے لئے ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی سب دور دور کی مسافت طے کر کے آتے ہیں، اس زمانہ میں سر مرزا اسماعیل صدر اعظم تھے وہ بھی ایک مجلس میں آئے اور اپنے ساتھ اپنے ایک ایرانی مہمان کو بھی لائے جنہوں نے حضور نظام کو کبھی دیکھا نہ تھا، حضور نظام جب مجھ جیسے مصاحبوں کے ساتھ عزاخانہ میں داخل ہوئے تو سب تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ سر مرزا کے ایرانی مہمان نے حضور نظام کو نہ پہچانا اس کو محسوس کر کے سر مرزا نے اپنے ایرانی مہمان سے کہا کہ "ایں شاہ دکن است" تو ایرانی مہمان نے برجستہ جواب دیا کہ "پناہ بخدا"۔ (اللہ پناہ میں رکھے) طنز۔

(حوالہ: ۲۱۶ تا ۲۲۹ مشاہدات از ہوش بلگرامی)

حضور نظام سے متعلق نواب صاحب جب شطاری کے تاثرات

"مزاج باغباں"، کے تعارف کے بغیر نظام کی شخصیت کی اصلی تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ اس خصوص میں اعلیٰحضرت حضور پُرنور کے عادات و خصائل، ان کے اوصاف اور ان کا مزاج، دروغ گوئی، سفلہ نوازی۔۔۔۔۔ سازشی ذہن، شکی مزاج، امور مملکت سے زیادہ ارباب نشاط، درباری سازشیوں کی قربت سے

بے خبری اور اسی قبیل کی باتیں ہمیں یادِ ایام جلد سوم میں بھی ملتی ہیں۔

"یادِ ایام" اگرچہ زبان و بیان و طرزِ نگارش کے اعتبار سے کوئی قابلِ تذکرہ کتاب نہیں ہے لیکن دکن کے ایک اہم سیاسی دور کے وزیرِ اعظم کی یادداشت کی حیثیت سے اس کا حوالہ مناسب حال ہے۔ (یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کو چھتاری صاحب ممالک محروسہ سرکارِ عالی کے صدرِ اعظم مقرر ہوئے۔) ان کے حضور نظام سے متعلق چشم دید واقعات پر مشتمل تاثرات درج ذیل ہیں:-

سر تھیوڈور ٹاسکر کو جو حکومت ہند کی طرف سے ایک وزیر تھے اور جو تیرہ چودہ برس سے مختلف عہدوں پر حیدرآباد رہے تھے میں نے لنچ پر بلایا تھا۔

میں۔ سر تھیوڈور۔ برٹش حکومت کے انتظامی امور کا مجھے کم و بیش تجربہ ہے، مگر کسی ریاست اور خاص کر حیدرآباد کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ آپ کی ملازمت کا بڑا عرصہ یہاں گذرا ہے آپ کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

سر تھیوڈور ٹاسکر۔ سر احمد آپ میرے چیف ہیں، آپ کی پالیسی کو وفاداری کے ساتھ کامیاب بنانا میرا فرض ہے، اس میں کبھی کسی قسم کی کوتاہی نہ ہوگی۔ میری رائے اور میرا مشورہ ہمیشہ آپ کے واسطے موجود ہے۔ حیدرآباد کی حالت میں مختصراً دو باتیں فقروں میں بیان کر دوں، ہم سب وزیر ہیں مگر ہماری مثال ایسی نرسوں کی ہے کہ جو ایک ایسے بچہ کی حفاظت کے واسطے مقرر کی گئی ہیں جس کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا ہے ہمارا کام ہے کہ اسے خودکشی نہ کرنے دیں۔ (حوالہ: یادِ ایام ص ۶۹)

۶ر جون کو ریزیڈنٹ کے سکریٹری مسٹر کوک ولیس میرے

پاس آئے اور بادشاہ کے بھائی ڈیوک آف گلوسٹر کا پروگرام جو
۲۰ر تاریخ کو آرہے تھے مجھے دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ

جب ڈیوک آئیں تو ہوائی جہاز کے اڈے پر حضور نظام
شہزادگان اور میں موجود ہوں۔ وہاں سے وہ فلک نما نظام کے
ساتھ جائیں۔ وہیں لنچ ہوا اور شب کو نظام کی طرف سے ڈنر ہو
اور اسی طرح رخصت ہوتے وقت نظام ہوائی اڈے تک پہنچانے
جائیں۔ میں نے علی یاور جنگ اور انصاری معتمد باب حکومت
یعنی کیبنٹ سکریٹری کو بلا کر بذریعہ نیم سرکاری دفتر پیشی کو مطلع
کر دیا۔

آج ہی سرکار کو اُن کے شاعری کے استاد جلیل نے ملک الشعراء
کا خطاب دیا اور باغ عامہ میں جلسہ اور ایٹ ہوم ہوا۔ ایڈریس
کے جواب میں سرکار نے اس خطاب کو قبول کیا۔ مجھ سے فرمایا کہ
صبح تم علی یاور جنگ کو بھی ساتھ لانا، علی یاور جنگ نے مجھ سے یہ
کہا کہ اگر سرکار ڈیوک کو رخصت کرتے وقت ہوائی جہاز تک پہونچانے
سے انکار کریں تو میں اس پر زور نہ دوں ورنہ انہیں غلط فہمی
ہو جائے گی۔ میں صرف یہ کہوں کہ چوں کہ مسئلہ اہم ہے اس لیے
کونسل کے مشورے کے بعد طے کیا جائے۔ نواب علی یاور جنگ کو
غالباً ڈیوک آف ونڈسٹر کا واقعہ یاد آیا، جب وہ پرنس آف
ویلز کی حیثیت سے حیدرآباد آئے تو نظام نے رخصت کے وقت
اسٹیشن جانے سے انکار کیا۔ جس سے حکومت ہند اور انگلستان کے
شاہی خاندان کو ناگواری ہوئی۔

آج ہی غلام محمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان سے اور
سر تھیوڈر ٹاسکر سے گفتگو ہوئی اور سر تھیوڈر ٹاسکر نے منجملہ اور

باتوں کے یہ بھی کہا کہ "تم خود ہی یہ اندازہ کرو کہ اگر اعلیٰ حضرت کو اختیارات کامل دے دیئے جائیں تو جوان کی موجودہ کیفیتِ مزاج ہے اس میں وہ اس ریاست کا کیا حشر کریں"۔ جو کچھ ٹاسکر نے کہا یہ نہ صرف حکومت ہند کا خیال تھا بلکہ اس سے بہت سے حیدرآباد کے لوگ بھی متفق تھے۔

دوسرے روز میں اور علی یاور جنگ کنگ کوٹھی حاضر ہوئے سرکار نے فوراً علی یاور جنگ کو نوٹ لکھانا شروع کر دیا جس کا منشا یہ تھا کہ چوں کہ بم باری کے خطرے سے فلک نما محل کا سامان ہٹا لیا گیا، لہٰذا ڈیوک ریزیڈنسی میں قیام فرمائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے سرکار کے اس فیصلہ پر کس قدر حیرت اور افسوس ہوا۔ شہنشاہ ہندوستان کا بھائی اور نظام حیدرآباد کا مہمان مگر اس کا قیام بجائے فلک نما محل کے ریزیڈنسی میں ہو، لیکن اگر میں اصرار کرتا تو ضد بڑھتی میں خاموش رہا۔ خیر مقدم اور الوداع کے موقع پر جانے کیلئے راضی تھے مگر الوداع کے متعلق یہ کہا کہ اگر "ضروری ہو تو میں اس پر بھی تیار ہوں"۔

میں اس نوٹ کے ساتھ گیارہ بجے ریزیڈنٹ سے ملا اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا ایک ناخوشگوار بات کو خوشگوار طریقہ سے کہہ کر انہیں یقین دلایا کہ ڈیوک کا قیام ریزیڈنسی ہی میں مناسب ہوگا۔ خیر مقدم اور الوداع کے سلسلہ میں ریزیڈنٹ نے کہا کہ دونوں مواقع پر سرکار کا تشریف لیجانا مناسب ہوگا۔

میں نے دوسرے روز ۸ رجون کو سرکار سے وہ سب عرض کر دیا جو طے کر آیا تھا جسے سرکار نے پسند فرمایا مگر میرے لئے ایک اور نزاکت پیدا ہوگئی۔ اسی روز شام کو سر تھیوڈر ٹاسکر

کے رخصتی ڈنر میں ریزیڈنسی گیا، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ریزیڈنٹ نے کہا کہ سرکار نے انہیں خط بھیجا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ڈیوک فلک نما محل میں قیام کریں تو مناسب ہوگا۔ مجھ سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

میں نے کہا کہ سرکار کی جب یہ خواہش ہے تو منظور کر لیجئے مناسب ہے لیکن بار بار یہ خیال آتا رہا کہ کل ہی جو دلائل و براہین میں نے ریزیڈنٹ سے اس تجویز کے خلاف پیش کئے تھے اسے وہ بھول نہیں سکتا۔ کیا اسے یہ خیال نہ ہوگا کہ نظام تو چاہتے ہیں کہ ڈیوک فلک نما میں قیام کریں مگر صدر اعظم اپنی کسی مصلحت سے یہ نہیں چاہتے۔ حیدرآباد میں ایسے مواقع آجاتے تھے اور صدر اعظم کی حیثیت سے میرے لئے بڑے خلجان کا باعث ہوتے تھے اگر اپنی پوزیشن کو صاف کیا جائے تو آئین وفا شعاری کے خلاف اور خاموشی کی صورت میں غلط فہمی کا اندیشہ۔

(حوالہ: یادِ ایام ص ۱۰۳ تا ۱۰۵)

۲۱ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو مجھ سے ریزیڈنٹ نے کہا۔ کیا یہ سچ ہے کہ علی یاور جنگ کو وزیر بنانے کے لئے سر عقیل نے بیس ہزار دیئے اور نواب ظہیر یار جنگ سے پچاس ہزار مانگے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ میرے خیال میں یہ خبریں بے بنیاد ہیں۔

۲۳ر دسمبر کو اعلیٰ حضرت نے کنگ کوٹھی میں لنچ دیا جس کے بعد فوٹو لیا گیا۔ لنچ کے بعد میں نے یہ عرض کیا کہ گرانی کی وجہ سے سرکار نے شاہزادگان کی سول لسٹ میں ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار اضافہ پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ کے واسطے منظور فرمالیا تو اس موقعہ پر گرانی کا کچھ الاؤنس بسالت جاہ کے لئے بھی منظور

فرمایا جائے۔ یہ اعلیٰ حضرت کے سوتیلے بھائی ہیں مگر سرکار نے منظور نہیں کیا۔ سرکار کے فرمانے کا منشاء یہ تھا کہ بسالت جاہ کی ماہواری سول لسٹ کے سلسلہ میں حکومتِ ہند سے یہ طے ہوگیا ہے کہ رقم مقررہ سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں پانچ ہزار روپیہ ماہوار ملتے تھے یہ غالباً نظام مرحوم میر محبوب علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۱۱ء یا ۱۲ء میں حکومتِ ہند سے طے ہوا ہوگا۔ مجھے افسوس ہوا۔ سوال حق کا نہ تھا یہ تو فراخدلی اور صلہ رحمی کا سوال تھا۔

۷ر مارچ ۴۴ء سر کلاڈ آکسن لیک جو کمانڈراں چیف تھے میرے مہمان تھے۔ میں نے سرکار سے عرض کیا کہ انہیں چائے پر بلا لیں بہت پس و پیش کے بعد مان لیا۔

سرکار اتنے مشکوک المزاج تھے کہ فرمانے لگے کہ مجھ سے کیوں ملنے آرہا ہے۔ میں کیا کہتا کہ برٹش حکومت کا کمانڈراں چیف حیدرآباد آئے تو اسے نظام سے ضرور ملنا چاہیئے اور سرکار کو بھی کھانے یا چائے پر مدعو کرنا چاہیئے۔ (حوالہ: یاد ایام ص ۱۶۰/۱۶۱)

یکم اگست ۴۲ء کو سرکار نے فرمایا کہ بہادر یار جنگ اور ابوالحسن سید علی ان سے ملنے حاضر ہوئے تھے اور اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کر رہے تھے۔ (یادِ ایام ص ۱۱۴)

۵ر اگسٹ بہادر یار جنگ ملنے آئے، دورانِ گفتگو میں مجھے یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ یکم اگسٹ کو یہ اور ابوالحسن سید علی سرکار کے طلبیدہ حاضر ضرور ہوئے تھے مگر گفتگو صرف برار کے طرزِ حکومت کے متعلق تھی۔ اور انہوں نے میری گورنمنٹ کے کام پر کسی غیر مطمئن ہونے کا اظہار نہیں کیا۔ اور کہنے لگے "یوں سرکار

مالک ہیں جو فرماتے ہیں بجا اور درست کہنے کے سوا کیا چارہ ہے۔"

(حوالہ: یادِ ایام ص ۱۱۵)

۱۵ ر اگست ۴۳ء کو میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ ایک بات مجھے بہت سبق آموز اور دلچسپ معلوم ہوئی، انہوں نے کہا کہ شہزادی نیلوفر (پرنس معظم جاہ کی ترکی بیگم) اپنے کسی عزیز کو تیس پونڈ ماہوار حکومتِ ہند کے ذریعہ سے مصر بھجواتی تھیں جن کا نام پرنس ہامی تھا۔ یہ غریب اپنا پیٹ کاٹ کر کسی اپنے مفلوک الحال غریب الدیار عزیز کو مصر سے اس تیس پونڈ میں سے پانچ پونڈ فرانس روانہ کر دیتی ہیں لہذا آئندہ سے پچیس پونڈ ماہوار جایا کریں۔

یہ مثال اس ذہنیت کی تصویر پیش کرتی ہیں جو ایک ترک جیسی شریف قوم کی ذہنیت ہے۔ ایک وہ شہزادی ہے جو اپنی روٹی میں سے ٹکڑا توڑ کر اپنے کسی غریب عزیز کو بھیجتی ہے اور ایک وہ حکومت ہے جو سزا رًا اتنا ٹکڑا کم کر دیتی ہے۔

۳ ر فروری ۴۴ء کو سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نظام فرمانے لگے کہ بہادر خاں کو ریزیڈنٹ نے کیوں بلایا۔ مجھ سے تو کہا تھا کہ میں انہیں انٹرویو نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا کہ بہادر خاں کی خواہش پر بلایا ہوگا۔ اسی روز دوپہر کو بہادر خاں (بہادر یار جنگ) مجھ سے ملنے آئے۔ ریزیڈنٹ سے جو بات چیت ہوئی تھی اسی کا ذکر کرتے رہے پھر مجھ سے کہا کہ سرکار نے مقصود علی خاں (سرکاری طبیب) کو ان کے پاس بھیجا تھا وہ یہ پیام لائے تھے کہ ریزیڈنٹ بہادر یار جنگ سے ملنے کو تیار نہ تھے بہادر یار جنگ نے جو خط انٹرویو ریزیڈنسی سے آیا تھا وہ مقصود علی خاں کو دکھایا اور اس پر افسوس کرتے رہے کہ سرکار ایسی غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔"

(حوالہ: یادِ ایام ص ۱۵۸)

نظام کی انتقام پسندی کا ایک واقعہ

مشاہدات میں ہوش بلگرامی کے قلم سے نظام کے عقیدے مذہبی کا تفصیلی ذکر مذکور ہے۔ اس خصوص میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

علماء اہلسنت میں مولانا ابوالخیر شاہ حسین کنج نشیں المعروف مولانا ابوالخیر کنج نشیں (پیدائش ۶، نومبر ۱۹۰۴ء وفات ۱۸، اگست ۱۹۸۶ء) بڑے نڈر اور بے باک واقع ہوئے تھے، آخری دم تک اپنی مادر جامعہ (جامعہ نظامیہ) کے بے لوث خدمت گذار رہے۔

نظام کے اپنے آبائی مسلک کی تبدیلی کے خلاف مولانا نے صدائے احتجاج بلند کی اور ایک رسالہ تحریر فرمایا:-

"اور ایک وقت حیدرآباد میں ایسا بھی آیا جبکہ حضور نظام سابع نے اپنے آپ کو شیعی مسلک پر ہونا بتلایا اور حضرت الاستاذ مولانا سید شاہ محمد شطاری، صدر المدرسین نظامیہ نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں شیعی عقائد کا حق پر ہونا بتلایا۔ اس کی تردید میں شاہ صاحب نے ایک رسالہ لکھا۔ جس میں شیعی عقائد کی تردید اور حضرات خلفائے راشدین کا صحیح انتخاب ہونا اور ان سب کا راہ راست پر رہنا بتلایا۔ اور یہ بھی بتلایا گیا کہ حضرت آصف جاہ اول نے خود کو حنفی اور ریاست کا مذہب حنفی ہونا وصایا میں بتلایا ہے، اس کے سوا آصف جاہی خاندان اپنے آپ کو امیر المؤمنین سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے ایسی صورت میں ہمارے حضور نظام سابع کو چاہیئے کہ وہ اپنے کئے ہوئے تصفیہ پر نظر ثانی کرے ورنہ اس کے خلاف مسلم عوام کی عالمگیر تحریک جاری ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کسی شخص کو حکومت یا حکمرانی کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، ہر شخص

کو خوف وہراس تھا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور نظام نے شاہ صاحب کو شہر بدر کرنے کے سلسلے میں کونسل سے رائے پوچھی، خدا اختر احمد مینائی اختر یار جنگ معتمد امور مذہبی کو جوار رحمت میں جگہ دے، انہوں نے تفصیل سے کونسل میں رائے دی کہ یہ مذہبی مسائل ہیں۔ شاہ محمد صاحب نے اپنے رسالہ میں خلفائے راشدین کے متعلق غیر صحیح واقعات لکھنے سے شاہ ابوالخیر صاحب نے جواب لکھنے کی جرأت کی اگر انہیں شہر بدر کیا جائے تو نہ صرف حیدر آباد میں ہیجان پیدا ہوگا بلکہ سارے ہند میں حضور نظام کے خلاف مظاہرے ہوں گے چوں کہ ان مسائل کا تعلق عقائد سے ہونے کی وجہ سے ہر شخص کو اپنے عقائد کی حفاظت ضروری ہے، باوجود اس کے دوسرا فرمان یہ جاری ہوا کہ ان کے نام اگر انعامات وغیرہ ہوں تو بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ ضلع بیدر کے نام احکام اجرا ہوئے، اور تعلقدار نواب نثار جنگ نے لکھا کہ ان کے والد بقید حیات ہیں، ان کے نام (مولانا ابوالخیر کنج نشیں) کوئی جائیداد نہیں ہے، بیٹے کی وجہ سے باپ کو متأثر کرنا ٹھیک نہیں، اس طرح پولیس ایکشن سے پہلے یہ کارروائی ختم ہوگئی۔" (حوالہ: نام تھا جن کا کنج نشیں" از الحاج سید شاہ نعمت اللہ قادری فاضل نظامیہ، سجادہ نشیں درگاہ رحمانیہ ضلع گلبرگہ ص ۴۳ تا ۶)

٭پہلی بار علامہ اقبال ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ اور دوسری بار ۱۹۲۸ء کے آخر میں مسلم ایسوسیشن کی دعوت پر مدراس جارہے تھے ان کو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے فلسفہ پر توسیعی تقاریر کے سلسلے میں دعوت دی گئی تھی۔

۱۴ر جنوری کی صبح کو علامہ اقبال کا سکندر آباد اسٹیشن پر شاندار خیر مقدم کیا گیا، علامہ اقبال نے دیکھا کہ تین چار سو سے

زائد چھوٹے بچے اور خوبصورت یونیفام میں ملبوس قطار اندر قطار ان کا ملی ترانہ خوش الحانی سے پڑھ رہے ہیں ۔

ان کا قیام نظام کے مہمان کی حیثیت سے دلادا واسٹا (مہمان خانہ) میں رہا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور عہدہ داروں کے علاوہ سر اکبر حیدری خلیفہ عبدالحکیم، مسٹر انصاری، مولانا عبداللہ عمادی، ابراہیم ٹونکی، ڈاکٹر مظفرالدین قریشی اور دیگر اکابرین ان کے استقبال کیلئے اسٹیشن پر موجود تھے ۔

علامہ اقبال نے حیدرآباد میں دو لیکچر (انگریزی زبان میں) دیئے۔ پہلے لکچر کی صدارت مہاراجہ کشن پرشاد نے اور دوسرے لکچر کی صدارت نواب اعظم جاہ ولی عہد سلطنت نے کی ۔

پہلا لکچر ۱۵ ر جنوری کو باغ عامہ کے ٹاؤن ہال میں ہوا ۔

مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ

"آپ کی ذات تعارف سے مستغنی اور آپ کا کلام ستایش سے بالاتر ہے، ڈاکٹر اقبال جس مقصد حیات کو اپنے علم وعمل سے پورا کر رہے ہیں وہ انسانی ترقی کو دنیا کے لئے سود مند بنانے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کا راستہ بناتے ہیں ۔ ڈاکٹر اقبال تصوف اور عرفان کی آغوش میں پل کر حکیم ہوتے ہیں اور ان کے حکیمانہ خطبات سے ہم سب کو یکساں مستفید ہونے کا اب بالمشافہ موقع ملا ہے جس کی ہم عزت اور قدر کرتے ہیں :"

علامہ اقبال کے اعزاز میں مشاعرہ

۱۵ ر جنوری کو مہاراجہ کے مشاعرے میں جو علامہ اقبال کے

اعزاز میں منعقد ہوا تھا، علامہ اقبال نے شرکت فرمائی اگرچہ اس زمانے میں اقبال نے مشاعروں میں پڑھنا ترک کر دیا تھا اور ان کی حیثیت ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے مسلّم ہو گئی تھی لیکن مہاراجہ کی پاسداری اور لحاظ کی وجہ سے وہ مشاعرہ میں شریک ہونے سے انکار نہیں کر سکے۔

علامہ اقبال ابھی...... مشاعرہ سے لوٹے بھی نہیں تھے کہ رات کے نو بجے سرامین جنگ نے ان کی قیام گاہ پر ایک خط بھجوادیا کہ حضور نظام نے کال بک پر آپ کا نام ملاحظہ فرمانے کے بعد ۱۸ر جنوری کی صبح گیارہ بجے کا وقت ملاقات کیلئے مقرر فرمایا ہے۔

۱۷ر جنوری کو سر اکبر حیدری نے اقبال کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا، اس دعوت میں اکابرین، ممتاز شہریوں کے علاوہ جملہ وزراء اور عہدہ دار حکومت شریکِ طعام تھے۔

سرامین جنگ کا استقبالیہ

جس دن علامہ اقبال سے نظام کی ملاقات ہونے والی تھی اسی رات سرامین جنگ نے جو حضور نظام کے پرائیوٹ سکریٹری تھے اقبال کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا، اس عشائیہ میں حیدرآباد کے بیشتر جاگیرداروں اور رؤسا نے شرکت کی۔ اس عشائیہ کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا کہ اقبال کو حضور نظام کے آداب سے آگاہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ ان سے ملاقات کے وقت کون کون سی باتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔

ساتھ ہی اقبال کو اس امر کی بھی مبارکباد دی گئی کہ ان سے پہلے کسی ہندوستانی شاعر کو حضور نظام نے اتنا بڑا اعزاز نہیں دیا ہے۔

۱۸ر جنوری کی صبح ۱۱ بجے اقبال کی نظام سے ملاقات ہوئی۔

علامہ اقبال نے پوری مشرقی تہذیب کے آداب کو ملحوظ رکھ کر ملاقات کی، لیکن نظام نے رسمی انداز کی گفتگو کی، اور یہ ملاقات ایک رسمی ملاقات سے زیادہ اہمیّت کی حامل نہ بن سکی، جس کی بڑی وجہ صرف یہی تھی کہ اقتدار کے نشہ میں نظام، اقبال کے مقام تک رسائی نہ پا سکے۔

نظام کی خدائی کی زکوٰۃ!

۲۱ر اپریل ۳۸ء کو علامہ اقبال نے وفات پائی۔ علامہ اقبال کی وفات سے کچھ عرصہ قبل یعنی ۷ر جنوری ۱۹۳۸ء کو پہلا جشن اقبال بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ عظیم الشان پیمانے پر منایا گیا۔

اس موقعہ پر حضور نظام کی جانب سے اقبال کی خدمت میں ایک ہزار روپئے کی رقم چک کی صورت میں بھجوائی گئی، جس چک کے ہمراہ بمد زکوٰۃ توشک خانہ عامرہ سرکار عظمت مدار" کی سلپ بھی منسلک تھی۔

اس سلپ کو دیکھتے ہی اقبال نے دو قطعات کے ساتھ نظام کی خدائی کی زکوٰۃ (چک) کو غیرت فقر کی بارگاہ سے نکال باہر کیا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی وجانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی ذکات

قطعہ لکھنے کے چندروز بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا، اس طرح نظام کی اس غیر اخلاقی حرکت کا انہیں منہ توڑ جواب مِل گیا۔

"(تلخیص اقبال اور بزمِ اقبال" از عبدالرؤف (۲) "اقبال اور حیدرآباد" از نظر حیدرآبادی)

علامہ اقبال کے انتقال کے ۶ رسال بعد نہ جانے کس ترنگ میں ایک فرمان نظام گزٹ میں شائع ہوا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ

"مجھے اس قدر یاد ہے کہ تقریباً ربع صدی قبل ایک بار اس جگہ آئے تھے، مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ بغرض سیر وسیاحت آئے تھے یا کسی کی دعوت پر یا کسی خاص کام کے تحت۔ ملاقات کی خواہش کے کتابچے میں اپنا نام خود درج کیا، میری حسب عادت اور تہذیب کے مطابق میں نے انہیں ملاقات کا موقع دیا۔"

(علامہ اقبال کو جامعہ عثمانیہ میں توسیعی لکچر کیلئے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا اور سرکاری اعزاز کے ساتھ انہیں شاہی مہمان کی حیثیت سے رکھا گیا تھا۔ لیکن سطور بالا میں نظام نے کس تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے اور کس طرح علامہ اقبال کے مقام کو متاثر کرنے کی سعی ناکام کی ہے)

فرمان کے دوسرے حصے میں فرماتے ہیں:

ان سے گفتگو کے دوران میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اہلِ اسلام کے معزز طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے دل میں قومی جذبات ہیں، اور یہ بھی کہ وہ انگریزی زبان سے واقف ہیں اور انہوں نے یورپ کا سفر بھی کیا ہے، بہر حال ان کا شمار مشاہیر بیرونِ ملک میں

ہوتا ہے۔

میں اس سے زیادہ ان کے احوال سے ناواقف ہوں"۔

(یہ وہ زمانہ تھا جب کہ چار دانگ عالم میں اقبالؔ کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔)

ایک دیسی ریاست کا فرمانروا یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ ملاقات کے بعد میں ان سے سرسری طور پر واقف ہو سکا، گویا اس سے قبل یا بعد وہ اس عظیم ہستی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

اس طرح کی نچلی سطح کی حرکتوں کے ذریعے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ متذکرہ باتوں پر مشتمل فرمان فارسی زبان میں جاری ہوا تھا جو درج ذیل ہے :-

نظام کا فرمان

" مارا ایں قدر یاد ہست کہ تخمیناً عرصہ ربع صدی گذشتہ است کہ ایکبار ایں جا آمدہ بود مگر معلوم نیست کہ آیا او از خود بغرض سیر و سیاحت آمدہ یا بر دعوت کسے یا برائے کار خاص آمدہ و ہم او چونکہ بر ما کال (CALL) کردہ بُود یعنے نام خودش در کتاب نوشتہ بود حسب عادت مطابق ایٹیکسٹ ما اورا انٹرویو دادہ بودیم و نتیجہ کہ ما از گفتگوئے او اخذ کردیم آں ایں بود کہ او در نظر ما از معززِ طبقۂ اہل اسلام آمد و ایں ہم از طرز کلام او بر ما ہویدا کہ او جذبۂ خدمت قوم و ملت خویش در دل می داشت و ایں ہم ظاہر شد کہ او زبان انگریزی را خوب می دانست و سفر یورپ ہم کردہ بود بہر حال شمار او در میان مشاہیر بیرون ملک بود۔ زیادہ از احوال او ما نابلد ہستیم"۔

(نظام گزٹ۔ ۴ مئی ۱۹۴۴ء روز پنجشنبہ)

خطابِ محی الملّۃ والدّین

تحریک خلافت کے سلسلے میں حیدرآباد میں اس تحریک سے وابستہ شخصیتوں کی گرفتاری اور جلسوں پر امتناع کی خبریں جب ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئیں تو ہندوستان کے اخبارات نے نظامِ دکن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔

دکچھ ہی عرصہ قبل ندوۃ العلماء لکھنوٗ اور دیگر تعلیمی اور دینی اداروں کے نامور مشائخین وعلماء نے ایک مشترکہ جلسہ میں انہیں (پوری طرح ناواقفیت کی بنا پر) خطاب محی الملۃ والدین سے سرفراز کیا تھا (جس کے یہ اہل نہ تھے)

جس کے جواب میں نظام نے ایک فرمان کے ذریعہ جواب دیا کہ

"اس خطاب کا نہ تو میں خواہشمند تھا اور نہ اس کی میری نظر میں کوئی اہمیت ہے۔ میرے لئے تو اپنے ذاتی خطابات ہی کافی ہیں"

اس طرح علمائے کرام ومشائخین عظام کی توہین وتحقیر کی۔

(تلخیص ماخوذ از رابطہ عالم اسلامی اور حیدرآباد دکن ص ۱۴۵۔ از مولوی حسام الدین غوری مرحوم۔ کراچی)

اس طرح کے لامتناہی واقعات کا سلسلہ ہے جس کے لئے ایک علٰحدہ کتاب کی ضرورت لاحق ہے۔ یہاں ان واقعات پر مشتمل یہ باب تحریر کرنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ

نبض چمن پہ بعد میں رکھیں گے انگلیاں
پہلے تیرا مزاج تو اے باغباں ملے

اس بجھے بجھے سے نوشتہ دیوار کا ذکر جو بہادر یار جنگ کے حرف جنوں کو ٹال کر خود حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ آواز دوست میں مختار مسعود نے ٹوپی کے میل سے دل کے میلے پن تک کا حال نوکِ نشتر سے لکھا ہے۔

"میر عثمان علی خاں کو میں نے بچپن میں پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ وائسرائے کے ساتھ علیگڑھ آئے تھے۔ وکٹوریا گیٹ سے سٹریچی ہال تک اسکول کے طلبہ کی قطار بندی تھی، میں ہال کے نزدیک قطار کے آخری سرے پر کھڑے ہونے والے سب سے چھوٹے بچوں میں شامل تھا۔ ایک پُر شکوہ جلوس ہمارے سامنے سے گذرا۔ لوگوں کی نگاہیں ان شہزادیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں جو خلافتِ عثمانیہ کے برباد ہونے کے بعد دولت آصفیہ میں آباد ہو گئی تھیں۔ سادہ لوح سمجھے کہ اس پیوند سے کوئی نجات دہندہ پیدا ہو گا حالانکہ مستقبل شہزادیوں کے بطن سے نہیں بلکہ بطنِ گیتی سے جنم لیتا ہے۔ لارڈ ولنگڈن اس سلطنت کا نمائندہ تھا جس کی وسعتوں پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا اور دکن کی حیثیت اس سورج کے سامنے چراغ سے زیادہ نہ تھی۔ غلامی کے دنوں میں ہمیں انگریز بہت گورا نظر آتا تھا لہٰذا لارڈ ولنگڈن کے سُرخ و سپید چہرے کے سامنے نظام بالکل سنولا گئے۔ کسی سے سنا کہ نظام دنیا میں سب سے امیر شخص ہیں تو ان کے ساتھ ہمدردی ہو گئی مگر وہ بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی، جب کہ یہ خبر ملی کہ ان کی ترکی ٹوپی کے کناروں پر میل کی تہ جمی رہتی ہے تو دل میں ان کی طرف سے میل آگیا جو آج تک نہیں گیا۔ نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ اِن کے سلوک کو یاد کرتا ہوں تو کچھ اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ کئی بار چاہا کہ نظام کو عظمتِ رفتہ کا آخری چراغ قرار دوں یا روشن

مستقبل کی پہلی کرن، مگر طبیعت اس پر کبھی راضی نہ ہوئی۔ دل نے کہا تاریخ میں جگمگاتے عنوان ہی نہیں بجھا بجھا سا نوشتۂ دیوار بھی ہوتا ہے۔ نظام نے بہادر یار جنگ کے حرفِ جنوں کو سُن کر ٹال دیا اور خود حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ اگر نظام ان کی باتوں پر غور کرتے تو ریاست بہر حال چلی جاتی مگر نام رہ جاتا۔"

(آواز دوست، مختار مسعود ۸۱، ۸۲۔ کراچی)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان انسان نما درندوں کے بارے میں لکھا:

"بادشاہوں کے حالات کتابوں میں آپ نے کثرت سے پڑھے ہوں گے کیسے کیسے ظالم سنگدل بلکہ انسان نما درندے، اس طبقہ میں ہر ملک اور ہر زمانہ میں گذرے ہیں۔ شقاوت کی آگ بھڑکی تو باپ تک کو مار ڈالا لختِ جگر تک کی آنکھیں نکال لیں، "زہر کا پیالہ" پلادیا، بھائی، بھتیجے، چچا، ماموں، خسر، داماد کا ذکر ہی نہیں، نفس پرستی کا ہیجان ہوا تو بہن، بیٹی اور ماں تک کی عصمتوں کی خیر نہ رہی، غرض کہ وہ، وہ کر گذرے ہیں جن کی طرف ذہن بھی ہمہ وشما کا پہنچنا مشکل ہے اور کسی ایک ملک یا قوم پر موقوف نہیں۔ چین و عرب، ہند و ایران، روم و روس، برطانیہ و فرانس ایک سے بڑھ کر ایک۔"

ہم نے تو بڑھ کر الٹ دی ان کے چہرے سے نقاب
یہ ہمارا کام تھا آگے نظر کا کام ہے

شہید ملّت کی زندگی کی آخری صبح

۲۵ رجون ۱۹۴۴ء کی صبح آئی، طلوعِ فجر سے قبل اللہ کا بندہ ہر روز کی طرح نیند سے بیدار ہوا۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر وضو بنایا اور اور روز کی طرح مسجد کا رُخ کیا۔ اللہ کے نام اور کام سے صبح ہوئی۔

۳ ررجب ۱۳۶۳ھ بروز اتوار آپ کی تفسیر کا آخری دن تھا، سورۃ بقر کے چوبیسویں رکوع (پارۂ دوم کے آٹھویں رکوع) کی ابتدائی چار آیتوں تک کی تفسیر بیان کی جا چکی تھی، آج پانچویں آیت زیر درس تھی، وقتِ مقررہ پر مسجد میں تشریف لائے تو تفسیر سے پہلے کہنے لگے کہ:

"آج میں زیادہ تیار نہیں ہوں۔ اور روزانہ جو مطالعہ رات میں کر کے یہاں آتا تھا وہ آج نہیں کر سکا، گذشتہ دو راتوں سے سالگرہ[1] کے عشائیوں میں وقت گذارا، اور یہ ہماری ایمانی کمزوری ہے کہ ہم کبھی کبھی اللہ کی طرف سے ہٹ کر اس طرح دنیوی کاموں میں لگ جاتے ہیں خدا ہمیں بھلائی کی توفیق دے۔

پھر قرآن کھولا اور یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

---

[1] واضح رہے کہ یکم رجب نظامِ دکن میر عثمان علی خاں کا یومِ پیدائش ہے، اس زمانہ میں اس موقع پر سرکاری و غیر سرکاری بڑے پیمانے پر جلسے منعقد ہوتے تھے اور پارٹیاں دی جاتی تھیں۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ [1]

اُردو ترجمہ کے بعد الفاظ و مطالب کی تشریح فرمانے لگے، لفظ فِتنۃٌ کے متعلق فرمایا کہ اُردو میں اس کے معنی شرارت اور خرابی کے لئے جاتے ہیں مگر عربی میں اس کے اصل معنی ہیں "آزمانا اور امتحان کرنا" اور اس مقام پر لَا تکون فتنۃ کے الفاظ کے ساتھ ویکون الدّین لِلّٰہ کے الفاظ اس حالت کو واضح کرتے ہیں کہ جس کو "فِتْنَۃٌ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی جب دین اللہ کے لئے نہ ہو، کفار برسرِ اقتدار ہوں، کفر کے احکام جاری ہو رہے ہوں، اور مسلمان ان کے قہر و غلبہ کی وجہ سے خدا کے احکام پر پوری طرح عمل نہ کر سکتے ہوں تو یہ دراصل فتنہ کی حالت ہے، اس حالت کو "فتنہ" اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ فتنہ کا قطعی استیصال کرو اور اس کے قطعی استیصال تک لڑو، اس وقت تک لڑو جب تک اللہ کے نام اور احکام کا بول بالا نہ ہو جائے اور اس کی حمایت میں لڑنے والی قوتوں کو کامل غلبہ اور فتح حاصل نہ ہو جائے اس کے بعد اگر وہ باز آجائیں تو ہاتھ روک لو اور زیادتی نہ کرو اور پناہ میں لو بجز ظالمین کے جن کے خمیر ہی میں شر موجود ہے، چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر حضور انورؐ نے فتح مکّہ کے بعد تلوار میاں میں ڈال دینے والوں، بوڑھوں، بچّوں، عورتوں اور ابوسفیان کے مکان میں پناہ لینے والوں اور خانۂ کعبہ و مسجد حرام میں گھسنے والوں کو پناہ دی، بجز پانچ یا چھ ظالمین کے جن کے متعلق حکم تھا کہ اگر وہ

---

[1] اور لڑو ان سے، یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا، پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں، مگر ظالموں پر۔"

(بالفاظ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ)

کعبہ کے پردوں کو بھی لپیٹ لیں اور حرم میں بھی گھس جائیں تو تب بھی ان کو وہاں قتل کردو۔

اس سے آگے کی آیات میں چند حرام مہینوں کا ذکر[1] ہے، تمہیدی طور پر اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ:-

عرب میں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب مقدس مہینے سمجھے جاتے تھے چوں کہ ذی الحجہ کے مہینے میں لوگ حج کے لئے دور دور سے آتے تھے اور سفر میں تقریباً ایک مہینہ صرف ہو جاتا تھا اس لئے اس اثناء میں امن کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور آپس کی خانہ جنگیاں موقوف کر دی جاتی تھیں، اسی طرح محرم کا مہینہ واپس ہونے کے لئے پُرامن بنا دیا جاتا تھا اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لئے خاص تھا اس لئے اس مہینے میں بھی جنگ ملتوی کر دی جاتی تھی اور اسی بناء پر ان چار مہینوں کو حرام (یعنی حرمت والے) مہینے کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ نالائق عرب اگر کسی سے انتقام لینا یا غارت گری کرنا چاہتے تو حرام مہینوں میں بھی جنگ کا اعلان کر دیتے اور کہتے کہ ہمارے لئے یہ مہینے مقدس نہیں ہیں۔ مقدس مہینے بعد میں آئیں گے جب ہم صلح کر لیں گے یا لڑائی ختم کر دیں گے۔ اس طرح جب چاہتے مہینوں کو اور ان کی ترتیب ہی کو بدل دیتے"۔

یہاں تک بیان کر کے فرمایا کہ:-

"آج یہیں تک رہنے دیجئے، باقی انشاء اللہ کل بیان کریں گے"۔

لیکن آہ! وہ ایسا آج تھا کہ جس کی کل قیامت اور روزِ جزا ہی ہے یہ بات کس کے خیال میں آسکتی تھی کہ "کل" نمودار تو ہوگا لیکن اس "کل" میں

---

[1] اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ه

چہچہانیوالا عندلیب اور اپنی طرز میں بیان کرنے والا مفسرؔ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا اور "کل" نمودار تو ہوگا لیکن ایک عالم کو جانے والے کے غم میں سوگوار دیکھے گا۔

ایک دن پہلے یعنی ہفتہ کے روز بارش ہو رہی تھی اور مرحوم سمیت درسِ تفسیر میں صرف چار آدمی تھے، اس لئے وَ قَاتِلُوْهُمْ والی آیت کی تفسیر ختم ہونے کے بعد گذشتہ دو آیتوں کی تفسیر کا خلاصہ بھی بغیر فرمائش بیان کر دیا تاکہ سب لوگ مستفید ہوں اس سے حاضرین بہت خوش ہوئے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ یہ ان کی آخری تفسیر ہے، گذشتہ دو آیتوں کے الفاظ یہ ہیں:

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ [1]

ان آیات کے متعلق فرمانے لگے کہ "کتنے کھلے اور صاف احکام ہیں، فرمایا ہے کہ جب لڑائی چھیڑ دیں، معاہدہ توڑ دیں اور خود ابتدا کریں تو مار و ان کو جہاں وہ نظر آئیں اور اگر موقع ہو اور ضرورت محسوس ہو تو ان کو مکہ سے بھی نکال دو جہاں سے تم کو انہوں نے نکالا اور اب بھی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ فتنہ قتل سے بُری چیز ہے، اگرچند آدمیوں

---

[1] ترجمہ:- اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو، یہی ہے سزا کافروں کی، پھر اگر وہ باز آئیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔" (بالفاظ شیخ الہند رح)

کو قتل کر دیا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، لیکن "فتنہ" کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے قتل ہو جانے کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے اگر وہ فتنہ برپا کریں اور اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے چند آدمیوں کو مسلمان قتل کر دیں تو یہ عین رحمت ہے، پھر سر سیّد کی تفسیر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "بعض فتنے ایسے اٹھے تھے کہ مسلمانوں کو "جارحانہ" اقدام کرنا پڑا، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نہ معلوم کتنے بڑے بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے، پھر "مسجد حرام" کے معنی بتاتے ہوئے فرمایا کہ کعبہ کے اطراف کی مسجد کو مسجد حرام کہتے ہیں، یہ حرمت والی مسجد بھی ہے اور یہاں بعض حلال اور جائز باتیں حرام بھی ہو جاتی ہیں مثلاً شکار کرنا اور عوام الناس کے بقول "جانوروں کے سیّد" کبوتر تک کو مارنا جو وہاں بہت پایا جاتا ہے، گھاس اکھیڑنا وغیرہ۔ اس کے بعد کہنے لگے پھر حکم ہے کہ مسجد حرام میں اپنے ہاتھ کو ابتداء سے روکو، لیکن اگر وہ وہاں بھی لڑنے لگیں تو ان سے وہاں بھی لڑو اور کاٹ ڈالو کیوں کہ منکروں کی یہی سزا ہے، ہاں اگر کفار باز آجائیں اور لڑنا بند کر دیں تو ان سے کہو کہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ باری تعالیٰ کے ابر کرم سے سرسبز وادیاں اور خشک چٹانیں برابر برابر آب رحمت پاتی ہیں، چنانچہ ابو سفیانؓ، عکرمہؓ ابن ابو جہل، ہندہ اور وحشی اسی حکم کے تحت معاف کئے گئے۔

تفسیر ختم ہوئی تو ایک صاحب نے مرحوم سے شیعہ سنی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی، آپ نے جواب دیا کہ میں واقعات وحقائق اور مختلف لوگوں کی رائیں بتا سکتا ہوں۔ لیکن آپ یہاں اس مسجد میں میری ذاتی رائے دریافت نہیں کر سکتے، یہاں مجھے بالکل غیر جانبدار رہنا پڑے گا اس کے بعد کہنے لگے کہ "شیعہ حضرات حضرت علیؓ کو افضل اور دیگر خلفاء کو غاصب کہتے ہیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ہمیں کسی کو کسی پر فضیلت دینے کا کوئی حق نہیں ہے، چنانچہ حدیث شریف میں صراحت سے فرمایا گیا ہے

کہ "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں" ان میں سے تم جس کسی کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے، رہا میرا ذاتی خیال تو میں تمام صحابۂ کرام میں حضرت عمرؓ سے زیادہ متأثر ہوں اور مجھے ان کی طرف خاص کشش ہے، بلکہ ان کے نام ہی سے مجھ پر خاص اثر ہوتا ہے، پھر بات کو مختصر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اب جھگڑوں اور تُو تُو مَیں مَیں سے کیا فائدہ جبکہ جو ہونا تھا ہو گیا۔

مرحوم کا خیال تھا کہ آج سب حاضرین کا نام پوچھیں گے اور ضروری تعارف کرائیں گے اس سے پہلے ایک دن انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے، کسی دن آپس میں تعارف کرائیں گے، لیکن طبیعت کی ناسازی کے باعث سارے حاضرین سے نام نہ پوچھ سکے، صرف ایک شخص سے نام دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا "تفسیر علیؓ"، نام بڑا معنی خیز تھا لیکن کچھ عجیب سا۔ اس لئے اس پر ایک خفیف سا قہقہہ پڑا اور مرحوم نے بھی سنجیدگی سے تبسّم فرمایا۔

ایک صاحب نے کہا ایسے بہت سے نام ہوتے ہیں، چنانچہ ایک شخص کا نام "محمد عبدالرّب العالمین" ہے۔ مرحوم نے سنجیدگی کے ساتھ مسکرا کر کہا "ایک عالمین بڑھا دیا گیا ہے، عبدالرب تو ہوا ہی کرتا ہے" اس کے بعد دوسروں کا نام پوچھے بغیر سلام علیکم کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے، اس دن بارش کی وجہ سے مرحوم نے اپنا ہلکا جوتا مسجد کے اندر لا رکھا تھا، جب باہر نکلنے لگے تو چپکے سے جوتا ہاتھ میں اٹھایا اور باہر لے جا کر نیچے ڈال کر پہن لیا۔ میرے ایک دوست کا بیان ہے کہ میں جوتے کے بالکل قریب تھا لیکن اس پر میری نظر نہ پڑی، جب انہوں نے جوتا اٹھالیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ہائے اتنا اچھا موقعہ کھو دیا، کاش! میں جوتا لے کر باہر رکھ دیتا، تاہم میں نے فوراً ارادہ کر لیا کہ آئندہ کسی روز ضرور کوشش کر کے جوتا اٹھانے کی سعادت حاصل کروں گا مگر آہ! یہ کسے خبر تھی کہ وہ موقع آخری اور بالکل آخری تھا۔

مسجد کے باہر دو مسلمان طالب علم سامنے آگئے اور کتابیں طلب کیں، مرحوم نے پوچھا کیا آپ لوگوں کا امتحان ہوگیا؟ کیا پہلی کتابیں واپس کر دیں؟ طالب علموں نے جواب دیا، جی ہاں، فرمایا، چلو میرے ساتھ! کتابیں ضرور ملیں گی۔

ارے بھئی یہ بچے بڑے اچھے ہیں، پھر حاضرین کی طرف دیکھ کر کہا " یہ بچے توجہ سے زیادہ قابل ہیں "۔ یہ کہہ کر بچوں کو ساتھ لئے گھر کی طرف چلے گئے مگر بارہ پندرہ گھنٹوں کے اندر دنیا ہی سے چلے گئے۔ رحمۃ اللہ وطاب ثراہ۔

(حوالہ : ایک ایمان افروز یاد داشت، از ابو منظور شیخ احمد)

۲۵ رجون ۱۹۴۴ء کو صبح تفسیر کے بعد ناشتہ فرمایا اور باہر تشریف لائے۔ ۱/۲ ۱۰ بجے تک خطوط کے جوابات لکھوائے۔

قائد ملت کی آخری تحریر

حیدر آباد ۲۸ رجون قائد ملت کی آخری تحریر بھی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ سے ہی متعلق تھی۔ ۲۵ رجون کی شام بزم اقبال میں آخری تقریر کے لئے تشریف لے جانے سے قبل آپ نے جس آخری خط پر دستخط ثبت فرمائے تھے وہ ایک ریاست کے مسلمانوں کی شکایت کے جواب میں تھا جس میں آپ نے اپنی ممکنہ امداد کا وعدہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنی اندرونی تنظیم مکمل کرنے کی ہدایت فرمائی تھی اس یادگار خط کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

بخدمت شیخ عبدالرشید عبدالقدوس صاحب صدیقی

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کا خط مورخہ ۱۶ رمئی مسلسل دورہ اور مصروفیت کی وجہ سے میری نظر سے آج گذرا، واقعات معلوم کر کے سخت رنج اور افسوس ہوا، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ ریاستی مسلمانوں کی یقیناً مدد کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اپنی آپ مدد کرنے کیلئے تیار ہوں یعنی کہ وہ پہلے اپنی اندرونی تنظیم

مکمل کریں۔ ریاست میں مسلم لیگ یا کسی اور نام سے ایک ادارہ قائم کریں اس کے گرد مسلمانوں کو جمع کریں اور پھر اس ادارہ کا آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ سے الحاق ہو، جس واقعہ کا آپ نے ذکر کیا ہے، ایسے بہت سے واقعات آئے دن ہندو ریاستوں میں پیش آتے رہتے ہیں، اس انفرادی مقدمہ میں بھی آپ کی ممکنہ مدد کروں گا، لیکن مستقل علاج وہی ہے جو میں نے اوپر درج کیا ہے، میں ۱۵ر جولائی تک حیدرآباد میں ہی رہوں گا، اگر آپ یا آپ کا کوئی وفد یہاں اگر مجھ سے ملنا چاہے تو مجھے ان سے مل کر مسرت ہوگی۔ فقط

آپکا مخلص

محمد بہادر خاں

(حوالہ: روزنامہ رہبر دکن، حیدرآباد دکن ۲ر جولائی ۱۹۴۴ء)

قائد ملت نے دوسری رجب کو دن میں ½ ۱۱ بجے پہلی اور آخری بار مدرسہ عربیہ نسواں کا دو گھنٹے تک معائنہ فرمایا اس موقعہ پر بیگم قائد ملت بھی موجود تھیں، طالبات مدرسہ عربیہ نسواں حیدر گوڑہ کی تیار کردہ سوزن کاری اور دستکاری کا معائنہ بھی فرمایا۔ قائد ملت نے تمام اشیاء کا تفصیلی معائنہ کیا اور خصوصیت کے ساتھ عرب کی خوبصورت سوزن کاری دیکھ کر جو مقوے پر تیار کی جارہی تھی، بیحد اظہار خوشنودی فرمایا، معائنہ کے بعد جماعت مولوی میں حسب ذیل مضامین کا پس پردہ امتحان لیا۔

قرآن مجید، ادب، تاریخ اسلام، صرف ونحو، ترجمہ، آپ سوال کرتے جاتے اور طالبات جوابات دیتیں اور آپ بار بار "شاباش بیٹی جیتی رہو" فرماتے جاتے، صرف ونحو، ترجمہ اور مضمون نویسی کی کاپیاں دیکھیں، عربی میں زبانی ترجمہ کروایا، طرز تعلیم اور لڑکیوں کی ترقی پر اظہار پسندیدگی فرمایا، آخر میں طالبات نے ایک عربی ترانہ سنایا، واپسی سے قبل ہر دلعزیز قائد اپنی موت سے چند گھنٹے قبل جو نصیحت فرمائی درج ذیل ہے:-

قوم کی بیٹیوں کو آخری نصیحت :- قائدِ ملت نے کہا تھا کہ "میں تمہاری تعلیم سے بیحد خوش ہوا، اب کچھ نصیحت کی باتیں مجھ سے سُن لو، علم کو خدا نے بہت فضیلت دی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے [1] عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ اسی طرح حدیث نبویؐ میں مروی ہے "[2] طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ"، شاید تمہیں معلوم ہو گا کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک علم ادیان اور دوسرا علم ابدان، علمِ دین کو دیگر علوم پر فضیلت حاصل ہے، یہ تمہارے سوچنے اور عمل کے طریقوں کو درست بناتا ہے، خدا کا خوف اور سچی محبت سکھاتا ہے اور روحانی ترقی میں مدد دیتا ہے، یہ سچ ہے کہ اس کا سیکھنا شروع میں کچھ غیر مانوس سا معلوم ہوگا لیکن کچھ دشوار نہیں، امید ہے کہ آپ ہمت سے کام لیں گی، کیا وجہ ہے کہ آپ سات سمندر پار والوں کی زبان سیکھتی ہیں۔ اور آپ کو آجاتی ہے اور عربی زبان جو آپ کی قرآن کی زبان ہے آپ کو مشکل معلوم ہو، کوشش کرنے سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اب آپ خود دیکھئے، مسز صوفی جو حیدر آباد کی لائق ترین خواتین میں سے ہیں ان کو عربی، فارسی، اُردو، انگریزی سب زبانیں آتی ہیں۔

عزیز بیٹیو! مجھے تم سے جو تمنّا ہے وہ یہ ہے کہ تم ماں باپ کی اچھی بیٹی بنو، بھائیوں کی اچھی بہن بنو، بچوں کی اچھی ماں بنو، تمہاری گودوں میں قابل قدر قوم پل کر بڑی ہوگی یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب

---

[1] ترجمہ قرآن :- آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیا پھر ان ناموں کو فرشتوں پر پیش کیا اور کہا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔

[2] ترجمہ حدیث :- علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔

تک تم پوری طرح اپنے کو اس لائق نہ بناؤ۔

وہ عورت کیا جس کو گھر سے زیادہ باہر رہنے میں مزہ آئے، جلسوں اور کلبوں میں اکثر وقت کاٹے، ایسی تعلیم سے بہتر ہے وہ تعلیم جو تم کو یہاں دی جا رہی ہے۔ مجھے تمہاری ترقی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، امید ہے کہ تم خوب پڑھو گی اور جو پڑھو گی کہو گی اور یاد رکھو گی اس پر عمل بھی کرو گی، وہ علم کیا جس پر عمل نہ کیا جائے، یاد رکھو میں تمہیں امام شافعی کا ایک مقولہ سناتا ہوں اسے یاد کر لو اور ہمیشہ کے لئے یاد رکھنا ع

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی فادصانی الیٰ ترک المعاصی

فان العلم نورٌ من الٰہٖ ونور اللہ لا یعطیٰ لعاصی[1]

خدا کرے تم اچھی بیٹی، اچھی بہن اور اچھی بیوی بنو، پھر تم ہر قسم کی معاصی کو ترک کر دو گی، بے جا مذاق معاصی میں داخل ہے، چغلی، ایک دوسرے کی برائی کرنا معاصی میں داخل ہے، ماں باپ سے بدزبانی کرنا معاصی میں داخل ہے، خدا والدین کی شان میں فرماتا ہے کہ تم انہیں "اُف تک نہ کہو" اس لئے نافرمانبرداری بھی معاصی ہے، چھوٹوں پر شفقت سے پیش آؤ، بڑوں کی اطاعت اور ادب کرو، جھوٹ اور غیبت سے بچو، سمجھ لو کہ ترکِ نماز گناہ ہے لوگ کہتے ہیں نماز نہ پڑھنا گناہ ہے میں کہتا ہوں کہ نماز کو ترک کرنا گناہ ہے ان سب پر عمل کرو ورنہ تمہاری تعلیم سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں، امید کہ تم اِن دو چار باتوں کو یاد رکھو گی اور عمل کر کے دوسروں کو عمل کی ترغیب دلاؤ گی۔

میں تم کو اور تمہارے اساتذہ کو اور اس کمیٹی کو جو اس ادارہ کی

---

[1] میں نے وکیع (امام شافعی کے استاد) سے اپنے سوء حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا تم گناہوں کو ترک کر دو کیوں کہ علم انوار الٰہی میں سے ہے اور اللہ کا نور کسی گناہ گار کو عطا نہیں کیا جاتا۔"

ترقی میں کوشاں ہے مبارکباد دیتا ہوں ۔

"اچھا بیٹیو خدا حافظ"

(حوالہ: روزنامہ صبح دکن حیدرآباد ۲ر جولائی ۱۹۴۴ء)

دوپہر میں گھر لوٹے، بیگم صاحبہ کے ساتھ کھانا تناول کیا پھر لیٹ گئے جیساکہ عادت تھی، لیٹتے ہی سو گئے، چار بجے اٹھے تو دیکھا، بیگم صاحبہ ہنوز محوِ خواب ہیں، کپڑے تبدیل کر کے چاہا کہ ہاتھ میں جوتے لئے دبے پاؤں باہر نکل جائیں لیکن بیگم صاحبہ کی آنکھ کھل گئی، ٹھٹھک کر مسکرایا اور کہا "ارے تم اٹھ گئیں اتنے برس تک تو تم ہی برابر جوتے پہناتی رہی ہو، آج ارادہ تھا کہ میں خود پہن لوں گا۔" اتنے میں چائے آگئی، چائے پی اور درسِ اقبال میں شرکت کے لئے چلے گئے۔ اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" زیرِ درس تھی اور حکمتِ کلیمی کے اس شعر پر گفتگو تھی ؎

مرد حق، افسوں ایں دیر کہن
از دو حرف ربّی الاعلیٰ شکن

کہنے لگے بعض مقامات جلد گذرنے کے نہیں ہوتے، آج یہیں ٹھہر جائیں، بزم برخواست ہوئی، نماز مغرب باجماعت ہوئی، اہل محفل رخصت ہوئے، اقبال کا ایک مصرعہ وردِ زبان تھا ع

حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اب قائد ملت جسٹس ہاشم علی خاں کے یہاں دعوت میں جانے کی تیاری میں تھے، جہاں شہادت، ان کی زندگی کے دروازے پر دستک دینے کے لئے ان کا انتظار کر رہی تھی۔

بہادر یار جنگ کی زندگی موت کے دروازے پر

"۲۵ر جون ۱۹۴۴ء کو اتوار کا دن تھا. اسی دن حسب معمول عصر اور مغرب کے درمیان ان کی کوٹھی پر درس اقبال کی محفل آراستہ ہوئی، معلمین اور متعلمین جمع تھے اور وہ خود عروسِ محفل بنے ہوئے تھے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" زیر مطالعہ تھی۔ حکمتِ کلیمی نظم کا درس شروع ہوا۔ پروفیسر رشید نے ترجمہ کیا، معانی و مطالب بیان کئے، دیگر اساتذہ نے بھی تشریح و توضیح کی، خود بہادر یار جنگ نے اپنے دریائے بے بہا لٹائے، ایک شعر کے بعد دوسرا شعر پڑھا جاتا رہا، یہاں تک کہ پروفیسر رشید نے یہ شعر پڑھا:

مردِ حق افسوں ایں دیرِ کہن
از دو حرف ربّی الاعلیٰ شکن

پھر اس کے معنی و مطالب کو بیان کیا اور آگے پڑھنا چاہتے تھے کہ بہادر یار جنگ نے انہیں روک دیا۔ کہنے لگے "رشید صاحب۔ بس یہاں ٹھہر جائیے یہ مقام یوں ہی گذر جانے کا نہیں ہے" اور محفل برخواست ہو گئی۔ انہوں نے نماز مغرب بہ جماعت ادا کی اور معاً بعد اپنے ایک دوست ہاشم علی خاں رکن ہائیکورٹ کے گھر دعوت میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔

"رات میں پونے نو بجے باہر سے انہوں نے پان منگوائے۔ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ میں ان کے لئے آخری پان تیار کر رہی ہوں، مجھے ہمیشہ اس پر ناز تھا وہ میرے سوا کسی کے لگائے ہوئے پان نہیں کھاتے۔

انہوں نے پانچ بجے ہی یہ کہلا بھیجا تھا کہ آج دعوت میں جا رہے ہیں اور میرے ساتھ کھانا نہ کھائیں گے، پھر بھی میں انتظار میں تھی کہ جاتے ہوئے اندر آئیں گے لیکن تھوڑی دیر بعد موٹر کی آواز آئی اور میں نے اوپر سے دیکھا کہ میرے سرتاج جا چکے تھے۔"

(حوالہ: سہاگ لٹنے کی کہانی بیگم بہادر یار جنگ کی زبانی۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں ص ۱۲۔ مرتبہ نذیرالدین احمد، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی۔ حیدرآباد)

نواب صاحب اپنے میزبان کے بنگلے پر پہنچے، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بھی موجود تھے، ان ہی کے برابر والی کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔

اب پھر موضوعِ سخن اقبال ہی تھے، اسی دَوران حقہ پیش کیا گیا صرف ایک کش لیا۔ ایک ہی جھٹکے میں نوائے سوختہ در گلو اپنے ربِ اعلیٰ سے جا ملے۔

"ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور سکندر علی وجد سے اقبال کے اس شعر

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کر رہے تھے کہ حقہ کے پہلے ہی کش کے ساتھ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

مگر شاہیں بلند پرواز کا ذوق سفر اسے ہر ایک مقام سے آگے لیکر چلا گیا۔ (حوالہ: اقبال اور حیدرآباد ص ۲۲۷۔ از نظر حیدرآبادی۔ کراچی)

یہ ان دِنوں کا ذکر ہے جب کہ میں خواجہ اسداللہ خاں کے ساتھ ان کی کوٹھی واقع بنجارہ ہل میں رہا کرتا تھا۔ ایک شام کھانے کے بعد خواجہ اسداللہ خاں، ان کے چھوٹے بھائی خواجہ حشمت اللہ خاں اور میں مکان کے ورانڈے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے ہی حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج ہاشم علی خاں

کی کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے آس پاس اور صحن میں موٹریں کھڑی تھیں، کوٹھی میں رونق اور چہل پہل تھی۔ کسی دعوت کا اہتمام تھا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ہم نے دیکھا کہ چہل پہل اور رونق انتشار میں بدل گئی۔ موٹریں تیزی کے ساتھ آنے جانے لگیں۔ لوگ بھی پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتے نظر آئے، یہ حالت دیکھ کر ہمیں تشویش ہوئی اور ہم صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے جا پہونچے، انتشار کا یہ عالم تھا کہ کسی کو جواب دینے کا ہوش نہ تھا۔ ہر طرف بدحواسی تھی۔ ایک مہمان نے بمشکل نواب بہادر یار جنگ کا نام لیا اور اس کے آگے اس کی زبان سے کچھ نہ نکل سکا۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر آیا۔ ہم بھی کوٹھی کے اندر پہنچ گئے، ڈاکٹر نے نواب صاحب کا معائنہ کیا اور کرتا ہی رہا، لوگ ڈاکٹر سے یہ سننے کے لئے بے تاب تھے "کہ کوئی خطرہ نہیں" پھر ایک اور ڈاکٹر آیا وہ بھی معائنے میں مصروف ہو گیا۔ دونوں ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو دیکھا، کچھ اشارے ہوئے، پھر دونوں کی گردنیں جھک گئیں، چہروں پر انتہائی ملال کے آثار نمایاں ہو گئے۔

چھ فٹ کا قد آور، موٹا تازہ صحت مند ملت کا سپاہی، نجی محفلوں کا چہکتا ہوا بلبل ہزار داستاں، سیاسی پلیٹ فارم کا گرجتا ہوا شیر اور میلاد کی محفلوں کا مردِ مومن یک لخت داغِ مفارقت دے چکا تھا۔

کھانے سے پہلے دوستوں سے گفتگو کر رہے تھے، سامنے حقہ آیا۔ انہوں نے دو کش لیا کہ نَے ہاتھ سے چھوٹ گئی، حلق بندھ ہوا، منکا ڈھلا گر پڑے اور رُوح پرواز کر گئی۔ ان کی بیگم اطلاع پاکر فوراً بحالتِ زار پہونچیں اور سب سے پہلا فقرہ جوان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "وہ حقہ مجھے بھی پلا دو"۔

(حوالہ: بلبل ہزار داستاں از سیّد بادشاہ حسین ص ۹۵،۹۶۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

میرے لئے کھانا چُنا گیا لیکن نہیں معلوم کیا بات تھی مجھ سے کھایا نہ

جارہا تھا۔ عجیب بے چینی محسوس ہورہی تھی، نوکروں نے مجھے بیحد مجبور کیا لیکن میری حالت غیر ہوتی جارہی تھی، میں نے جوں توں ختم کیا اور پان کھانے کے لئے تخت پر آکر بیٹھی۔ ابھی میں نے پاندان کو ہاتھ لگایا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا میرے حلق میں پھندا پڑ گیا ہے کہ اتنے میں اطلاع آئی کہ دعوت میں میرے سرتاج بے ہوش ہو گئے۔

نہ جانے کیوں میری زبان سے نکلا "جب گولی لگی تب بے ہوش نہیں ہوئے میرے ہاں سیدھے چلے آئے اور آج کیا ہوا؟"

میرا دل مسوس رہا تھا، کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی میری دو بھاوجیں آگئیں اور میں نے ان سے کہا کہ ہاشم علی خاں صاحب کے مکان جارہی ہوں۔ مجھے چین نہیں آرہا ہے۔ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی، ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلیں گی، میں نے سمجھا کہ ڈرائیور نہ ہوگا اور مجھے جانے میں بڑی دقت ہوگی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ڈرائیور سے سرکار نے کہا تھا کہ "ممکن ہے مجھے واپسی میں دیر ہو جائے، تمہیں دیر ہوگی میں خود موٹر چلا لوں گا"۔

میری دونوں بھاوجیں اور میں ہاشم علی خاں صاحب کے گھر پہونچے، میں دوڑی ہوئی اپنے سرتاج کے پاس پہونچی۔ جن جوتیوں کے نہ پہنانے سے مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا، انہیں میں نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے سرتاج کے سینے اور پیشانی کو محسوس کیا۔ ان میں اَب بھی گرمی تھی، روح قفس عنصری سے کچھ عرصہ قبل پرواز کر چکی تھی۔ میرا سرتاج میرا سہاگ اپنے ساتھ لیتا چلا گیا۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

(حوالہ: سہاگ لٹنے کی کہانی بیگم بہادر یار جنگ کی زبانی ص ۱۳)

ایک رات نواب صاحب چھتاری (جو اس وقت حیدر آباد کے وزیر اعظم تھے) کے گھر دعوت میں مدعو تھا کہ وہاں نواب صاحب کے اچانک

انتقال کی خبر ملی۔ ہم میں سے کسی کو اس خبر پر یقین نہ آیا۔ اس خبر کی تصدیق کروائی گئی اور جب تصدیق ہو گئی تو سب دعوت چھوڑ کر نکل پڑے، میں اور ملک غلام محمد (وزیر خزانہ حیدرآباد) وہاں سے جائے وقوعہ پر پہونچے، وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے، بعض لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، میزبان پر سکتہ طاری تھا اور ان کی حالت بڑی ہی قابلِ رحم تھی۔ بعض زبانوں پر سازش کے امکانات کا ذکر تھا، میں اور غلام محمدؔ کوئی ایک گھنٹے تک وہاں کھڑے رہے۔ مگر ہماری زبانوں سے ایک لفظ نہیں نکل سکا، اس اچانک حادثے نے گویائی سلب کر لی تھی۔

(حوالہ: مخلص انسان از میر لایق علی ص ۲۶۳۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)۔

مگر وہ جس تیزی سے افق سیاست پر طلوع ہوا اسی تیزی کے ساتھ غروب ہو گیا، اس نے اس دنیا کی صرف بہاریں دیکھی تھیں اس کو ابھی اور جینا تھا۔

وہ آسمان سیاست پر جس حیرت انگیز طریقے سے بلند ہوا بالکل اسی پُراسرار انداز میں دنیا سے چلا گیا۔ حیدرآباد کے ایک نواب کے حقہ (تمباکو میں زہر ملا دیا گیا تھا) کے ایک ہی کش کے ذریعہ اس کی ساری صحت مند زندگی قید جسم سے آزاد ہو گئی۔

سارا حیدرآباد غم و غصّہ سے گھروں سے باہر نکل آیا، ہر سڑک پر میلوں تک انسان ہی انسان کھڑے یہ پوچھ رہے تھے کہ:

"کیا بہادر یار جنگ جیسا قوی ہیکل انسان حقہ کے ایک کش سے مر سکتا ہے؟ جواب نظام کے قصر "کنگ کوٹھی" کی اونچی دیواروں میں چھپا ہوا تھا۔"

(حوالہ: بہادر یار جنگ از ابراہیم جلیس ص ۱۵، ۱۶۔ مشمولہ

بہادر یار جنگ اہل دانش کی نظر میں۔ مرتبہ نذیر الدین احمد، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی۔ حیدر آباد دکن)

ڈاکٹروں نے جب روح کے قفس عنصری سے پرواز کر جانے کی اطلاع دی تو سفید چادر سے قائد کی نعش کو ڈھانک دیا گیا اس وقت تک بیگم قائد ملت آچکی تھیں، یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی کہ:

ہوگیا تاریکیوں میں گم دکن کا آفتاب

بنجارہ ہل سے کوئی پون بجے نعش بیت الامت لائی گئی، سامنے کی لاری میں ضخیم ملت گہری و ابدی نیند سو رہا تھا، بیگم قائد ملت اور خاندان کے لوگ ماتم کناں تھے، پیچھے موٹروں کا ایک مختصر قافلہ بیت الامت کی طرف رواں دواں تھا۔

لاش بیت الامت آنے سے قبل ہی بیگم بازار اور اس سے ملحقہ سارے راستوں پر سوگواروں کی آہ و بکا کی دلخراش صدائیں، اپنے قائد کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کر رہی تھیں۔

نواب نصیب یاور جنگ کی ڈیوڑھی کی پھاٹک ہی نہیں بلکہ دکن کے ہر گھر کا در صبح تک کھلا رہا، صبح تک ہر سمت سے آنے والا راستہ بیگم بازار پر ختم ہو رہا تھا۔

مردانی ڈیوڑھی کی بیٹھک میں پلنگ پر وہ سو رہا تھا جس نے دو سو سال سے سوئے ہوئے انسانوں کو جگایا تھا۔ جسم پر چادر تھی، چہرہ کھلا تھا، فضا سوگوار تھی۔ میر کارواں کا آخری دیدار کرنے کے لئے کون تھا جو وہاں نہ تھا۔ امیر، غریب، ہندو مسلمان، سکھ پارسی، امرائے عظام، علمائے اکرام، طالب علم، پروفیسر، بادشاہِ وقت ان کے وزراء سب ہی حاضر تھے۔ آج سارا دکن آفتابِ دکن کے آخری دیدار اور جلوسِ جنازہ میں شرکت کیلئے

بیت الامت میں جمع تھا، کسی کو اپنا ہوش نہ تھا، رونے کی آوازیں عرش تک جا رہی تھیں، آنسوؤں اور آہوں کے سوا ماتم گساروں کے پاس کچھ نہ تھا، آج وہ زبان خاموش تھی! "مدحت رسولؐ میں گل افشانی کرنے والی زبان، مسلمانوں کے درد پر بے تابانہ شکوہ کرنے والی زبان، سیاست و تمدن کے عقدہ ہائے مشکل کو حل کرنے والی زبان، ادب و شعور کی روشنیاں بکھیرنے والی زبان، تاریخ اسلام کی داستاں سرا زبان اور دل کی گہرائیوں سے بولنے والی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چُپ ہوگئی۔ پھر گویا نہ ہوئی۔"

(حوالہ: مکاتیب سے پہلے۔ از صمدانی نقوی ص ۵۷۔ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی)

جلوسِ جنازہ

۴½ بجے بیت الامت سے جب پلنگ پر قائد ملت کا جنازہ نکلا تو ایک کہرام مچ گیا، دیوڑھی سے جنازہ معظم جاہی مارکٹ سے دارالسلام پہنچا، راستے میں مکانوں اور بنگلوں کی چھتوں سے عورتیں اپنے محبوب قائد کا آخری دیدار کرنے کے لئے جمع تھیں۔

آج قائد ملت زندہ باد کے نعرے بلند نہیں ہو رہے تھے، ساری فضا حمد باری تعالیٰ میں، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر کی صداؤں سے فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا، ہر شخص کاندھا دینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ دارالسلام میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور یہاں بھی آخری دیدار کروایا گیا، نماز جنازہ مولانا عبدالقدیر بدایونی نے پڑھائی، تقریباً چھ بجے دارالسلام سے جلوس جنازہ معظم جاہی مارکٹ سے سلطان بازار سے ہوتا ہوا مشیر آباد تک کا سفر ڈھائی گھنٹے میں طے کیا۔

میت ۹½ بجے قبر پر لائی گئی، جلوہ جنازہ میں دو لاکھ آدمیوں کا

اژدھام تھا۔ میت کو کاندھا دینے کی کوشش میں میت کا پلنگ متعدد بار ٹوٹا۔ ہر بوڑھے آدمی نے یہی کہا کہ اس نے اپنی زندگی میں کسی جنازے میں نہ اتنے آدمی دیکھے اور نہ ہی اپنے بڑوں سے سُنا۔

تدفین

رات ۱/۲ ۱۰ بجے حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہ مہدویہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کے جانب غرب مدفون ہوئے، ان کی مرقد[1] میں اترنے والوں میں جنہوں نے اس مرد مجاہد کو اس کے آخری اور دائمی بستر استراحت پر لیٹنے میں اس کی خدمت کی مولوی کرم علی خاں صاحب مرحوم (یل۔ یل۔ بی) اور نواب صاحب کے عزیز جناب سرور خاں صاحب (سابق میونسپل کونسلر مرحوم) کے نام شامل ہیں۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

قائد ملت کا مادی جسم خطیرہ مشیر آباد کے مرمریں روضہ میں مستور ہے۔

"میں اپنے دل حزیں کو کچھ سکون پہنچانے کے لئے شہر خموشاں کی طرف جہاں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں چل کھڑا ہوا۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاف ستھرا سادگی میں یکتا گنبد آرائشی پچی کاری سے بے نیاز۔ پُر جلال و شوکت

---

[1] مرقد کے معنی قبر کے نہیں ہیں جیسا کہ اردو شعرا اس کو استعمال کرتے ہیں بلکہ بسترِ خواب کے ہیں، کیوں کہ رقاد کے حقیقی معنی نیند کے ہیں، قرآنِ کریم میں اصحابِ کہف کے قصہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ اَیقَاظاً وَّهُمْ رُقُودٌ۔ ۱۸/۱۸ — اور تو ان کو بیدار خیال کریگا حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔

ہیبت میں سامنے موجود ہے، قریب پہنچکر میں نے محسوس کیا کہ ہر چار سو روحانیت ہی روحانیت بکھری ہوئی ہے، آنکھوں کے پردوں پر مجاہد اعظم سلطان شہید حضرت ٹیپو سلطان کے مزار کا منظر اُبھر آیا۔ جنوبی ہند کے دورہ کے موقعہ پر سرنگا پٹم فاتحہ خوانی کے لئے گیا تھا وہاں بھی یہی روحانی کیفیت طاری وساری تھی، کیونکہ سلطان شہید نے بھی اپنی جان عزیز اسلام کی سربلندی اور حق کا بول بالا کرنے کے لئے دی تھی۔ محمد بہادر خاں شیر دل مجاہد جن کے ادنیٰ اشارے پر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان سربکف ہو جاتے، منوں مٹی تلے آرام فرمارہے تھے۔

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا،،

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

ما مات من في الورى حييت مبادئه
ميت النفوس وإن تعقبه أجيال

(محمد عبدالمنعم ضیف اللہ مصری)

ترجمہ:۔ وہ شخص کبھی نہیں مرتا جس کے اصول مُردہ دِلوں کو زندگی اور توانائی بخش دیتے ہیں اور جو آنے والی نسلوں کیلئے بھی پیغامِ حیات ہو۔

صف ماتم

سوگواران وطن

حیدرآباد دکن کی ادبی مذہبی سیاسی تعلیمی شخصیتوں اور اداروں احباب و اخبارات کی تعزیت

حکمران وقت اور خانوادۂ شاہی کے پیامات تعزیت

ارشاد شاہانہ

ان کی خدمات ان کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ حضور اقدس نے فرمایا کہ یہ بڑا نازک زمانہ ہے اور یہ وقت ان کی خدمات کا تھا۔ جو کام انہوں نے قوم و مذہب کے لیے انجام دیئے وہ ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رکھیں گے۔ انسان کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ سیکڑوں برس صبح و شام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے۔ جو اپنی صفات اور خدمات کی وجہ سے قوم میں ہر دلعزیز ہو جاتا ہے۔ تین برس پہلے بھی ان کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے ان کو زیادہ محنت نہ کرنے کی نصیحت کی تھی انہیں اس وقت حلق کا مرض تھا

یاد تازہ رکھو:- بندگان عالی نے ارشاد فرمایا کہ اب تم لوگوں کا... یہ ایک ہی کام ہے کہ بہادر یار جنگ کی خدمات کی قدر کرو اور ان کی یاد تازہ رکھو۔ میت کا چہرہ دیکھ کر فرمایا کہ بیماری کے کوئی آثار نہیں پائے

جاتے، اگر یہ چھ مہینے بھی بیمار پڑتے تو گھل نہیں سکتے تھے، ان کی صفات سب کو معلوم ہیں اور سب پر ظاہر ہے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں یہ وقت آہ وزاری کا نہیں صبر کا ہے۔ مرتے سب ہیں لیکن ایسی موت جو وقت سے پہلے ہوتی ہے۔ بیشک جانکاہ ہوتی ہے۔ موت سب کے لئے ہوتی ہے، امیر وغریب شاہ گدا کسی کو اس سے مفر نہیں دنیا میں انسان باقی نہیں رہتا لیکن اس کے اوصاف باقی رہتے ہیں۔

ان کے کام کو پورا کرو جو چیز انہوں نے چھوڑی ہے اس کو زندہ رکھو جس کام کو انہوں نے شروع کیا تھا اس کو پورا کرو۔ انہوں نے اپنے مذہب وملت کی بڑی خدمت کی بڑا کام کر گیا۔

انقلاب کو گذر جانا چاہیئے تھا

یہ بھی ارشاد شاہانہ ہوا کہ یہ زمانہ بڑا نازک ہے اس انقلاب کو گذر جانا چاہیئے تھا۔ مولوی ہاشم علی خاں صاحب رکن ہائیکورٹ بھی تھے جن کے مکان میں قائد ملت کی روح پرواز ہوئی ان سے بندگان عالی نے تفصیلات دریافت فرمائیں استفسار ہوا کہ نماز جنازہ کہاں ہوگی ان کی بیوی سے پھر ملوں گا یہ فرماتے ہوئے بندگان اقدس آگے بڑھے لیکن سیڑھیوں کے قریب فرمایا کہ کیا اس جگہ ان کی بیوی ہیں حضور اقدس زنانے میں تشریف لے گئے ایک عجیب دردناک منظر تھا جب کہ بیوی قدوم شاہانہ سے لپٹ گئیں درد میں ڈوبی ہوئی چیخوں سے ہر قلب پاش پاش ہو رہا تھا ذات شاہانہ بیوہ بیگم کو دلاسا دے کر موٹر میں سوار ہوئے پون گھنٹہ تک ذات شاہانہ میت کے پاس رہے۔

والاشان حضرت ولی عہد بہادر کی بیت الامت میں تشریف آوری

تقریباً ایک بجے دن حضرت والاشان ہز ہائی نس پرنس آف برار بیت الامت تشریف لائے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ والاشان، نواب رحمت

یار جنگ بہادر سے مرحوم کی صفات و خوبیوں کا تذکرہ فرماتے رہے اور آخر میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے ایک عظیم قربانی کی وہ ملک و مالک کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد تھے اس نقصان کی تلافی ممکن نہیں۔

ہز ہائنس پرنس آف برار کا تعزیتی پیام

اس افسوسناک اطلاع کو سن کر بے حد ملال ہوا، از راہ مہربانی اس صدمہ عظیم میں آپ میری پر خلوص ہمدردیوں کو قبول فرمائیے۔

شہزادی صاحبہ برار کا تعزیتی برقیہ

ہز ہائنس پرنس آف برار شہزادی درّ شہوار نے قاید ملت کی وفات پر ادی ٹی سے بیگم قاید ملت کے نام برقیہ روانہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ عمیق احساسات رنج کے ساتھ میں نے یہ افسوس ناک خبر سنی اس سانحہ عظیم میں تمہارے ساتھ میری ہمدردیاں ہیں۔

شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کا تعزیتی تار

علیا حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ نے بیگم قائد ملت کو اپنے برقیہ میں فرماتی ہیں کہ بہادر خاں کے انتقال کی خبر میں نے گہرے رنج کے ساتھ سنی تمہاری اس مصیبتِ عظمیٰ میں میری ہمدردیاں بھی شامل ہیں۔

شہزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ کا پیامِ تعزیت

عزیزم بیگم بہادر خاں۔ ہمیں آپ کے سانحہ عظیم کی خبر مسوری میں ملی نہایت رنج و محن ہوا مرحوم کی بے لوث زندگی اور جوانمردگی کا ملک ماتم کر رہا ہے اور کوئی فرد بشر اپنے احساسات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور نیز جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پیام علیا حضرت صاجزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ

مرحوم کی ہستی وہ کمیاب ہستی تھی جس کا زمانہ انتظار کرتا ہے وہ ایک حق شناس، حق گو اور حق پرست انسان تھے، ان کی ان خصوصیات کا اعتراف ان سے اختلاف رائے رکھنے والے تک کرتے تھے ان کی بے وقت اور ناگہانی موت کے باعث بے حد رنج و ملال ہے گو ہم ان کی جادو بیانی سے اب محروم ہو گئے ہیں، لیکن ان کا نمونہ زندگی عوام کے لئے مشعل راہ ثابت ہو گا۔

صدر اعظم و وزرا دولتِ آصفیہ کا اظہار تعزیت

سر صدر اعظم بہادر دولت آصفیہ کا تعزیتی پیام

ہز ایکسلنسی نواب صاحب چھتاری کرنل حافظ سر احمد سعید خاں صدر اعظم بہادر دولت آصفیہ نے بیگم قاید ملت کی خدمت میں حسب ذیل تعزیتی پیام روانہ کیا ہے، آج آپ جس المناک حادثہ سے دوچار ہیں۔ بیان نہیں کر سکتا کہ میں اس سے اس وقت اپنے آپ کو کس درجہ متاثر پا رہا ہوں، دیرینہ روابط کے بنا پر مجھے مرحوم کی خدمت میں جو نیاز حاصل تھا اس سے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور جب ان کی روح مقام اعلیٰ پر پہونچ چکی ہے۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی بلند سیرت، وسیع القلبی اور ثبات عزم کے کس قدر گہرے نقوش میرے قلب پر مرتسم ہیں، ایک عرصہ تک مرحوم کی رفاقت کا حق ادا کرنے کے بعد آپ کا آج

دفعتاً اس سے محروم ہوجانا ہر طبقہ میں بجا طور پر آپ کے لئے ایک صدمۂ عظیم سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ اسی طرح مرحوم کے بے شمار احباب اور ملنے والوں کی مانند میں ان کے سانحہ ارتحال کو اپنے لئے ایک ذاتی نقصان تصور کرتا ہوں لیکن اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ۔

مرحوم ملک کے فدائی اور مالک کے سچے جاں نثار تھے جن کی بے وقت وفات نے حیدرآباد کے علمی اداروں مجلسی حلقوں اور پبلک لائف میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے کہ اس کا آسانی سے پر ہونا مشکل ہے، اس موقع پر غالباً مجھے آپ کو یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کی اس مصیبت میں میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو اور مرحوم کے جمیع اعزاز اور پسماندگان کو توفیق صبر اور مرحوم کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

آنریبل غلام محمد وزیر مال حکومت آصفیہ (سابق گورنر جنرل پاکستان)

آنریبل غلام محمد نے فرمایا یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مسٹر گریگسن وزیر داخلہ حکومت آصفیہ کا پیام تعزیت

حیدرآباد۔ ۲۴ امرداد۔ آنریبل مسٹر گریگسن اوٹی سے کل تشریف لائے۔ آنریبل موصوف نے قائد ملت کی وفات پر بڑے افسوس کا اظہار کیا۔

آنریبل راجہ دہرم کرن بہادر صدرالمہام تعمیرات کا پیام تعزیت

نواب بہادر یار جنگ کے اچانک انتقال سے جو ناقابل تلافی نقصان ملک کو پہونچا ہے وہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اسلئے تمام ملک آپ کا شریک غم

ہے، مرحوم کی ہستی غیر معمولی ہستی تھی جس پر حیدرآبادیوں کو ناز ہے۔ ان کی فن خطابت میں سحرالبیانی، ان کا بے لوث کریکٹر بے نظیر تھا ان کے شخصی تعلقات بلا لحاظ مذہب و ملت سب سے مخلصانہ تھے افسوس کہ ایسا شخص ہم سے چھین لیا گیا، جس سے ملک کو بڑی امیدیں تھی میں اور میری رانی اس سانحہ میں آپ کے شریک ہیں خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نواب مرزا یار جنگ ایجنٹ برار کا پیام تعزیت

جس وقت نواب مرحوم کے انتقال کی جانکاہ خبر ہم کو معلوم ہوئی میری بیگم صاحبہ اور مجھ پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا جو لہریں اسلامی دائرہ کے سمندر میں انہوں نے قائم کر دی ہیں ان کا دور مسلسل قائم رہے گا اور وہ لہریں مرحوم کی یاد ہمیشہ تازہ رکھیں گی اس اظہار تعزیت میں میری بیگم صاحبہ کا دل بھی شامل ہے خدا سے دعا ہے کہ خدا آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔

سر آرتھر لوتھیان رزیڈنٹ حیدرآباد کا پیام تعزیت

ابھی میں حیدرآباد واپس ہوا ہوں، دوران سفر میں عمیق رنج و ملال کے ساتھ یہ اندوہناک خبر سنی کہ آپ کے شوہر کا اچانک انتقال ہو گیا جس کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اپنی قوت کے عروج پر پہنچ چکے تھے ان کی بے وقت موت ملک اور قوم کے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے مہربانی سے میری ہمدردیاں اس صدمہ عظیم میں قبول کیجئے۔

قائدین وعمائدین وطن کا اظہارِ تعزیت

نواب سر نظامت جنگ بہادر کا پیام تعزیت

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ قدرت نے اس ملک میں ایک غیر معمولی، ہستی پیدا کی تھی اور یہ بہت جلد اس کو ہماری نظر سے غائب کر دیا۔ اسکی مصلحت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ مرحوم محمد بہادر خاں پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا فضل رہا، ان کے دل میں صداقت ان کے ارادوں میں عظمت اور ان کے کاموں میں قوت اس کی دلیل تھی اور انشاء اللہ انکا کیا ہوا کام باقی رہے گا اور خود اپنی آپ تکمیل کرتا جائیگا۔ اس کی نوعیت دائمی ہے اور اصلاح نفس سے اصلاح قوم کا سبق اوپر سے چلا آرہا ہے، عامل صالح ہونے کے علاوہ مرحوم بہت بڑے مقرر بھی تھے۔ لیکن ان کی تقریر صرف آواز نہیں بلکہ دل کی حرکت تھی جس کا ایک خاص اثر دوسرے دلوں پر ہوتا تھا اور اگرچہ وہ سیاسیات سے بھی بحث کرجاتے تھے۔ لیکن دراصل ان کے سیاسی خیالات بھی اخلاقی جذبات سے متأثر تھے۔ اور یہ معلوم ہے کہ شوروغل اور فسادی طریقوں سے ان کو دلی نفرت تھی اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مالک اور ملک کے سچے خیرخواہ تھے۔

ان اوصاف کے لحاظ سے میں ان کی عزت کرتا ہوں اور میرے دل میں انکی خاص جگہ تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے دادا صاحب مرحوم کو میں نے دیکھا تھا ان کے والد مرحوم سے ملاقات تھی اور خود انکو بہت چھوٹی عمر سے دیکھتا تھا اس ملک میں وہ ایک نمونہ تھا اوائل عمر سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا اور اپنی قابلیت کو بہترین طریقہ سے کام

یں لانے کا خیال اور اس کی تیاری اور اپنے آپ کو ایک بڑے کام کے لئے وقف کر دینا یہ سب ان کی طبیعت کے خصوصیات میں داخل تھا۔

لہذا ان کے وجود کو میں اپنے ملک کی خوش قسمتی سمجھتا تھا جیسا کہ ان کے جانے کے بعد قوم کی بد قسمتی سمجھتا ہوں، تاہم صبر و شکر ہمارا کام ہے اور یہ باور کرنا چاہیئے کہ جو قوت ہماری آنکھوں کے سامنے سے، ہٹ گئی وہ پس پردہ اپنا کام کرتی رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ قوم پر داب ہے کہ جو اصلاحی کام دار السلام کا ہے اس کو صبر اور تدبیر سے استقلال اور رویت کے ساتھ چلاتے رہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی امید رکھیں۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے تعزیتی کلمات

عرب شاعر کے مشہور شعر کے مطابق ان کی موت ایک فرد واحد کی موت نہ تھی بلکہ قوم کی ایک بنیاد تھی جو منہدم ہو گئی۔

پنڈت راماچاری کا پیام

نواب بہادر یار جنگ کے اچانک اور بے وقت انتقال سے ملک اور مالک کا جو نقصان ہوا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی ہستیاں بار بار پیدا نہیں ہوتی دنیا کی بڑی شخصیتوں میں ان کا شمار تھا۔

ڈاکٹر لطیف سعید کا تعزیتی بیان

ایک دعوت میں جب کہ میں مرحوم کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور اشتراکیت کا موضوع اتفاقیہ زیر بحث آگیا تو میں نے کہا کہ آپ کا یہ خیال کہ اگر آپ مسلمان نہ ہوتے تو اشتراکی ہوتے صحیح نہیں ہے۔ اس کے بجائے آپ کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ میں مسلمان ہوں اس لئے اشتراکی ہوں مرحوم اس سے بے حد متاثر ہوئے ایک دوسرے موقع پر میں نے مرحوم سے

یہ کہا کہ آپ نے اپنے خدمت کے دائرے کو صرف ایک گوشہ تک کیوں محدود کر دیا ہے۔ آگے بڑھو اور ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے قاید بنو۔ اس پر مرحوم نے کہا کہ ابھی مسلمان پیچھے ہیں، ہیں... ان کو تھوڑا اور منظم کر لوں تو پھر ہندو اور مسلمان دونوں کے لیئے کام کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو وہ ہندو مسلمانوں کے لئے آل انڈیا لیڈر بن کر رہتے۔

خان بہادر احمد نواز جنگ

آج میرے ایک دوست کا انتقال ہو گیا ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ میرے لیئے بھی اور خود حیدرآباد کے لیئے یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے حضرت اقدس و اعلیٰ کے ساتھ ان کی وفاداری اور ملک کے ساتھ ان کے والہانہ جذبات محبت اور بالخصوص مسلمانوں سے ان کا بے پایاں خلوص آج تک کسی میں نظر نہ آیا اور نہ اس کی توقع ہے کہ مستقبل میں ایک عرصہ تک کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو ہر لحاظ سے بہترین قاید، ایک مہربان اور مخلص دوست اور سب سے بڑھکر تنظیمی صلاحیتوں کا حامل قائد تھا۔

مولوی ابوالحسن سید علی کا پیام تعزیت

قاید ملت مرحوم و مغفور کی اچانک رحلت نے مجلس کو ایک ایسی جامع شخصیت سے محروم کر دیا جس کی نیکی اعلیٰ کردار بے مثل خطابت بے باک قیادت، بے لوث خدمت اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثال، مجلس کی روح رواں تھی، مرحوم اپنی خدمات سے ملت اسلامیہ دکن کے پریشان اوراق کا شیرازہ بنے ہوئے تھے اور مرحوم کی ذات میں ملت ضم ہو چکی تھی، اس

مردِ میداں نے نہ صرف ملّت اسلامیہ دکن میں اپنی اعلیٰ و نمایاں خدمات سے یہ مقام حاصل کیا تھا بلکہ ملّت اسلامیہ ہند کے لئے بھی انکی ذات ایک ایسی متاع بے بہا تھی جس کیلئے اس وسیع براعظم کے مسلماں آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں، ہم اس نقصانِ عظیم پر ہمیشہ ماتم کرتے رہیں گے۔

جنارد ھن دیسائی!

یہ ملک کا ناقابل تلافی نقصان ہے اور آئندہ حیدرآباد میں، ایسے سپوت کا پیدا ہونا غیر یقینی ہے۔

مراٹھا منڈل

مولوی محمد بہادر خاں صاحب کے انتقال پر منڈل کو گہرا رنج ہوا صاحب موصوف اتنی جلدی ہمیشہ کے لئے اپنے ملک سے جدا ہو گئے، جو ہمارے ہندو مسلم بھائیوں کی کم نصیبی کا باعث ہوا۔ ان کی یاد حیدرآباد کے ہندو مسلم بھائیوں کے دل سے ہرگز نہ مٹ سکے گی۔ چونکہ صاحب موصوف دکن کے سچے خدمت گذار تھے اور جن سے ملک کا ہر فرد بشر خوب واقف ہے مراٹھا منڈل مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے غم میں اپنے آپ کو برابر کا شریک پاتا ہے اور ایشور سے پرارتھنا کرتا ہے کہ انکی آتما کو شانتی نصیب ہو اور مرحوم کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

کمیونسٹوں کا بیان

مسٹر مخدوم محی الدین، مسٹر بیلا ریڈی اور مسٹر راج بہادر گوڑ اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ "مولوی بہادر خاں صاحب کے اچانک سانحہ ارتحال کی وجہ سے ملک ایک بڑی شخصیت سے محروم ہو گیا مسلمانان،

دکن کی تنظیم انجمن اتحاد المسلمین اور اس کی ترقی مرحوم کی ذات سے اس قدر پیوستہ اور وابستہ تھی کہ نہ صرف مسلمان بلکہ سارا ملک قاید کی بے وقت موت سے ایک خلا محسوس کرے گا۔ ہم حیدرآباد کے کمیونسٹ مسلم عوام کے اس شدید غم میں شریک ہیں اور اپیل کرتے ہیں جمہوریہ اسلامیہ دکن اپنے اتحاد عظیم سے اپنے قومی ادارے انجمن اتحاد المسلمین کو زیادہ سے زیادہ جمہوری اور طاقت ور بنائیں تاکہ مرحوم کی تلافی ہو سکے اور مستعد و منظم عوام دوسرے عوام سے مل جل کر اہل ملک کے مشترکہ مسائل کو حل کر سکیں۔

مانک چند پہاڑے صدر مہاراشٹر اپریشد کا تعزیتی پیام

قاید ملت کی اچانک موت سے نہ صرف مرحوم کے سیاسی ہم خیالوں کو صدمہ پہنچا ہے بلکہ ان کو بھی جو ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی لاثانی خطابت جوشیلا طرز بیان حصول مدعا کی کوششیں اور قربانی کا جذبہ قابل تقلید خصوصیات تھیں عوام نے ایک لیڈر اور سیاست کی ایک طاقتور شخصیت کھو دی جس نے اپنے عمل سے موجودہ زمانہ میں تنظیم کے حق اور اس کی اہمیت کا پیغام پہنچایا میں اور میری جماعت اس صدمہ عظیم میں مرحوم کے پسماندگان، کے ساتھ شریک ہیں۔

بلبل ہند (سروجنی نائیڈو) کے تاثرات

ان کے اچانک انتقال کی خبر نے مجھے سراپا حیرت بنا دیا اور جو صدمہ مجھے پہنچا ہے وہ ناقابل بیان ہے وہ مجھے ماں کہہ کر پکارتے تھے اور ہم دونوں میں بے حد اخلاص اور محبت تھی۔ اور میں نے ہمیشہ انہیں ان معدودِ چند ہستیوں میں شمار کیا جو قیادت کی فطری اور پیدائشی صلاحیتوں کی مالک سمجھی جاتی ہیں۔

نرسنگ راؤ

میں اس سانحۂ عظیم سے اس قدر متاثر ہوں کہ.... میری زبان میں کوئی لفظ کہنے کی طاقت نہیں ہے۔

کاشی ناتھ راؤ ویدیہ

میں اس وقت گم سم ہوگیا ہوں، دل و دماغ قابو میں نہیں ہے میرے آنسو ہی میرے مادّی تاثرات ہیں ایک بڑی قوت لوٹ گئی۔

بیرسٹر اکبر علی خان کا پیام تعزیت

آج حیدرآباد کا شیر سوگیا، کاش ہم مرجاتے اور وہ زندہ رہتے

انجمنوں کی تعزیتی قرار دادیں!!!

حیدرآباد کا جمال الدین افغانی

(انجمن طلبائے قدیم جامعہ نظامیہ انجمن طلسانین علومِ مشرقیہ اور ترقی تعلیم اسلامی اور کل حیدرآباد نظامیہ برادری کی مشترکہ قرار داد تعزیت) حیدرآباد کے جمال الدین افغانی مولوی محمد بہادر خاں کی جدائی سے ملک کو جو نقصانِ عظیم پہنچا جس کی تلافی ناممکن ہے۔ حیدرآباد کی تاریخ میں آج تک ایسا قاید پیدا نہیں ہوا جس کے پیش نظر ملک کی بہبودی کے سوا اور کچھ نہ تھا قاید ملت ہم سے جدا ہوگئے، مگر ان کا قائم کردہ نظام باقی ہے ان کی جدائی خالد بن ولید کی طرح ملت اسلامیہ کے لئے یقیناً فائدہ مند اور کارآمد ہوگی۔ اب قوم کا کام ہے کہ منظم حالت میں مرحوم کے کام کو جاری رکھیں۔

صدر کل ہند مسلم وفاق طلباء کی قرار داد تعزیت

قاید ملت کے بے وقت انتقال کی وجہ سے نہ صرف مسلمانان ریاست ابد مدّت کا بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ ہمارا ناخدا ہماری کشتی کو عین منجدھار میں چھوڑ کر چل بسا۔ خداوند تعالیٰ قاید ملت کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔"

مجلس ہومیوپیتھک کی تعزیتی قرارداد

مجلس نظامیہ ہومیوپیتھک کالج کا ایک غیر معمولی جلسہ بصدارت ڈاکٹر دوارکا پرشاد نگم صاحب جاگیردار بہ مقام عثمان شاہی حفیظیہ منزل بوقت پانچ ساعت شام منعقد ہوا، اور حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

قاید ملت مولوی محمد بہادر خاں صاحب کی اچانک اور بے وقت وفات حسرت آیات پر یہ جلسہ انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس حادثۂ عظیم کو ملت اسلامیہ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیتا ہے۔ اور اللہ پاک سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

قرارداد تعزیت

(حیدرآباد و سکندرآباد کی اٹھارہ انجمنوں کی جانب سے)

خواتین حیدرآباد و سکندرآباد کا یہ نمائندہ جلسہ منعقدہ صدر مجلس مسلم خواتین نواب بہادر یار جنگ کے اچانک سانحۂ ارتحال پر عمیق رنج و اندوہ کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم کی پر خلوص قومی و ملکی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی، اس عظیم اور ناقابل تلافی نقصان پر یہ اجتماع دلی ہمدردی کے ساتھ شریک رنج و غم ہے۔

حیدر آبادی طلبائے علی گڑھ کی قرارداد تعزیت

ہم حیدر آبادی طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو قائد ملت محمد بہادر خاں صاحب کے اچانک اور بے وقت انتقال پر ملال کی خبر سن کر بے حد دلی رنج اور افسوس ہوا۔ قائد ملت نہ صرف مسلمانان وطن کے واحد قائد اور رہنما تھے بلکہ آپ کا شمار ملت اسلامیہ ہند کی نشاط ثانیہ کے معماروں میں بھی ہوتا ہے آپکی پر زور خطابت اور اسلامی زاویہ نظر و فکر نے مسلمانوں میں وہ صحیح اسلامی جذبہ و زندگی پیدا کی جو کسی جامعہ یا درسگاہ سے ممکن نہ تھی آپ کی شبانہ روز کی مساعی نے مسلمانان دکن میں سیاسی شعور اور اجتماعی زندگی پیدا کی، اس وقت جب کہ افق دکن پہ سیاسی بادل منڈلا رہے تھے اور اغیار کی کوشش اس اسلامی سلطنت اور مغلیہ تفوق و عظمت کی آخری یادگار کو مٹانا چاہتی تھیں۔ آپ نے سینہ سپر ہو کر اغیار کے ہر حملہ کا مقابلہ کیا اور حیدر آباد کو اس بھونچال سے بچا لیا جو اس کے اطراف پیدا کیا جا رہا تھا۔ ہم خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہیں کہ وہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرماتے ہوئے مسلمانانِ دکن کے لئے ان کا بدل نصیب کرے۔

جامعہ عثمانیہ میں جلسۂ تعزیت

حیدر آباد دکن۔ ۲۷ امرداد، کلیہ فنون کی عظیم الشان عمارت میں سرزمین دکن کے عظیم المرتبت فرزند قائد ملت مولوی محمد بہادر خاں صاحب مرحوم کے انتقال پر ملال پر اپنے عمیق رنج و غم کا اظہار کرنے کے لئے طلباء جامعہ عثمانیہ اور اساتذہ صاحبین کی جانب سے ایک جلسہ تعزیت منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت مولوی سید محمد اعظم صاحب معین امیر، جامعہ نے فرمائی۔ کاروائی

کا آغاز قرآن سے ہوا۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب نے اپنے مختصر سی، تقریر میں فرمایا کہ ہم اس سانحہ پر اظہار تعزیت کے لئے جمع ہوئے ہیں جن کا رنج و ملال سب کو ہے اور وہ ہستی محتاجِ تعارف نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقی عظمت کی حامل ہستیاں محتاجِ تعارف نہیں ہوا کرتیں اور میں سمجھتا ہوں کہ رنج و غم کے اظہار کا بہترین طریقہ خاموشی ہے۔ مسٹر اعظم کی تقریر کے ساتھ ہی ساری مجلس پر مکمل خاموشی چھا گئی۔

مسٹر حامد علی متعلم یل یل بی نے حسب ذیل قرارداد تعزیت پیش کی جس کو حاضرین نے ایستادہ ہو کر منظور کیا طلباء، اساتذہ، عہدیداران و عمال جامعہ عثمانیہ کا یہ جلسہ قائد ملت مولوی محمد بہادر خاں مرحوم و مغفور کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اس سانحہ کو ملک کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان تصوّر کرتا ہے۔ مرحوم ملک کے مخلص خادم اور سچے جاں نثار تھے اور ہندوستان کی حریت کے علمبردار اور عالم اسلام کے مجاہدِ اعظم یہ جلسہ بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہے کہ وہ، مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا، فرمائے۔

آخر میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے فرمایا کہ مرحوم کی خواہش تھی کہ مسلمان نوجوان قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کے قابل ہو جائیں اور اگر مسلم نوجوانوں نے ان کی تمنا کی تکمیل کی تو ان کی روح کو مستقل ثواب ہوتا رہےگا دعائے مغفرت پر جلسہ ختم ہوا۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی کابینہ کا یہ جلسہ ملک دکن کے مایہ ناز فرزند نواب بہادر خاں صاحب کی اچانک وفات پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے اور اس کو ملک کا ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

قائد ملت کی مرگ مفاجات

حیدرآبادی صحافت کا نذرانۂ عقیدت

انجمن صحافت

انجمن صحافت حیدرآباد کا یہ جلسہ عام قائد ملت مولوی بہادر خاں، مرحوم و مغفور کی بے وقت وفات کے سانحۂ عظیم پر اظہار تعزیت کرتا ہے اور مرحوم کی حسرت ناک وفات کو ایک عظیم قومی نقصان سمجھتا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔

مجلس مدیران جرائد

قائد ملت مولوی محمد بہادر خاں صاحب کے سانحہ ارتحال پر اظہار تعزیت کے لئے انجمن مدیران جرائد حیدرآباد کا ایک جلسہ کل شام مسٹر علی اختر مدیر تنظیم کی قیام گاہ پر منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعہ قائد ملت کے اچانک اور بے وقت انتقال پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔

ملک کا سپاہی

سیّد محمود وحید الدین (مدیر رہبر دکن) حیدرآباد دکن۔

اس جہان میں مسلسل انسانی زندگی کے نشیب و فراز بعض وقت کتنے اچانک کتنے غیر متوقع اور کتنے روح فرسا ہوتے ہیں۔ حیات اور موت کا رشتہ کتنا قریب اور کتنا عجیب ہے۔ ابھی تک جس گوشۂ حیات سے ہم زندگی اور کامرانی کی تفسیریں سن رہے تھے وہیں بیٹھے آج زندگی کی ناپائیداری پر آنسو بہا رہے ہیں دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں نہ جانے کتنے سانحے ہو ہو جاتے ہیں لیکن سب ہی یکساں درد انگیز اور جانکاہ نہیں ہوتے ملت اسلامیہ

دکن کی نشاۃ ثانیہ کے جلیل القدر مجاہد کی موت ہندوستان کے لاکھوں قلوب کی آرزوؤں اور تمناؤں کی موت ہے۔

یہ خطابت کی بیوگی وضعداری شرافت، خلوص مند برادر جذبۂ خدمت کا جنازہ ہے، قوم کا یہ سپاہی اپنا تن من دھن سب اپنی ملت پر نچھاور کر چکا تھا اس کا ایمان محکم وفاداری... مستحکم عمل پیہم نظر بلند، سخن دل نواز اور فکر مرتب تھی جب دیکھئے مسکراتے ہوئے ہشاش بشاش اپنے اور غیر کا کوئی لحاظ نہیں سبھی کے ساتھ زندگی کی ساری توانائیوں کے ساتھ مسائل نمٹنے کے لئے ہمیشہ تیار نہ اپنی راحت و آرام کا خیال نہ محنت و تکان کا احساس بارگاہِ خسروی کا یہ حاضر باش غریبوں اور مفلسوں کا یہ غمگسار کہیں مشیر، کہیں مقرر کہیں دوست کہیں محسن کہیں قائد یکساں مقبول سب کی نظروں کا تارہ اور ہر دل عزیز۔

اسلام کا سچا شیدائی آج مادّی طور پر ہم میں نہیں اپنے خالق کے سایہ میں چین و آرام کی نیند سو رہا ہے۔ کارساز حقیقی کے پاس اس کا مقام اس کی بے لوث خدمت کی مناسبت سے بلند و بالا ہو گا۔ اور اس دنیائے فانی میں ہمارے ساتھ رہے یا نہ رہے اس کا تعلق ہم سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔

لوگوں کی زندگیاں موت سے بھی بدتر ہوتیں ہیں، نواب کی موت زندگی کی ایک مستحکم ضمانت ہے، انسان مر سکتا ہے ان کی خوبیاں نہیں مر سکتیں، قائد مر سکتا ہے لیکن اس کے کارنامے نہیں مٹائے جا سکتے۔ قائد کی موت آنسو کی نذر نہیں مانگتی ان کی قبر پر پھولوں کی چادر کی ضرورت نہیں ان کی روح تنظیم اور خدمت کا مظاہرہ چاہتی ہے نواب کی موت پر دھاریں مار کر رونے والوں کی نظریں نواب کے ورثہ کی طرف اٹھنا چاہیئے۔ کتنے مسائل اور کتنے کام ہیں اپنے تعلق خاطر کا مظاہرہ زبان سے نہیں عمل سے ہونا چاہیئے ایسے قائد کی موت پر ماتم اور آہ و بکا بھی ہمارے شایان ہیں، قائد .... کی موت کچھ اور چاہتی ہے ... اس کا نمونہ اسی کی زندگی میں ڈھونڈھئے نوجوانو

اور خدمت گذاروں کے رہبر کی زندگی ایک نشان راہ ہے جو منزلِ مراد کی طرف بلا رہی ہے..... وہ زندگی بھر مسکراتے رہے ہر تکلیف کو تبسم انگیز کیا۔ دیکھئے وہ اب بھی کھڑے مسکرا رہے ہیں، قائد ملت کی قسم، ان کے خلوص و ایثار کی قسم، مسلم قوم زندہ ہے اور زندہ رہے گی کارکنان مجلس اتحاد المسلمین، قائد ملت کے بعد بھی منزل اور مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی جانبازی حکمت اور تدبر، کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں گے۔ سپاہی کی جگہ کبھی خالی نہیں ہوتی، قائد ملت نے جو دیا روشن کیا تھا وہ بجھ نہیں سکتا۔ اس گوشہ سے ہزاروں چراغ روشن ہوتے ہیں اور ہو چکے ہیں، اسی نقش قدم پر چل کر ملک اور قوم کے یہ خادم تاریخ کے لئے ایثار، وفاداری بے نیازی جرات تدبر اور سیاست کا ایک نیا ورق تیار کریں گے بلت کے اس فدائی کی روح اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

کارواں باقی ہے میر کارواں جاتا رہا

از۔ مولوی سید احمد عارف صاحب مرحوم مدیر صبح دکن۔ حیدرآباد دکن

ذہن اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ مولوی بہادر یار جنگ کو موت نے ہم سے چھین لیا، طبیعت اس اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتی کہ ملت اسلامیہ دکن کا واحد رہنما فنا کے راستوں پر گم ہو گیا۔ یقین نہیں آتا کہ جس کی آواز میں سوتے ہوؤں کو جگانے کی قوت تھی وہ خود آج دائمی نیند سو رہا ہے، لیکن کیا کیا جائے حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ اے دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی ماننا پڑتا ہے کہ نواب صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے علحدہ ہو گئے، لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ کیا ان کی موت کو محض ایک انسانی موت کہا جا سکتا ہے اور کیا صرف ایک شخصیت نے ساتھ چھوڑ دیا ہے، بے پایاں غم و اندوہ کے ہنگامے میں سکون کا ایک لمحہ میسر ہو تو اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج صرف

ہمارے محبوب قائد بہادر خاں ہی کا انتقال نہیں بلکہ وہ تمام خصوصیات مرگئیں جنہیں آپ کی ذات میں درجہ کمال تک پہنچنا نصیب ہوا تھا شرافت مرگئی جس کا افسوں آپ کے تمام ملنے والوں پہ طاری تھا خطابت مرگئی جس سحر نے دوستوں ہی کو متاثر نہیں کیا تھا بلکہ اکثر موقع پر مخالفین کے خیالات کا رخ بدل ڈالا تھا جوش عمل مرگیا جس نے کچھ ہی دن پہلے ورنگل میں خس پوش جھونپڑیوں کو طوفانی، بارش کا حریف بنا دیا تھا فکر و نظر کی رفعت مرگئی جو مرحوم کی فطرت کا جزو تھی۔

اور جیسے وہ اپنے رفقائے کار میں بھی دیکھنا چاہیئے تھے، رواداری اور وسیع النظری مرگئی جس کی وجہ سے آپ صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ معقولیت پسند برادران وطن میں بھی بہت مقبول تھے۔ ان خصوصیات کی فہرست بہت طویل ہے اتنی طویل کہ اس پر نظر ڈالتے ہی دل کا غم کچھ اور سوا ہو جاتا ہے۔ انسانیت اور قیادت کے کیسے کیسے انمول جوہر تھے جنہیں مرحوم اپنے ساتھ لے کر ہم سے رخصت ہو گئے اور مسلمانان دکن کو انتہائی نازک وقت میں اس قافلہ کی طرف چھوڑ گئے جو موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہو اور اپنی راہ متعین نہ کر سکتا ہو۔

دنیا میں موت سے بڑی کوئی حقیقت نہیں اور حقیقت کی کارفرمائی کے سامنے گردن جھکانی پڑتی ہے۔ آج قائد ملت نے اس منزل کو طے کیا کل ہم اور آپ سب اسی راستہ سے گزریں گے رونا اس بات کا ہے کہ قحط الرجال کے موجودہ دور میں ایک ایسی شخصیت ہم سے چھین لی گئی جس کا بدل ملنا تقریباً ناممکن ہے مدتوں کے بعد چمن میں ایک دیدہ ور پیدا ہوا تھا قدرت نے اسے بھی رہنے نہ دیا۔ دکن کی سیاست اسلامی کے افق پر ایک ستارہ چمکا تھا جس کی روشنی دور دور تک پہنچ رہی تھی اور اس روشنی کے سہارے سے بھٹکے ہوئے مسافر منزل کا سراغ پا رہے تھے یکا یک ستارہ ٹمٹمایا اور لامحدود خلا میں گم ہو گیا قومی ترقی کی محفل میں ایک شمع روشن ہوئی تھی اور اس کے نور سے فائدہ اٹھا کر حصول عظمت کے طریقے مدون کئے جانے والے تھے۔ یک بیک شمع جھلملائی اور ساری محفل تاریک ہو گئی ہم بنیادی طور پر

قنوطیت کو پسند نہیں کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قائد ملت کی وفات نے . . .
مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچایا ہے، اس کی تلافی بظاہر محال ہے
زندگی کی گاڑی اسی طرح چلتی رہے گی عالمی سیاست کے ساتھ ساتھ ہمارے
یہاں کی سیاست بھی نشیب و فرازسے گذرے گی، پلیٹ فارم اسی طرح سجائے
رہیں گے مقررین اسی طرح زور خطابت کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔ غرض کہ
زمانہ اپنے سابقہ انداز میں ہزاروں پہلو بدلے گا۔ لیکن چشم بینا ہر ماحول میں
ایک کمی محسوس کرے گی ہر عالم میں کسی کو ڈھونڈے گی اور ہر مقام پر کسی
کو نہ پاکر مایوسی کے آنسو بہانے پر مجبور ہو جائے گی۔

قائد ملت صرف ایک لیڈر ہی نہ تھے بلکہ ایک مکمل انسان تھے ان کی
خصوصیتیں فراموش نہیں کی جا سکتیں ان کی فطرت کی سادگی اور طبیعت کا خلوص
ہر ماحول کو اپنا لیتا ہے۔ ان میں ایک انفرادیت تھی ایک امتیازی وقار تھا
سیاسی پلیٹ فارم ہو یا شعرادب کی محفل فلسفیانہ صحبت ہو یا مذہبی اجتماع
بہادر خاں کی شخصیت اور اس شخصیت کی ہمہ گیری نمایاں رہتی ہے خطیب
اب بھی موجود ہیں سیاس آج بھی مل سکتے ہیں علما کی اس وقت بھی کمی نہیں مگر وہ
بات کہاں ؏ ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

سنتے ہیں کہ مرحوم کے اولاد نہیں لیکن ہماری رائے میں یہ خیال صحیح نہیں،
مجلس اتحاد المسلمین کو آپ کی اولاد کہا جا سکتا ہے آپ نے اس ادارہ کو ذہنی،
جسمانی صوری، معنوی تربیت کے لئے بڑی بڑی مشکلات کا مقابلہ کیا، یہ ادارہ
آپ کی پر خلوص سرگرمیوں اور مسلسل مشقتوں کی یادگار ہے۔ اس یادگار کو
باقی رکھنا ان لوگوں کے لئے فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے جو آج تک آپ کے شریک کار
رہے ہیں ہماری قوم ایک مردہ پرست قوم ہے وہ زندگی میں اپنے محسنوں کی
قدر نہیں کرتی لیکن ان کے بچھڑنے کے بعد آنسو بہاتی ہے، یادگاریں قائم کرتی
ہے یوم مناتی ہے، ہماری رائے میں قائد ملت کی اس سے بہتر کوئی یادگار

نہیں ہو سکتی کہ آپ کے نصب العین کو زندہ رکھنے کی کوششیں کی جائیں ان لوگوں میں جنہیں مرحوم کا قرب حاصل رہا ہے ایسے حضرات موجود ہیں جو اپنے قائد کے حقیقی مقصد کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں اس مقصد کے حصول کی خاطر جدو جہد جاری رکھنا ان کے لئے لازمی ہے۔ قائد ملت کے احسانات کا کوئی معاوضہ ممکن نہیں سوائے اس کے کہ ان کی خواہش پوری کرنے کی سعی کی جائے جنہیں موت کے ظالمانہ اقدام نے پورا ہونے نہیں دیا۔ ان سطور کے خاتمہ پر تصور نے ... بیت الامت کا درد انگیز منظر نگاہوں سے قریب کر دیا دالان میں ایک لاش رکھی ہوئی ہے یہ دکن کے اسلامی مجاہد کی لاش ہے۔ اس مرد مؤمن کی لاش ہے جس کی زندگی ترقیِ ملت کے نقشے بنانے میں ختم ہوگئی۔ اس میر کارواں کی لاش ہے۔ جس نے گہری تاریکیوں میں منزل کے نشان تلاش کئے۔ چہرے پر ایک آسمانی نور چھایا ہوا ہے اور غیر متحرک ہونٹ اب بھی اپنے عقیدت مندوں کو سعی و عمل کا پیام دے رہے ہیں۔ خدا اس لاش پر رحمت کے موتی برسائے اور اس کے مدفن کو شمیم جنت سے معمور کرے۔ ع

خوش درخشیدہ ولے شعلہ مستعجل بود:

اخبار تنظیم کا اداریہ

ملت اسلامیہ دکن کا آفتاب غروب ہوگیا

دوشنبہ ۲؍رجب کی صبح کتنی غم انگیز اور اداس تھی جب قائد اسلامیان دکن بہادر خاں کے سانحہ ارتحال کی خبر سارے ہندوستان کے طول و عرض میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور وہ اس قائدِ... جلیل کی جوانمردگی پر آنسو بہانے لگے جو ایک بلند و بالا تر شخصیت کا مالک تھا اور جس سے اسلامیان ہند بڑی بڑی توقعات رکھتے تھے آہ... ہم سب کے لئے یہ صدمہ کتنا زبردست ہے کہ عندلیب بوستاں دیکھتے دیکھتے خاموش ہوگیا وہ جس کے سحر کار نغمے سارے ہندوستان

سے خراج تحسین وصول کرتے تھے اور جس کی حجازی لے زندگی کی ایک عجیب تڑپ پیدا کرتی تھی آج مہر بہ لب ہے۔ سب کی زبانوں پر یہی ہے کہ اب بہادر خاں کا بدل کوئی نہیں، ایسا پر خلوص سپاہی اور قائد اب کہاں اس نے ملک و ملت کے لئے سب کچھ لٹا دیا اور اس راہ میں سب کچھ قربان کر کے مسکراتا ہی رہا، اہل ملک کے اختلافات پر جس کا دل ملول رہا تھا آج اس کی جدائی پر سب رنج و ملال میں گرفتار ہیں اس نے ملت کی زبوں حالی پر ہمیشہ آنسو بہائے اور اس کی رحلت پر لاکھوں آنسو بہا رہے ہیں سب کی زبانوں پر یہی ہے کہ یہ قومی نقصان ناقابل تلافی ہے کتنا شدید اور کتنا عظیم سب کہہ رہے ہیں کہ یہ وفات صرف بہادر خاں کی نہیں رسول اللہ کے سچے عاشق کی بھی ہے وہ جس کا دل نام پاک سنتے ہی دھڑکنے لگتا تھا اور جس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے آج کتنے بلند مقام پر پہنچ گیا ہے یا وہ جو ملت کا فدائی اور بنی نوع انسان کا غم گسار تھا آج کس قدر محبوب و محترم ہو چکا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا،

اداریہ سہ روزہ تنظیم قائد ملت نمبر (حیدرآباد دکن)

ملت کے آنسو

ملت اسلامیہ کی امیدوں کا چراغ ابھی سلگا ہی تھا کہ اس پر حسرت و یاس کی ہوا کے خطرناک جھونکے حملہ آور ہونے لگے ابھی ہماری کشتی ساحل پر پہنچ ہی رہی تھی کہ ہم نے دیکھا کہ ہمارا ناخدا اپنچو کو کشتی والوں کے حوالے کر کے خود رحمت کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ ابھی ہم میں زندگی پیدا ہی ہو رہی تھی کہ داعیِ اجل نے ملت اسلامیہ کے نباض کو لبیک کہتے ہوئے سنا۔ ابھی دکن کے افق پر آفتاب طلوع ہوا ہی تھا اور ہم اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ موت کا غبار اٹھا اور ہماری آنکھوں سے اسکو دیکھنے کی طاقت چھین لیا لیکن آفتاب

کی تمازت ابھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ ۳؍رجب کی شام آئی اور اپنے ساتھ افلاس اور نحوست کا پیام لائی۔ اس رات ملت اسلامیہ بلکہ عالم اسلام کے لئے نحوست کا ستارہ طلوع ہوا اور دکن کا یہ شاہ خاور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا۔ رات کے دس ہی بجے تھے کہ ملت اسلامیہ کے محبوب قائد کے انتقال پر ملال کی دل خراش اور دل شگاف خبر نہایت سرعت کے ساتھ سارے شہر میں پھیل گئی لیکن ہر شخص اس خبر کی صداقت پر مشکل ہی سے یقین کر رہا تھا ہر کوئی اس کو صحیح سمجھنے کیلئے آسانی کے ساتھ تیار نہیں تھا۔ ہر کسی کی یہی تمنا تھی کہ یہ خبر غلط ثابت ہو۔ سب کے سب اپنے محبوب قائد کی سلامتی کیلئے دعائیں مانگتے دیوانہ وار گھروں سے نکل پڑے۔

اس رات قائد ملت ایک دعوت میں مدعو تھے۔ اسی دعوت میں خدائے بزرگ و برتر نے بھی اپنے محبوب بندے کو دعوت دی اور خدا کا یہ اطاعت گزار اور فرمانبردار بندہ جس کا ہر عمل رضائے مولا کیلئے تھا فوراً اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگیا بندوں کی دعوت کو ٹھکرا کر دنیاوی مروتوں کا ذرا بھی لحاظ کئے بغیر اپنے پیدا کرنے والے کی دعوت کو قبول کر لیا جس نے زندگی بھر بے مروتی کو اپنے نزدیک بھٹکنے نہیں دیا اور جس نے تمام عمر کسی کے دل کو توڑنا گناہ سمجھتا رہا وہ آج تمام مروتوں کو ٹھکرا کر اور کئی دلوں کو توڑ کر اپنے پیدا کرنے والے کی آواز پر لبیک کہتا ہوا ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا مہمانوں سے بھرا ہوا گھر دم بھر میں ماتم کدہ بن گیا میزبان اور تمام مہمان ماتم گساری میں مصروف ہو گئے۔ ابھی ابھی سب ہنس رہے تھے اور ابھی ابھی سب رونے لگے۔ جس گھر سے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں اس گھر سے آہ و بکا کی صدائیں آنے لگیں۔ جس گھر میں خاص خاص لوگ مدعو تھے اسی گھر میں تھوڑی دیر بعد عوام کا کثیر مجمع اپنے محبوب قائد کی غیر متوقع وفات پر خون کے آنسو بہا رہا تھا ہر ذی روح اپنے روح پرور کی موت پر چلا رہا تھا ہر آنکھ اپنے بصیرت عطا کرنے والے کی موت پر آنسو بہا رہی تھی، ہر ہاتھ اپنے قوت بخشنے والے کی موت پر سینہ پیٹ رہا تھا سب کے سب ماتم کر

رہے تھے۔ اپنی قسمت پر اپنے قائد کی وفات پر اس کی موت پر جس نے ہم میں زندگی پیدا کی جس نے ہم کو قوت بخشی جس نے ہم کو استقامت عطا کی جس نے مایوسی کو کفر بتایا۔ جس نے مصیبتوں میں بھی مسکرانے کی تلقین کی۔ جس نے بیکسوں اور مجبوروں کی مدد کی جس نے یتیموں کی سرپرستی کی۔ جس نے امارت کو غربت پر سے قربان کر دیا۔ جس نے باطل کی قوتوں کو کچل ڈالا جس نے حق پرستی اور حق گوئی کا بول بالا کیا۔ جس نے اپنے عمل سے رواداری کی ایک زبردست اور بے نظیر مثال قائم کر دی جس نے ہمارے قلوب میں بیداری کا جذبہ پیدا کیا جس نے غیروں کی نگاہوں میں ہمارے لئے عزت اور سربلندی پیدا کر دی جس نے ہمیں ایک زبردست سیاسی عظمت اور وقار کا حامل بنا دیا ہم نے اس کی بے وقت موت پر اپنے جیب اور دامن کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔ جس نے ہماری بروقت رہنمائی کی۔ جب ہم خواب غفلت میں پڑے سو رہے تھے، موت کو حیات تصور کر رہے تھے۔ ذلت کو عزت اور زوال کو عروج سمجھ رہے تھے۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں اچھے اور برے کی تمیز کا مادہ نہیں تھا۔ دوست اور دشمن کی پہچان نہیں تھی۔ ہم مصیبتوں کا شکار ہو کر ذلتوں کی ٹھوکریں کھا کر کبھی کبھی آنے والی بربادیوں سے بچنے کے لئے بے قرار ہوتے تو طرح طرح کی تدبیریں سوچتے نئے نئے طریقے ڈھونڈتے لیکن بالآخر ہماری پریشانیاں اغیار کے آشیانوں پر محو سجود ہو جاتی تھیں۔ اور ہمارے نزدیک یہی ایک نجات کا راستہ تھا لیکن تو نے ہماری پریشانیوں کو آزاد کرایا اور تمام دنیاوی راستوں کو ترک کرا کر اس سے راستہ جوڑنے کی تلقین کی۔ جو دین اور دنیا میں ہمارے لئے عزت و اقبال کا شرف و امتیاز پیدا کرتا ہے۔ شکل و صورت کا اعتبار کرتے ہم انسان کہلاتے تھے۔ لیکن ہم میں کوئی انسانی زندگی نہیں تھی، ہم میں

کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے ہماری انسانی زندگی کا ثبوت مل سکے ۔ ہم دماغ رکھتے ہوئے بھی دوسروں کے دماغ سے سوچتے تھے، بولنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتے ہوئے بھی ہم دوسروں کی آواز سے بولتے تھے۔ پاؤں چلنے کی طاقت اور قوت رکھتے ہوئے بھی ہم دوسروں کی پشت پناہی اور ہمت افزائی پر دوسروں کے لئے اپنے قدم آگے بڑھاتے تھے ۔ مختصر یہ کہ ہماری مثال بالکل چارپایوں کی سی تھی غفلت کی سرشاری نے ہمیں انسانیت سے محروم کر دیا تھا لیکن تو نے اپنی ایک صدائے غفلت شکن سے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ اب ہمارے غور و فکر کو دوسروں کی ضرورت نہیں اور ہم اپنی آواز کی پوری طاقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ بولنے لگے ہیں۔ ہم اپنے مقام کو بھول چکے تھے۔ اپنی عظمت کو ایک قصۂ ماضی سمجھ رہے تھے۔ دوسروں کے آگے سجدہ کر رہے تھے ۔ غیروں سے بھیک مانگ رہے تھے۔ بجائے دوسروں کو نجات دلانے کے ہم خود انہی سے نجات کی راہ دریافت کر رہے تھے۔ لیکن تو ہماری شان و شوکت اور عزت و عظمت کے ترانے گاتا ہوا آیا اور ہم کو ہمارا بھولا ہوا مقام بتلایا۔ اور اس مقام پر پہنچنے کے راستوں اور طریقوں سے آگاہ کیا۔ تو نے بتلایا کہ ہم دنیا میں غلام رہنے کیلئے نہیں بلکہ غلاموں کو آزاد کرانے کیلئے بھیجے گئے ہیں، ہم ذلت اور پستی میں رہنے کیلئے نہیں بلکہ عزت اور عظمت سے زندگی گزارنے اور دوسروں کو شان و شوکت کی زندگی بخشنے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں ۔ ہم یہاں خدا کے خلیفہ ہیں۔ ہم دنیا میں محکوم رہنے کے لئے نہیں بلکہ دنیا پر حکومت کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہم دنیا میں بدبختی اور بدقسمتی کی زندگی گذارنے کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی قسمتوں کو بدلنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہم دنیا میں ظلم سہنے اور مظلوم رہنے کیلئے نہیں۔ بلکہ دنیا سے جور و ظلم اور جبر و استبداد کو مٹانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ تو نے

ہم کو ہماری صلاحیتوں سے واقف کروایا اور تو نے ہی بتلایا کہ ہم اپنے مالک ہیں ہم خود مختار اور آزاد ہیں تو نے ہی بتلایا کہ راہِ حق میں سر بکف ہونا اور جاں فروش بن جانا ہماری مشہور عادت اور پرانی صفت ہے، آج قائدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کی بے وقت موت پر سب رو رہے ہیں۔ آج انکے ساتھی آہ وزاری کر رہے ہیں ان کے پیرو سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ نوجوان آنسو بہا رہے ہیں قائدِ ملت کی خاموشی ان سب سے ایک سوال کر رہی ہے۔ قائدِ ملت اپنے پیرو اور اپنے رفیقوں اور نوجوانوں سے مخاطب ہو کر دریافت کر رہے ہیں اب مجھے اپنا ساتھی اپنا رفیقِ کار اور اپنا قائد کہہ کر پکارنے والو کیا تم اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتے ہو کہ تم مجھے اپنا ساتھی اپنا قائد کہہ سکیں۔ کیا تم نے بھی خدا کی راہ میں اپنے آپ کو لٹا دینے کا عملی عہد کر لیا ہے۔ کیا تم نے بھی خدا کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنے اور اس کے حکم و ایما کے ماتحت اپنی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ کیا تم نے بھی خدا کی راہ میں قوم کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کیلئے دریغ نہیں کیا؟ تمہیں بھی تمہارے حق وصداقت کی وجہ سے مجرم ٹھہرایا گیا کیا تمہاری خالص مذہبیت اور صحیح اسلامی جذبہ کی وجہ سے تمہیں بھی کفر کے فتووں کی دھمکیاں دی گئیں کیا تمہارے بھی قومی خدمات کے راستوں میں روڑے اٹکائے گئے کیا تمہیں بھی نیک کاموں سے ہٹانے کیلئے اعزازات اور روپیہ پیسہ کی لالچ دی گئی؟ اور کیا تم ان تمام مصیبتوں اور رکاوٹوں کے باوجود بلند ہمتی سے آگے بڑھنا چاہتے ہو؟ اور کیا تم ان تمام مشکلوں کا مستقل مزاجی اور مردانگی سے مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو۔ اگر نہیں تو میری دوستی میری قیادت اور میری رفاقت کا دم مت بھرو تم اس حالت میں اپنا دوست اپنا رفیق اور اپنا قائد کہکر مجھے شرمندہ مت ہونے دو۔ اور اگر تم ان تمام چیزوں کیلئے تیار ہو اور تم اس مقام پر پہنچنا چاہتے ہو جہاں میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا تو بے شک تم میری دوستی کا دم بھر سکتے ہو اور میں بھی تم پر ناز و فخر کرنے لگونگا

قائدِ ملت سے عقیدت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے قائد کی زندگی کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں قائدِ ملت ایک زبردست انقلابی تھے اور انقلاب آپ سے عقیدت نہیں بلکہ ایثار و قربانی اور عمل چاہتا ہے۔ قائد مرحوم کی زندگی اور ان کی تعلیمات کو عملی طریقہ سے سمجھنا اور اس پر سختی سے عمل کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر ہماری کامیابی اور ہمارے شاندار مستقبل کا دارومدار ہے۔

قائدِ ملّت کی مرگ مفاجات

از: مولوی قاضی عبد الغفار صاحب، مدیر "پیام"، (حیدرآباد دکن)

مسلمانانِ دکن کی قومی زندگی کا بہت بڑا المیہ: قائدِ ملت بہادر خاں مرحوم و مغفور کی وفات مسلمانانِ دکن کی زندگی میں ایک ایسا حادثۂ عظیم ہے جس پر ماتم کرنے کے لئے نہ قلم میں طاقت ہے نہ زبان میں قوت وہ اپنے رب کے جوارِ رحمت میں محوِ خوابِ ابد ہیں۔ ان کی یاد میں آنسو بہانا ایک تقاضائے... فطرتِ انسانی ہے لیکن اس تقاضے سے بھی بڑا تقاضہ ان کے پیام اور ان کے کام کو زندہ رکھنا ہے۔ یہی ان کی سب سے بڑی یادگار ہوگی اور یہی وہ میراث ہے جو اپنی قوم کے لئے دنیا میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہ وقت ان مسائل پر بحث کرنے کا نہیں ہے جن کے لئے مرحوم نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ایک مردِ مجاہد کی طرح اپنی عمر کے آخری لمحہ تک صرف کیا۔ ہمیں اب یہ سمجھنا ہے کہ ان کے حصہ کا کام جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کیا تھا وہ انجام دیئے گئے اور اب ان کے مرتب کئے ہوئے شیرازہ کو قائم رکھنا ان لوگوں کا کام ہے جو ان کے بعد باقی ہے۔ قائدِ ملت کے مرگ مفاجات مسلمانانِ دکن کی قومی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ وہ اسلامیانِ دکن کے دلوں میں اپنا جو نقش چھوڑ گئے ہیں اس کو غم اور الم کے ہنگامی اور عارضی مظاہروں میں صرف ہونے کے بجائے جہدِ حیات کے میدانِ عمل میں سجدہ گاہ صاحبِ نظراں ہونا چاہیئے.... اب جب کہ وہ محبوب شخصیت ہمارے درمیان نہیں ہے، مرحوم کی یاد میں دلوں کی بیقراری کا مداوا صرف وہی ایک.... نوید ہو سکتی ہے جو مردِ مجاہد کے لئے کلام پاک کے ان الفاظ

میں بھیجی گئی ہے کہ : اُولئٰک اصحاب الجنۃ خٰلدین فیہا جزآء بما کانوا یعملون ۔

قائد ملت علیہ الرحمۃ

(حکومت آصفیہ کا سرکاری رسالہ "معلومات کا اداریہ")

قائد ملت مولوی محمد بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور کی اچانک اور بے وقت موت پر تمام ہندوستان میں انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا ہے مولوی صاحب مرحوم نے ابھی اپنی عمر کے چالیس سال بھی پورے نہیں کئے تھے اور اچانک اس عالم فانی سے رحلت فرما گئے۔ اتنی کم عمری میں قائد ملت کی ... ناگہانی موت نے اس قومی سانحہ کو اور زیادہ شدید و المناک بنا دیا ہے۔ افسوس ہے کہ قسمت کے بے رحم ہاتھوں نے ایسے زبردست انسان کا رشتۂ حیات اتقدر جلد منقطع کر دیا جو اتنی کم عمری میں عظمت و شہرت کے بام عروج پر پہنچ گیا تھا اور جس کے روشن ترین مستقبل سے ابھی اور بے شمار امیدیں وابستہ تھیں قائد ملّت بہادر خاں مرحوم ایک بے مثل و بے نظیر مقرر تھے اور ان کے قدرتی جوہر خطابت کے علاوہ علوم اسلامی سے ان کی کامل واقفیت ان کے خلوص اور حُسنِ نیّت اور انکی شخصیّت کی غیر معمولی کشش اور جاذبیّت نے بھی ان میں وہ زبردست قوت پیدا کر دی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی قوم کے دِل و دماغ پر ایسا قابو پا لیا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے اور وہ لوگ بھی ان کی عزت کرنے لگے جو سیاسی مسائل میں ان سے متفق نہ تھے، قائد ملّت علیہ الرحمۃ کی بے وقت موت نے حیدرآباد کی قومی زندگی اور مسلمانانِ ہند کی سیاست میں ایک جگہ خالی کر دی ہے جس کا مدّتِ دراز تک پُر ہونا بہت دشوار ہے، مرحوم نہ صرف مسلمانانِ حیدرآباد کی سیاسی سرگرمیوں کی جان تھے بلکہ تمام ہندوستانی ریاستوں کے مسلمانوں کی سیاست سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا کیوں کہ وہ کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے بانی صدر اور روح رواں تھے، خدا مرحوم کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں ممتاز جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

برصغیر میں صفِ ماتم

برصغیر کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی شخصیتوں اور ادارہ جات و اخبارات کا اظہار تعزیت

قاید اعظم کا پیام تعزیت

نواب بہادر یار جنگ میرے عزیز دوست تھے اور ان کی موت میرے لئے ایک جانگداز صدمہ ہے نواب مرحوم مومن صادق تھے اور اسلام کے بڑے داعی۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانان ہند کی زریں خدمات انجام دیں تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ہمارے لئے قدرت کا بیش بہا عطیہ تھے

قائد اعظم محمد علی جناح کا تعزیتی برقیہ

آپ کے شوہر کی اچانک وفات کی خبر سن کر انتہائی رنج اور افسوس ہوا۔ آپ اس سانحہ عظیم میں میری دلی ہمدردیاں قبول کیجئے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اس صدمۂ عظیم کے برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔

مس فاطمہ جناح

بہادر یار جنگ کے انتقال پر مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ اس غم میں میں بھی آپ کی شریک ہوں۔ خدا آپکو صبر جمیل عطا فرمائے۔

علامہ مشرقی کا تعزیتی برقیہ بہادر یار جنگ کی بے وقت موت کی خبر سن کر مجھے بڑا صدمہ ہوا ادارہ عالیہ رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔

محترمہ بیگم صاحبہ مولانا محمد علی مرحوم رامپور کا تعزیتی مکتوب

ان کا انتقال نہایت اندوہناک ہے اور ان کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ مرحوم کی ہستی ... مسلمانوں کے لئے اور مسلم لیگ کے لئے ایک نعمت تھی مشیت ایزدی کو یہی منظور تھا کہ ان کو ہم سے جلد جدا کر دیا جائے۔ گو وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کے بے لوث حب قومی یادر ہنے والی چیزیں ہیں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مولانا ظفر علی خاں کا تعزیتی بیان ایک دردناک سانحہ کا جب مجھے خیال آتا ہے تو ایک بجلی سی دل پر گرتی ہے۔ بہادر خاں جیسے شخص روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے "قرن باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود" بہادر خاں صرف دکن ہی کے رہنما نہیں تھے بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے دلوں پر گھر چکے تھے۔ ان کے مرنے سے سارے ہندوستان میں کہرام مچ گیا اور بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ جیسا عالمگیر ماتم انکا ہوا اور کسی کا نہیں ہوا۔ خدائے بزرگ و برتر نے دل و دماغ کی جو قابلیتیں ان کی ذات میں جمع کر دی تھیں وہ بہت کم انسانوں کو میسر آتیں ہیں۔ وہ ایک نہایت فصیح خطیب تھے اور جب کسی مجمع میں بولتے تھے تو سننے والوں کے دلوں پر جادو کے ڈورے ڈال دیتے تھے، ان کے دل میں اسلام کا درد تھا اور یہ درد ہر وقت انہیں بے چین رکھتا تھا وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمان عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں اور ہمسایہ قوموں میں مسلمانوں کا رتبہ بلند ہو، اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے، انہوں نے اپنی خداداد،

صلاحیتیں وقف کردی تھیں مجھے ذاتی طور پر ان کا نیاز مند ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ تاجدار دکن اعلیٰ حضرت نواب عثمان علی خاں مدظلہ العالی کی ذات گرامی کے ساتھ مرحوم کو جاں نثارانہ عقیدت تھی اور ان کی یہ تمنا تھی کہ مسلمانانِ دکن اس روشن خیال تاجدار کے سایۂ عاطفت میں ترقی کے وہ تمام مدارج طے کرتے ہیں کامیاب ہوں، جو زندہ قومیں طے کیا کرتی ہیں خدائے بزرگ و برتر مرحوم کو جوار مغفرت میں جگہ دے اور ملت کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

جامعہ ملیہ کے اراکین اور میں اس عظیم بہادر کے اچانک انتقال پر آپ کے ساتھ رنج و غم میں شریک ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

بدایوں کا تعزیت نامہ

مولانا عبد الحامد قادری بدایونی، نواب بہادر یار جنگ کے اچانک انتقال سے ہم سبھوں کو صدمہ پہنچا افسوس ہے کہ ایک بڑا خطیب اٹھ گیا۔ کل ہند ریاستی مسلم لیگ اور مجلس اتحاد المسلمین دونوں کے لئے یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ان کی روح کو کروٹ کروٹ چین نصیب کرے۔

مسٹر عبد العزیز کا پیام تعزیت

باب حکومت سلطنت اسلامیہ آصفیہ کے سابق رکن "عین شباب کے زمانے میں ان کی وفات مسلمانان ہند کے لئے" بالعموم اور مسلمانان حیدر آباد کے لئے "بالخصوص ایک زبردست مصیبت ہے اور اس حادثہ سے دور و نزدیک ہر جگہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی جو ان کے خلوص، بے غرض پبلک خدمت ہمت اور گہری حب الوطنی کو محسوس کرتے تھے۔ انتہائی صدمہ ہوا

مولانا عبدالروف شاہ صاحب کا بیان

رکن مجلس عاملہ کل ہند مسلم لیگ و صدر صوبائی مسلم لیگ صوبہ متوسط

"ملت اسلامیہ کی یہ انتہائی بدبختی ہے کہ وہ ہم سے اتنا جلد چھین لئے گئے۔ یقین مانئے کہ مرحوم کا ہندوستان میں کوئی بدل نہیں ایسی شخصیتیں صدیوں میں بڑی مشکل سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔"

ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال

عین جوانی میں بے وقت اور اچانک موت کی خبر سن کر مجھے بے حد ملال ہوا ان کے انتقال سے صرف حیدرآباد ہی نہیں بلکہ سارا مسلم طبقہ ایک بے لوث خدمت گذار اور سچے محب وطن سے محروم ہوگیا وہ ایک زبردست عالم تھے۔ انہوں نے اسلام اور اپنے ملک کی خدمت کے لئے زندگی وقف کر دی تھی۔

نواب صاحب ممدوٹ

انتقال کی دل ہلا دینے والی پرسوز خبر ملی۔ مرحوم میرے بچپن کے ساتھی تھے اور اب تک میرے اور ان کے درمیان انتہائی پرخلوص تعلقات برقرار تھے۔ وہ حقیقی اسلامی، زندگی کا نمونہ تھے وہ جس چیز کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ہندوستان ایسے زبردست قومی سانحہ کے لئے تیار نہ تھا ان کا جسد خاکی فانی تھا، مگر ان کے شاندار، کارنامے حق راہ پر نوجوانوں کے لئے ہمیشہ ایک نشان راہ ثابت ہونگے۔

سردار اورنگ زیب خاں وزیر اعظم صوبہ سرحد کا تعزیتی پیام

نواب صاحب کی موت اتنی المناک اور رنج دہ ہے کہ جتنے آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ مسلم ہندوستان ایک عظیم ترین محب وطن سے محروم ہوگیا اور میرا عزیز ترین بھائی مجھ سے بچھڑ گیا۔

وزیر داخلہ سندھ آنریبل گزدر کا تعزیتی پیام

مجھے بہادر خاں صاحب کی اچانک اور افسوس ناک انتقال کی خبر سے گہرا صدمہ ہوا ہم نے اپنا بہترین کار کن اور مسلم ہند کے مفاد کا عظیم مجاہد کھو دیا، ان میں یقین کی جرأت تھی اور وہ صداقت اور قربانی کا نمونہ تھے۔ انہوں نے اپنی خداداد لاثانی قوت تقریر کو مسلم قوم میں نئی روح پھونکنے کے لئے استعمال کیا۔ وہ ہندوستان میں مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے میں ایک ساتھی ایک ہندوستانی کی حیثیت میں ان کی موت پر ماتم کرتا ہوں ......

وزیر اعظم بنگال خواجہ ناظم الدین کا بیان

ان کی بے وقت موت کی اطلاع سن کر صدمہ ہوا، اور بے حد رنج ہوا۔ وہ ایک بڑے مقرر تھے اور انہوں نے کل ہند مسلم لیگ کے جلسوں اجلاسوں میں شرکت کی تھی جہاں ان کے تقاریر سب سے زیادہ جاذب توجہ رہتیں انہوں نے ریاستی مسلم لیگ کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور ان کی وفات سے مسلم ہند کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

خان بہادر اقبال احمد چودھری نائب صدر بنگال کونسل

ان کے اچانک انتقال کی خبر سن کر مجھے دلی صدمہ پہنچا۔ ہندوستان آج اپنے محبوب ترین اور عظیم ترین فرزند کی وفات پر ماتم کر رہا ہے انہوں نے اپنے ملک کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کو ہمیشہ قدر و احترام کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ ملک کے ایک ایسا ممتاز فرزند اور قائد کی وفات یقیناً ایک سانحہ عظیم ہے جو حق کی حمایت میں ہمیشہ لڑتا رہا۔

وزیر اعظم سندھ سر غلام حسین ہدایت اللہ کا حزن وملال

مجھے قائد ملت کے انتقال کی خبر سے دلی صدمہ پہنچا یہ ایک زبردست سانحہ ہے ان کی موت مجموعی طور پر سارے ہندوستان اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

ایرانی کونسل کا تعزیت نامہ

عالی مرتبہ نواب صاحب کی اچانک اور بے وقت موت سے بڑا صدمہ ہوا سنہ ۱۹۴۲ء میں ہم نے ان سے ایک اجنبی کی حیثیت سے ملاقات کی تھی لیکن چند ہی دنوں میں واپسی کے وقت ایک عزیز ترین دوست سے جدا ہوئے تھے وہ ایک ایسے مسلمان تھے جن پر دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔

چودھری غلام عباس صدر کشمیر مسلم کانفرنس

نواب بہادر خاں صاحب کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بے حد صدمہ پہنچا۔ جموں کشمیر مسلم کانفرنس اور اپنی جانب سے مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔

مرزا یوسف شاہ صاحب

ان کے انتقال سے کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے استحکام کا مضبوط ترین ستون منہدم ہو گیا

ڈاکٹر نعمت اللہ میر بلدیہ مدراس کا بیان

بہادر یار جنگ کے اچانک انتقال سے مجھے صدمہ ہوا جیسا کہ ہر مسلمان کو ہوتا ہے۔ حقیقتاً وہ ادبی دنیا کے روشن ستارے تھے جن کو خطابت میں کمال تھا مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر خصوصاً جب کہ ہندوستان کو ان کے جیسے قائد کی ضرورت تھی چل بسیں گے۔ وہ فطرتاً شریف

اور وطن پرست تھے اور ان کی وفات سے ہندوستان ان خوبیوں سے محروم ہو گیا وہ صفِ اول کے قائد تھے جن کی گفتار و کردار میں یکسانیت تھی، اَب مسلم قوم کو ان کے جانشین منتخب کرنے کا دشوار کام انجام دینا ہے۔

سید غلام مرتضٰی صدر سندھ مسلم لیگ کا پیام تعزیت

ریڈیو پر نواب صاحب کے اچانک انتقال کی خبر سن کر شدید صدمہ ہوا۔ اس قلیل عرصہ حیات میں مرحوم نے ملک و ملت کی فلاح کے لئے جو مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ ان کی قدر و منزلت سے ہر مسلمان کا دل معمور ہے۔ کاش ہم ان کی مفارقت سے اتنی جلد محروم نہ ہوتے۔ مگر قدرت کے کاموں میں بے بس انسانوں کو کیا دخل، اور اس کے پاس صبر کے سوا کیا چارہ خدا مرحوم کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے۔

سکھر نہ، ضلع نواب شاہ سندھ مسلم لیگ کی قرارداد تعزیت

مسلمانان سکھرنہ کا یہ جلسہ قائد ملت محمد بہادر خاں پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم لیگ کی وفات حسرت آیات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے۔ رب العزت کی درگاہ میں دست بہ دعا ہے کہ مرحوم کی روح پر فتوح کو غریق رحمت فرمائے۔

اے کے فضل الحق کا پیام تعزیت

بہادر یار جنگ کی شخصیت اور خلوص کی تعریف کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ان کا دل عوام الناس کے دکھ درد سے لبریز تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

بہادر یار جنگ مرحوم قائد اعظم کے قابل اعتماد رفیق تھے اور ہر نشیب و فراز میں قائد اعظم کے معاون رہے۔ آپ نہ صرف ایک عظیم الشان سیاسی رہنما تھے بلکہ مذہبی اور روحانی معلم بھی تھے۔ آپ اردو کے

حیرت انگیز مقرر اور خطیب تھے اور چونکہ ان کی ہر ایک بات خلوص میں ڈوبی ، ہوئی ہوتی تھی اس لئے آپ کے الفاظ عوام کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھے

راجہ غضنفر علی خاں کا پیام تعزیت

مرحوم جن خوبیوں کے مالک تھے وہ مشکل ہی سے ایک فرد میں مجتمع ہوتی ہیں۔ خطابت میں مرحوم خود اپنی نظیر آپ تھے۔

چودھری غلام عباس کا پیام تعزیت

قائد اعظم کے بعد، دنیا کے مسلمانوں میں ان کا ثانی کوئی نہ تھا۔ قدرت ، نے ان کو قبل از وقت ہم سے چھین لیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا اظہار تعزیت

بہادر یار جنگ میرے دوست تھے اور میں نے ہمیشہ ان کے خلوص پر ، اعتماد کیا مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ ایسا جو ہر قابل بڑے نازک موقعہ پر ان سے چھن گیا۔ اب ان کی یاد منانے سے بڑھ کر ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان اُن کی زندہ یادگار بننے کی کوشش کریں۔

سردار عبدالرب نشتر کا پیام تعزیت

نواب بہادر یار جنگ نے برصغیر کے مسلمانوں کی ایک بڑے کٹھن زمانے میں بیش بہا خدمت سرانجام دیں۔ اس سلسلہ میں انہیں قربانی بھی دینی پڑی اور وہ ان ، معدودے چند رہنماؤں میں سے تھے ، جنہیں قائد اعظم کا اعتماد حاصل تھا ، پاکستان کی تحریک کے سلسلہ میں وہ شب و روز منہمک رہتے تھے۔ برصغیر میں کوئی اہم مقام نہیں تھا جہاں وہ مسلمانوں کو بیدار کرنے اور منتظم کرنے کے لئے نہ گئے ہوں۔ ان کی وفات ہماری قومی تاریخ کا ایک دردناک سانحہ ہے خداوند تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے۔

ٹائمز آف انڈیا کا اظہار تعزیت

نواب بہادر یار جنگ مسلم سیاست کا زبردست مہرہ اور بہترین تقریری و تنظیمی صلاحیتوں کے حامل انسان تھے۔ ان کی مہذب شخصیت اپنے زمانے کی بہترین مثال تھی۔

اخبار مدینہ بجنور کا اظہار تعزیت

بہادر یار جنگ جیسی شخصیت کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی موت ریاستی عوام کے لیے بالخصوص اور دوسروں کے لیے بالعموم ایک ناقابل تلافی، صدمہ ہے

برصغیر میں تعزیتی جلسے !!!

مسلمانان بمبئی کا تعزیتی جلسہ

بمبئی ۲۸ر جون: قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کے سانحۂ ارتحال پر اظہار تعزیت کرنے کے لیے مسلمانان بمبئی کا ایک عظیم الشان جلسہ قیصر باغ میں بصدارت مسٹر چندری گر منعقد ہوا مسٹر چندری گر نے مسلمانان بمبئی کے اس عظیم اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ جلسہ مولانا بہادر خاں صدر کل ہند مسلم لیگ و صدر انجمن اتحاد المسلمین کے اچانک انتقال پر رنج و ملال ظاہر کرنے کے لیے منعقد ہوا ہے۔

بہادر خاں اسم با مسمی تھے۔ انہوں نے عہد طفولیت سے ہی کبھی خطرہ کا مقابلہ کرنے میں پس و پیش نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی مسلمانوں کے حقوق و مفاد کے تحفظ و صیانت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کے بعد مسٹر چندری گر نے کہا کہ مسلمان مولانا بہادر خاں کے عزم و ہمت جہد حیات میں اپنا نمونہ عمل بنائیں۔ انہوں نے مسلمانان حیدرآباد کی ایسی خدمت کی کہ حیدرآباد کو حقیقی معنوں میں عظیم تر حیدرآباد بنا دیا۔ وہ اسلامیات اور تاریخ اسلام کے جید عالم تھے ان کی زبردست قوت خطابت کا ایک

ثبوت یہ ہے کہ کل ہند مسلم لیگ کی سالانہ میقات میں قائد اعظم کی تقریر کے بعد حاضرین ان کی تقاریر کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے اس کے بعد حیدر آبادی مسٹر صدیق محمود نے تقریر کرتے ہوئے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کے اوصاف پر روشنی ڈالی۔ دیگر مقررین میں ڈاکٹر عبد الحامد قاضی، اور مولانا اکرام علی شامل تھے جلسے نے ایستادہ ہو کر حسب ذیل قرارداد تعزیت منظور کی۔

"مسلمانانِ بمبئی کا یہ جلسۂ عام مولوی محمدؐ بہادر خاں صاحب کے بے وقت اور اچانک انتقال پر اپنے عمیق رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اس وقت جب کہ مسلم ہند کو ان کی سخت ضرورت تھی ان کی، وفات نے ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ یہ جلسہ خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہے کہ وہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

بمبئی کے عربوں کا ماتم

بمبئی "مولوی بہادر خاں صاحب کی ناوقت وفات پر بمبئی کے عرب اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے انتقال سے ہندوستان اور عالم اسلام کے ایک بڑے زعیم کا نقصان ہوا۔ بمبئی کے عرب مرحوم کے خاندان سے مخلصانہ تعزیت کرتے ہیں۔

پونا میں ماتم

پونا میں مقامی مسلم لیگ کے زیر اہتمام جلسہ منعقد کیا گیا اور مسلمانان پونا نے مجاہد ملت مولوی محمد بہادر خاں کی وفات پر رنج و ملال کرتے ہوئے تعزیتی قرارداد پیش کی۔

مدراس میں غائبانہ نماز جنازہ

آنریبل ایس ایم پاشا صدر صوبائی.... مسلم لیگ کی ہدایت کے مطابق شہر مدراس کے تمام مساجد میں نواب بہادر یار جنگ بہادر مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کے لئے نماز غائبانہ پڑھی گئی۔

مدراس کے مسلم طلبا کی فیڈریشن کا جلسۂ تعزیت

مدراس کے مسلم طلبا کی فیڈریشن کا آج ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں نواب بہادر یار جنگ بہادر کی وفات حسرت آیات پر ایک تعزیتی قرار داد منظور کی گئی۔

مسلم لیگ آنبور

مسلم لیگ آنبور نے اپنے برقیہ میں لکھا ہے کہ قائد ملت کی وفات کو دلی رنج و غم سے سنایا گیا۔ مسلمانوں نے ایک مجاہد کھو دیا۔

بنگلور میں قائد ملت کا ماتم

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کے سانحۂ ارتحال کی خبر جیسے ہی بنگلور پہنچی مسلم حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کی ساری دکانیں اور تمام کاروبار بند کر دیا گیا۔ شام بصدارت خاں صاحب محمود شریف صاحب صدر آل میسور اسٹیٹ مسلم لیگ جلسہ تعزیتی متصل سلور جوبلی پارک جامع مسجد کے خطہ زمین پر منعقد ہوا جس میں ہزاروں مسلمانوں نے شرکت کی۔

قائد ملت کے شاندار خدمات کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ان کی بے وقت وفات کو ملک و ملت کے لئے ناقابل تلافی نقصان سے تعبیر کیا گیا ہے اور مسلمانوں نے قائد ملت کی مغفرت کے لئے دعا کی۔

دہلی میں ماتم

دہلی کے جلسوں میں مسلمانوں نے اس زبردست قومی حادثہ پر رنج و غم کرتے ہوئے تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں جلسۂ تعزیت

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مولوی، محمد بہادر خاں صاحب کی وفات حسرت آیات پر ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی صدارت میں جلسہ تعزیت منعقد ہوا، اور حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

" مسلم یونیورسٹی کے طالب علم اور اسٹاف کو کل ہند اسٹیٹ مسلم

لیگ کے صدر قائد ملت مولوی محمد بہادر خاں صاحب کی ایسی نازک حالت میں جب کہ ان کی سخت ضرورت تھی موت سے سخت صدمہ پہنچا۔ طلبا اور اساتذہ کا یہ تعزیتی جلسہ قائد ملت کے لئے دعائے خیر کرتا ہے کہ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان بالعموم مسلمانوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

وائس چانسلر نے اعلان کیا کہ مرحوم کے اظہار احترام کے طور پر آج یونیورسٹی اور اس کے متعلقہ ادارے بند رہیں گے اور کھیل کود بھی،

پٹنہ میں تعزیتی جلسے

نواب بہادر یار جنگ کے انتقال پر ملال سے مسلم حلقوں پر رنج و الم کی گھٹا چھا گئی۔ کئی ایک تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے جس میں مرحوم قائد کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خراج تحسین ادا کیا گیا۔

کپور تھلہ میں ماتم

مسلم لیگ کے زیر اہتمام نواب بہادر یار جنگ بہادر کی المناک موت پر ماتم کرنے کے لئے ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی یہاں مسلم تاجروں کی تمام دکانیں بند رہیں اور بہت سارے ہندو تاجروں نے بھی اپنے کاروبار بند رکھے۔

بلدیہ کلکتہ کا تعزیتی جلسہ

مولوی بہادر خاں صاحب کی وفات حسرت آیات پر کلکتہ کارپوریشن نے تعزیتی قرارداد منظور کی۔ بعد منظوری قرارداد بطور احترام اپنے اجلاس کو دس منٹ تک ملتوی کر دیا۔

کشمیر میں تعزیتی جلسے

کشمیر میں کوئی ایک ہفتہ تک ۲۲ر تعزیتی جلسے ہوئے جس میں بطل حریت کی اچانک موت پر سخت ترین رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔

لاہور کی ماتم گساری قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کی بے وقت اور پر حسرت موت کی اطلاع یہاں اورینٹ پریس کے توسط سے وصول ہوئی اس افسوس ناک اور پر ملال خبر سے مسلمانان لاہور کو دلی صدمہ پہنچا اس عظیم المرتبت قائد کی یاد میں اور ان کے احترام میں آج لاہور کے مسلم حلقوں میں تمام کاروبار بند رہے تمام مسلم اداروں کو تعطیل دے دی گئی اور ہر ایک مسلمان ان کی یاد میں غمگسار رہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا یہ جلسہ قائد ملت لسان الامت نواب بہادر یار جنگ کی اندوہناک وفات پر اپنے عمیق رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم نواب صاحب مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد دکن اور آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کے بانی و صدر اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سر برآوردہ لیڈر ہونے کے علاوہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرس کے بھی لائف ممبر اور خاص ہی خواہ و سرپرست تھے آپ کی رحلت مسلمانوں کی قومی تحریک اور متذکرہ بالا ملی اداروں کے لئے ایک ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، یہ جلسہ دست بدعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے نواب صاحب مرحوم و مغفور کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

تین ہمعصر علماء کا اظہار تعزیت

کیا پوچھتے ہو، کسے کھو دیا!

مولانا مناظر احسن گیلانی

یہ ماتم ہے بہادر یار جنگ غفر اللہ لہٗ کا۔ عالم اسلام جس کیلئے رُو رہا ہو، دکن رُو رہا ہو، اس کا وطن رو رہا ہو۔ سی پی میں جس کے ماتم کی صف بچھائی گئی اور یو. پی. میں جس پر آنسو بہائے گئے، اُف .. جس کے لئے مدارس چیخ رہا ہے، بمبئی والے دھاڑیں مار رہے ہیں۔ بہار کے باشندے کپڑے پھاڑ رہے ہیں۔

سندھیوں میں جس کا نوحہ پڑھا جا رہا ہے، پنجاب میں غم کا طوفان جس کے بعد اٹھا
اور کشمیر اور سرحد والوں کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب جاری ہوا کیا پوچھتے ہو کہ
اس کو کھو کر مجھ جیسے بے کس انساں نے کسے کھو دیا۔ فان اللہ وانا الیہ راجعون

انچہ من گم کردہ ام گر از سلیمان گم شدے۔
ہم سلیمان، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

تسلی جو کچھ بھی ہے وہ صرف اسی سے ہی کہ

غدا القی الاحبہ، محمدا وحزبہ

انشاء اللہ اسی حزب میں دوسروں کے ساتھ ہم اس کو بھی پالیں گے
جیسے آج کھو بیٹھے ہیں

حسبی اللہ ونعم الوکیل۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مولا عبدالماجد دریابادی

موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سوچتے
سوچتے یہ خیال آیا کہ موت آج ہی کل میں اگر آگئی تو نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کو دل
چاہتا ہے۔ نام کئی ایک ذہن میں آئے لیکن سب سے پہلا نام جو ذہن میں آیا وہ اسی
مجاہد اسلام بہادر خاں حیدرآبادی کا تھا۔ کاش بہادر یار جنگ دورہ اکرتے پھرتے
پھراتے عین اسی وقت اتفاق سے لکھنؤ موجود ہوتے ایسا کیوں ہونے لگا۔
لیکن دل کی کشش سے ایسا ہو جانا کچھ ناممکن بھی نہیں یہ تھی اس نامہ سیاہ کے
دل میں اس شیر دل مجاہد ملت کی محبت عظمت اور عقیدت۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آہ کہ جس سے یہ امیدیں قائم کی جا رہی تھیں۔ کیسے وہم گذر سکتا
تھا کہ وہ یوں دھوکہ دے جائے گا۔ اور جس کی دعاؤں کے لئے طلب وتمنا

تھی وہ خود آناً فاناً دوسروں کی دعاؤں کا مستحق ہو جائے گا۔ آہ مشتِ خاکِ انسان اور اس کے تارِ عنکبوت جیسے پودے پھسپھسے کمزور ارادے حوصلے سہارے، ۴۰ سال کی عمر بھی کوئی عمر تھی: اور پھر کیسے تندرست و توانا، ہنس مکھ اور خوش مزاج، خوش سیرت، و خوش صورت، بلا کے ذہین و نکتہ رس .... کسی بشر کے دل میں یہ خطرہ بھی گذر سکتا تھا کہ یہ کھلا ہوا پھول یوں چمن بھر کو مہکاتا ہوا بات کی بات میں نذرِ خزاں ہو جائیگا۔ محفل بھر کو منور، رکھنے والی شمع اسی لمحہ اسی آن بجھ جانے کو ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ موت بالکل اچانک ہوئی نہ سکرات کی تکلیفیں نہ نزع، روح کی سختیاں اور کیوں ہوتیں

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کے قبر!

ہمہ تن چشم انتظار ہے ... آج:

خوش نصیب قبر۔ خوش ہو کے تجھ میں آرام پانے کے لئے اللہ کے دین کا دلیر و باہمت سپاہی آ رہا ہے۔ وہ عزیزوں کا سہارا تھا۔ بے کسوں کا والی تھا۔ ملت کا پشت پناہ تھا۔

حکیم مطلق اور احکم الحاکمین بے نیاز کی مشیت میں دم مارنے کی مجال کس کو؟ یہ مطیع اور فرمابردار بندہ دین کا سپاہی اور امت کا، علمبردار چالیس سال میں واپس بلا لیا جاتا ہے۔ کسی عارف نے سچ کہا

کس را رسد نہ چوں چرا در قضائے ما

خدا بے نیاز کی بارگاہ میں!

علامہ سلیمان ندوی

بہادر خاں جیسا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، اور جب پیدا ہوتا ہے تو انقلاب انگیز ہوتا ہے۔ اس کی ذات سے امت اسلامیہ کو بڑی بڑی امیدیں تھیں اور خصوصیت کے ساتھ دکن کے مسلمانوں کے حق میں اس کا وجود آبِ حیات کا حکم رکھتا تھا۔ تاہم انسان ناچار ہے اسکی ناچاری

کاراز ایسے ہی موقعوں پر کھل جاتا ہے۔ تقدیر کا نوشتہ اور قضا کا حکم ناقابل تغیّر ہے۔ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ؀

۲۵ / جون ۱۹۴۴ء کو دفعتاً وہ حکم آیا اور بندہ یلا چون چرا ایک لمحہ کے اندر اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ اور دنیائے دوں سے چل بسا، اس پر اللہ تعالیٰ کی صد ہا رحمتیں ہوں، اور بے شمار نوازشیں، غالباً، مارچ ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ تھی۔ نواب دوست محمد خاں (جاگیر دار) کے یہاں دعوت تھی۔ جو مرحوم کے بڑے دوستوں میں تھے۔ احباب کا مجمع تھا۔ گفتگو مذہبی اور علمی تھی۔ مرحوم نے بڑے پراثر انداز میں کہا۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کی زبان سے جب وہ مصر سے نکل کر مدینہ میں پہونچے ہیں۔ یہ دعا تلاوت میں آئی (اے پرور دگار! تو میرے لئے بہتری کا جو ساماں ہو مہیا فرمادے میں اس کا محتاج ہوں) فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ؛ مرحوم نے اس موثر دعا کے ایک ایک لفظ کو بڑی تاثیر کی حالت میں پڑھا اور سامعین کے سامنے اس کی تشریح کی۔

خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں عرض ہے کہ اے بار الہا آج جب اس دعا کا خواستگار تیرے حضور میں ہے اور تیرے گھر کا مہمان ہے تو تو اس کے لئے وہی فرما جس کا وہ محتاج ہے

نوٹ قائد ملت کے استاد محترم بحر العلوم علامہ شمسی کے فرزند میرے استاد محترم مولوی اسد اللہ صاحب عباس نواب صاحب کے استاد زادے تھے۔ قائد ملت سے انہیں اور ان سے قائد ملت کو بیحد محبت تھی، جس دن شہید ملّت کا جنازہ سپرد خاک ہوا گھر لوٹے، رات بھر سو نہ سکے اور اسی شب "نالہ دل گداز" کے زیر عنوان نوحۂ غم لکھا (جو اَب تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے) میرے استاد زادے فرزند اکبر سیّد اشرف یداللّٰہی نے از راہ کرم نالہ دل گداز میرے حوالہ فرمایا، اس تعلق سے اپنے خط میں تحریر فرمایا کہ "اباجان مرحوم قائد ملّت محسنِ قوم کی میت میں شرکت سے آنے کے بعد انتہائی مضمحل اور شدتِ غم میں ڈوبے ہوئے تھے اور اس اضطرار کی کیفیت کو آپ نے اسی شب، سخن کی شکل دیدی"۔

نالہ دل گداز

وہ نوجوان اہلِ فضیلت کدھر گیا — کہتے تھے جس کو قائد ملّت کدھر گیا
بے نور کیوں ہیں آج خطابت کی محفلیں — وہ مہر آسمان خطابت کدھر گیا
منزل قریب ہے بنے ہیں گرداب سیکڑوں — وہ ناخدائے کشتیٔ ملت کدھر گیا
کیوں چھا گئی ہیں بزم سیاست پہ ظلمتیں — وہ اخترِ سپہر سیاست کدھر گیا
روئیں اگر نہ خون کے آنسو تو کیا کریں — وہ خیر خواہِ قوم و ریاست کدھر گیا
کامل یقیں فتح کا تھا جس کی ذات سے — وہ مہرۂ بساطِ سیاست کدھر گیا
ملتی نہیں جسکے اس ایثار کی مثال — وہ دُرِ شہسوارِ شجاعت کدھر گیا
تھی ملک بھر میں جسکی نوا سنجیوں کی دھوم — وہ عندلیب گلشنِ ملت کدھر گیا

صیاد! کچھ تو کہہ کے اسے ہو گیا ہے کیا
خاموش کنج قبر میں وہ سو گیا ہے کیا

پھرتے ہیں لوگ چاک گریباں اِدھر اُدھر — دنیا سے کون سوئے عدم کر گیا سفر

دیوار و در پہ چھائیں ہیں کیسی اُداسیاں — کیوں بند ہوگئے ہیں یہ بازار و رہگذر
رُخ سوئے اوجِ طائرِ ملت نے جب کیا — صیّاد نے کتر دیئے چپکے سے بال و پَر
موقع نہ ہاتھ آئے گا ایسا کبھی تجھے — رونا ہے جس قدر تجھے رو آج چشمِ تر
دیکھا نہ ہوگا چشمِ فلک نے دکن میں یہ — منظر جو آج دیکھتی ہے میری چشمِ تر
شاید پھر تجھ کو ایسا بہادر نہ مل سکے — تو اپنے اس شکار پہ اے موت فخر کر
خطروں کو بڑھ کے لیتا تھا ملت کے واسطے — پیشِ نظر ہے میرے وہ کشمیر کا سفر
تھی سب کی یہ دعا کہ ملے تجھکو عمرِ خضر — مرضئ حق کچھ اور تھی ہم کو نہیں خبر
عظمت کو تیری مان کر اٹھا وہ بزم سے — سن لی کسی نے گر تیری تقریر پُر اثر
بد قسمتی پہ اپنی اَب اے باغباں رو — پھل پھول لا کے نذرِ خزاں ہوگیا شجر

پیدا ہوا تھا خاکِ دکن سے یہ باکمال
اُگتے ہیں باغِ دہر میں پودے یہ خال خال

یہ داغ تیرا قبر میں بھی لیکے جائیں گے — مر کر بھی یاد تیری نہ دل سے بھلائیں گے
اس داغ کو کرینگے نہ منتِ کشِ دوا — اک یادگار تیری دل میں بنائیں گے
اے جانبوالے تو ہی بتا ہوگا حال کیا — جب محفلوں میں اپنی تجھے نہ پائیں گے
اوصاف یاد آئیں گے رہ رہ کے جب تیرے — روئیں گے خون کے آنسو اور رُلائیں گے
وہ کارنامے تیرے جو مشہورِ خلق ہیں — اے خلق کس طرح انہیں دل سے بھلائینگے
سینچے گئے ہیں پودے تیرے خونِ دل سے جو — سینے سے ان نہالوں کو اپنے لگائینگے
واعظ نہ روک رونے سے آگ ہے لگی — اس قطرہ ہائے اشک سے اسکو بجھائینگے
عباسؔ اس دیار سے اُکتا گیا ہے دل — بستی ہم اپنی اور کسی جا بسائیں گے

سارے دکن میں اک ہی ممتاز فرد تھا،
پوشیدہ جس کے سینے میں مسلم کا درد تھا

(حضرت مولوی سیّد اسد اللہ صاحب عباسؔ یداللّٰہی مرحوم)

عالم برزخ

رسالت مآبؐ کے حضور میں رسول اکرم صلعم کے غلام محمد بہادر خاں شہید کا جنازہ

قبر دنیاوی زندگی کے بعد آخرت کی پہلی منزل ہے۔ گویا قبر عالم برزخ میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ یہاں بندہ اپنے اعمال و عقائد کے بموجب راحت یا تکالیف میں مبتلا رہتا ہے۔

برزخ کا مفہوم لغت کے اعتبار سے برزخ کا مفہوم دو چیزوں کے درمیان جو چیز واقع ہو اور ان کو باہم ملنے سے روک دے یا ان کو الگ کر دے وہ عربی زبان میں برزخ کہلاتی ہے خواہ وہ پردہ یا اوٹ ہو، یا زمانہ یا کوئی اور شے۔ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ اور بَرز بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ میں برزخ سے مراد وہ روک ہے جو دو سمندروں کو ملنے سے باز رکھتی ہے ایک دوسری حدیث میں وساوس کو بَرَازِخُ الْاِیْمَانِ کہا گیا ہے یعنی شک اور یقین کے درمیانی حالت مفسرین ائمہ لغت نے برزخ کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ البرزخ الحاجز والمھلۃ متقاربات المعنی :-

(ابن جریر) البرزخ ما بین کل شیئین من حاجز (نہایۃ ابن اثیر)

البرزخ الحاجز الحد بین الشیئین (راغب)

اصطلاحی معنی اس لفظ کو قرآن مجید نے اصطلاحاً اس مدت یا اس حالت کے لئے استعمال کیا ہے جو انسان کی موت سے لے کر قیامت کے دن تک ہے جس آیت میں یہ لفظ وارد ہے وہ خود اسکے

اصطلاحی معنی کو واضح کرتی ہے۔

حَتّٰیٓ اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ (۲۳/۶)

یہاں تک جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے وہ کہتا ہے کہ پروردگار مجھے واپس کر دیجئے۔ امید کہ میں اس زندگی میں جس کو چھوڑ آیا ہوں نیک عمل کروں گا ہرگز نہیں یہ تو ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے آگے ایک برزخ ہے اس دن تک جبکہ وہ اٹھائے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت سے روز قیامت تک جو کچھ ہے اس کا نام برزخ ہے۔

(حوالہ برزخ از مولانا ابو اعلیٰ مودودی ص ۳۰ ، ۳۱ -

برزخ کا لفظ قرآن میں روک یا آڑ کے معنی میں مستعمل ہے

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ (۵۳/۲۵)

اور اللہ نے ان دونوں شور و شیریں سمندر میں آڑ رکھ دی اور رکاوٹ کی اوٹ۔

دوسری جگہ بجائے برزخ کے حاجز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا۔ (۶۱/۲۷)

اور اللہ نے دونوں سمندروں میں آڑ رکھ دی ہے۔

تاکہ وہ دونوں اپنے اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں،

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ۔ (۲۰/۵۵)

دونوں (سمندروں) کے درمیان، آڑ ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھتے۔

یہی معنی برزخ کے اس آیت میں ہیں۔

وَمِنْ وَّرَاۤئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۔ (۲۳/۱۰۰) | اور ان (مرنے والوں) کے آگے آڑ ہے اس دن تک کہ جس دن وہ اٹھائے جائیں گے ۔

یعنی برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے کہ اس میں وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے ۔ اور جب حشر ہوگا اللہ کے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے ۔

اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ھُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ (۳۶/۵۳) | بس ایک شور ہوگا اور ہمارے پاس وہ سب کے سب حاضر کر دیئے جائیں گے ۔

(حوالہ عالم برزخ از مولانا اسلم جیراج پوری ۔ ۵ ، ۶ ، ۷

دنیا کا برزخ سے بہت قریب کا رشتہ ہے کہ ہر ایک کا ایک نصف حصہ دنیا میں ہے اور ایک نصف حصہ برزخ میں ۔

اہل برزخ اور اہل دنیا کے درمیان باہم واقفیت احوال کے پانچ طریقے

حق تعالیٰ کی بالغ حکمت نے جب ان دونوں جہانوں میں اس تقسیم اجزا کی وجہ سے یہ خواہش فطرتوں میں ڈال دی ہے تو اسی کی فیاض قدرت کا یہ بھی تقاضا تھا کہ وہ اس خواہش کی تسکین کا سامان بھی پیدا فرمائے ، اور ایسے وسائل و ذرائع پیدا فرما دے کہ برزخ والے دنیوی مقامات و احوال سے اور دنیا والے برزخی مقامات و احوال سے خود بلا واسطہ بھی باخبر ہوتے رہیں اور ان مقامات کی معرفت حاصل کرتے رہیں ۔

یہ وسائل و طرائق کیا ہیں ؟ کتاب و سنت کی روشنی میں پانچ طریقے سامنے آئے جن سے براہ راست برزخی مقامات و احوال کا فی الجملہ علم ہوسکتا ہے ۔

پانچوں طریقوں کا اجمالی تعارف

ایک عینی مشاہدہ، دوسرا مخبر صادق کی خبر، تیسرے صاحب واقعہ کی اطلاع دہی، چوتھے انکشاف قلبی، پانچویں قیاس و استنباط۔

پانچوں طریقوں کے فنی اور اصطلاحی عنوانات

انہی پانچ مقامات کو اگر قدرے ترتیب بدل کر اور اصطلاحی لفظوں میں لاتے ہوئے حجتوں کے انداز سے بطور فنی ترتیب کے ادا کیا جائے تو ذیل کے عنوانات سے ادا کر سکیں گے۔ پہلا استدلال شرعی، دوسرا کشف باطنی، تیسرا رویائے صادقہ، چوتھا عبرت و اعتبار، پانچواں ایمان و مشاہدہ،

پہلا مقام علما کا ہے دوسرا عرفاء کا ہے، تیسرا اصلحا کا ہے، چوتھا عقلا کا ہے، اور پانچواں ہر کس وناکس کا ہے۔

پھر ان مقامات کی نوعیت یہ ہے کہ پہلا مقام اختیاری اور یقینی ہے، دوسرا اکتسابی ظنی ہے، تیسرا غیر اختیاری ظنی ہے۔ چوتھا اختیاری ظنی ہے، اور پانچواں کلیۃً غیر اختیاری مگر یقینی ہے جو محض موہبت من اللہ ہے۔ ان پانچوں طریقوں سے لوگوں نے برزخی مقامات تک علمی اور عرفانی رسائی حاصل کی ہے۔

طریق اول۔ استدلال شرعی کی روحانی تفصیل و تقسیم

(۱) اولین مرتبہ استدلال شرعی کا ہے کہ اللہ و رسولؐ برزخ کے بارے میں خود خبر دیں اور امت اس سے استدلال کر کے اس پر ایمان لائے۔

استدلال کا شخصیاتی درجہ

(الف) استدلال شرعی کے درجہ میں ایک درجہ شخصیاتی ہے کہ کسی شخص معین کا نام لے کر اللہ و رسولؐ اسے جنت مقام یا برزخ میں عالی مقام ظاہر فرمائیں تو ظاہر ہے کہ یہ معرفت

یقینی اور واجب الاعتقاد ہو گی۔

(عالم برزخ از علامہ طیب قاسمی دیوبندی ص ۱۲، ۱۳)

(زیر نظر بات میں متعلقہ موضوع خواب کے عالم برزخ کی نسبت کا.. اظہار ہے اور یہ استدلال کے شرعی باب میں آتا ہے اس لئے یہاں اختصار کے مدنظر استدلال شرعی کے مزید عنوانات کو صرف نظر کیا جا رہا ہے

اس لئے اگر شخصی خوابوں کو حجۃ کلیہ نہیں کہا جائے گا جو سب کے لئے قانون بن جائے تو حجۃ کاشفہ یا حجۃ موضحہ یا حجۃ مؤیدہ ضرور کہا جا سکے گا اسی لئے سلف سے لے کر خلف تک اہل علم خوابوں سے.. اسی قسم کی تائیدات اور تفاولات کا اثبات کرتے آئے ہیں، آخر سچے خواب کو چھیالیسواں حصہ نبوت کا فرمایا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق فرضیات سے نہیں واقعات سے ہے، نبوت کی ابتدا ہی سچے خوابوں سے ہوتی ہے کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہی چیز واقعہ بن کر سامنے.. آجاتی۔ اسی طرح نبوت کے بعد نبوت کے اس چھیالیسویں حصہ کے.. باقی رہنے کی بھی خبر دی گئی ہے:-

لم یبق من النبوۃ الا	نبوت میں سے کچھ بھی باقی نہیں بجز
المبشرات اوالرؤیا الصالحۃ؟	مبشرات اور سچے خوابوں کے (الحدیث)

(حوالہ عالم برزخ از علامہ محمد طیب قاسمی دیوبندی ص ۴۷، ۴۸، ۴۹)

تواتر و تعدد کی صورت میں سچے خواب کو حجیت شرعیہ بھی بتایا گیا ہے	اگر کسی ایک شخص یا ایک واقعہ کے بارے میں کئی سچے خواب جمع ہو جائیں تو ان میں تو حجیت کی شان کچھ بڑھ ہی جانی

چاہیے اور نبوت میں تو ایسے منامات کو شرعی حجۃ تک کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

لیلۃ القدر کو جب کہ متعدد صحابہؓ نے رمضان کے آخر عشرہ ہی میں خواب میں دیکھا تو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے عشرۂ اخیرہ میں ہونے کا حکم فرمایا اور اس کی علت یہ فرمائی کہ:

اِنّی اریٰ رُؤیاکم قد تواطئت علیٰ انہا فی العشر الاواخر۔	میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے کئی خواب اس پر متفق ہو گئے ہیں کہ لیلۃ القدر عشرۂ اخیرہ میں ہوتی ہے۔

جس سے واضح ہوتا ہے کہ خوابوں کی یکسانیت اور تواتر و تعدد کذب پر محمول نہیں کیا جا سکتا پس جیسے مؤمنین کا تواتر روایت، کو واجب القبول ...... اور مورث ظن غالب یا بعض حالات میں مورث یقین بنا دیتا ہے اور جس طرح علماء کا تواطؤ رائے (کہ وہ کسی چیز کے استحسان یا استہجان پر اجتماع کر لیں تو وہ) اسے واجب العمل بنا دیتا ہے کہ۔

مَا رَاٰہُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَناً فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ۔	جسے مؤمنین اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہی ہے۔

فرد واحد کا سچا خواب بھی حجت قرار دیا گیا ہے

اسی طرح اگر مؤمنین کے تواتر رویت منام کو بھی واجب القبول کہا جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اور اگر ایک حد تک شرعیات میں بھی بطور حجت اس کا اعتبار کر لیا گیا ہو تو اس میں کیا قباحت ہے بلکہ بعض اوقات قرن نبوت میں صرف ایک ہی سچے خواب کو شرعی حکم کی بناء قرار دیا گیا ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کی مشروعیت کے بارے میں عبد اللہ ابن زید ابن عبد ربہ کے خواب کو اذان کی مشروعیت کی بناء قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ اِنَّہَا لَرُؤیَا حَقٌّ قم یَا بِلَالُ فَاذِّن (یہ خواب عبد اللہ ابن عبد ربہ کا سچا خواب ہے اس لئے اے بلال اٹھ اور اذان دے

نبیؐ کی توثیق خواب کے فی نفسہٖ حجت ہونے کی دلیل ہے

یہ الگ بات ہے کہ وہ دورِ نبوت تھا اور آپ کی توثیق سے خواب موجب ثبوتِ مسئلہ بن گیا لیکن توثیق تو بہرحال خواب ہی کی گئی جس سے اتنا واضح ہو گیا کہ مؤمن کا سچا خواب کسی نہ کسی درجہ میں حجیّت کی شانِ ضرور لئے ہوئے ہے ساقط الاعتبار نہیں۔

اب اگر آج بھی کوئی شخص یا چند اشخاص نعیمِ قبر کے بارہ میں کوئی قدر مشترک خواب میں دیکھتے ہیں تو اسے ظن غالب کے طور پر تسلیم کر کے بطور حجت کے تسلیم کیا جائے گا کہ فلاں شخص انشاء اللہ ضرور نعمتوں میں ہے اور مقبول ہے جیسا کہ اس قسم کے خوابوں کے متعدد واقعات عرض کئے گئے اور ان سے برزخی نعمتوں یا مصیبتوں کے جو وقائع خوابوں کے سامنے آئے ان کی تکذیب نہیں کی جا سکے گی۔

(حوالہ عالم برزخ۔ از مولانا محمد طیب قاسمی دیوبندیؒ ص ۵۱، ۵۲، ۵۳)

تمہید کا مفہوم و منشا اس حقیقت سے آگاہ کرنا تھا کہ

عالم برزخ سے ہدایت، بشارت، مقام قرب کا انکشاف، مناہی ملاقات کے واقعات، ظن غالب کے باب سے بطور حجت کے تسلیم کئے جاتے ہیں اس خصوص میں چند واقعات، جو اہل اللہ سے متعلق ہیں۔ مزید واقفیت و آگاہی کا وسیلہ ہیں۔

جویریہ بنت آسماء کو خواب میں برزخ سے ہدایت

سنید ابن داؤد کہتے ہیں کہ جویریہ ابن اسماء نے بیان کیا کہ شدید گرمی کے موسم میں کوفہ کے ایک نوجوان عابد کی وفات ہوئی تو میں نے ارادہ کیا کہ بعد ظہر وقت ٹھنڈا ہو جانے پر دفن کریں گے، اور میں سو گیا تو خواب میں دیکھا کہ میں قبرستان میں ہوں اور جواہرات کا ایک حسین و جمیل قبہ اور محل ہے جو چمک رہا ہے اور ٹکٹکی باندھے حیرت سے اس کے حسن اور صناعی،

کو دیکھ رہا ہوں کہ اچانک وہ کھلا اور اس میں سے ایک ایسی حسین و جمیل عورت نکلی کہ میں نے کبھی ایسا حسن و جمال نہیں دیکھا تھا وہ میری طرف بڑھی اور کہا کہ تمہیں خدا کی قسم کہ اس نوجوان کو ظہر تک ہم سے جدا نہ رکھو اور ہرگز نہ روکو، تو میں گھبرایا ہوا اٹھا اور اسی وقت کفن دفن کا سامان کیا اور اسی جگہ کی قبر میں دفن کیا، جہاں وہ قبہ دار محل نظر پڑا تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ کا خواب میں اپنے مقام قرب کا اظہار

احمد بن محمد لبدی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا حضرت حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ فرمایا کہ میری مغفرت فرمادی اور یہ فرمایا کہ اے احمد بن حنبل تیرے چہرے کو ستر ستر کوڑوں کی مار دی گئی تھی؟ عرض کیا ہاں یا اللہ مار دی گئی تھی؛
حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے احمد یہ میرا چہرہ تیرے لئے مباح ہے جب چاہے تو دیکھ سکتا ہے،،

بشر ابن حارثؒ نے خواب میں اپنے ساتھ حق تعالیٰ کی مغفرت و تکریم کی اطلاع دی

ابو جعفرؒ کہتے ہیں کہ میں نے بشر ابن حارث مشہور امام صوفیاء کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ آپ کے ساتھ حق تعالیٰ نے کیا معاملہ فرمایا، فرمایا لطف و کرم کا برتاؤ فرمایا اور نصف جنت میرے لئے مباح کر دی کہ اس میں جہاں چاہو گھوموں سیر کروں اور متمتع ہوں اور جو میرے جنازہ میں شریک ہوئے ان کی مغفرت کا وعدہ فرمایا۔
میں نے عرض کیا کہ ابو نصر تمار کا کیا ہوا؟ فرمایا کہ وہ اپنے صبر اور فقر کی وجہ سے لوگوں سے بہت اونچے اٹھائے گئے ہیں۔

بصرہ کی ایک عابدہ زاہدہ کا خواب

حمّاد ہشام ابن حسان سے روایت کرتے ہیں کہ ام عبداللہ نے فرمایا جو بصرہ کی عابدہ زاہدہ

عورتوں میں سے تھیں کہ میں خواب میں ایک عظیم الشان حسین وجمیل محل میں داخل ہوئی اس کے پائیں باغ میں پہونچی میں اس کی رونق و بہار اور حسن وجمال کو بیان نہیں کر سکتی، وسط باغ میں ایک سونے کا مرصع تخت بچھا ہوا ہے جس کے اردگرد آفتاب و مہتاب جیسے چہروں کے خدّام ہاتھوں میں پاکیزہ جام اور ظروف لئے کھڑے ہیں اور تخت پر ایک شخص تکیہ لگائے بیٹھے ہیں، کہا گیا کہ یہ مروان محلمی ہیں جو ابھی ابھی آئے اور اچھل کر اس تخت پر متمکن ہو گئے، میں بیدار ہوئی تو دیکھا کہ مروان محلمیؒ کا جنازہ قبرستان جارہا ہے۔

عبداللہ ابن مبارکؒ پر سفیان ثوریؒ کے برزخی مقام کا خواب میں انکشاف

عبداللہ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوریؒ کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور کہا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ فرمایا کہ الحمدللہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ سے مل گیا ہوں اور انہی کے پاس ہوں۔

صخرا ابن راشد کی اہل برزخ سے منامی ملاقات!

صخرا ابن راشدؒ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ ابن مبارکؒ کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور کہا کہ کیا آپ انتقال نہیں فرما چکے ہیں؟ فرمایا ہاں، میں نے عرض کیا اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا اتنی بڑی مغفرت فرمائی جس نے سارے ذنوب پر احاطہ کر لیا، میں نے کہا سفیان ثوریؒ کا کیا ہوا، فرمایا اوہ اوہ وہ تو انبیاء وصدیقین اور شہداء وصالحین کی معیت میں ہیں۔

اہل برزخ کی جانب سے بعض امور کی بذریعہ خواب تصدیق!

پھر یہی نہیں کہ خواب کے ذریعہ برزخی افراد کے احوال ومقامات ہی دنیا والوں کو معلوم ہو جاتے ہیں بلکہ دنیا

والوں کے جو احوال و اقوال برزخ والوں کو پہونچتے ہیں اس کی تصدیق بھی خوابوں کے ذریعہ ہو جاتی ہے کہ وہ احوال و اقوال ان تک پہونچ چکے ہیں۔

شبیب بن شیبہ کہتے ہیں کہ میری والدہ نے مرتے وقت مجھے وصیت کی تھی کہ بیٹا جب تم مجھے دفن کر چکو تو میری قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہنا کہ اے ام شبیب کہو لا الٰہ الا اللہ چنانچہ اس وصیت کے مطابق والدہ کی قبر جب برابر ہو گئی تو میں نے قبر کے پاس کھڑے ہو کر وہی جملہ کہا کہ اے ام شبیب کہو لا الٰہ الا اللہ۔ جب میں قبرستان سے لوٹا تو رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میری والدہ ام شبیب کہہ رہی ہیں کہ بیٹا میں ہلاک ہو جانے کی قریب آ چکی تھی، اگر تیرا لا الٰہ الا اللہ کہنا اس کی روک تھام نہ کرتا بلا شبہ تو نے میری وصیت یاد رکھی اور عمل کر دکھایا۔

ابن ابی الدنیا نے ذکر کیا ہے کہ ایوب ابن عیینہ کی بیوی، تماضر بنت سہل کہتی ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ابن عیینہ (اپنے دیور) کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی ایوب ابن عیینہ کو جزائے خیر دے کہ وہ بکثرت میری زیارت کو آتے رہتے ہیں اور آج بھی آئے تھے تو ایوب ابن عیینہ نے بیوی سے فرمایا کہ واقعی میں بکثرت بھائی کی قبر پہ جاتا ہوں اور آج بھی وہیں تھا۔

(بحوالہ عالم برزخ، از مولانا طیب قاسمی دیوبندی ص ۳۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹)

گشتہ گاں خنجر تسلیم کے اس باب میں ثانی صوفی سرمد، احمد حسین خاں مجد کا وہ خواب، جو ایک عاشق رسول نے دوسرے عاشق رسول... محمد بہادر خاں شہید کو رسالت مآب کے حضور میں دیکھا۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں آپ کی ایک جانب حضرت صدیق اکبرؓ اور دوسرے جانب حضرت عمر فاروقؓ

بیٹھے ہیں۔ ایسے میں ایک جنازہ، حضور کی خدمت میں پیش ہوا صحابہ نے عرض کیا، حضور یہ کس کا جنازہ ہے

ارشاد فرمایا دو جہاں کے سردار صلعم نے یہ میرے حبیب، محمد بہادر خاں کا ہے۔ کچھ تعریف کے الفاظ نطق نبوی سے گوہر بار تھے کہ حضرت امجد کی آنکھ کھل گئی سچ ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی ست!

عالم برزخ کے عنوان میں شہدا کے خاص مقام و مرتبہ کی قرآن نے بشارت دی ہے۔

كفى ببارقة السيوف على رأسه فتنة۔

(شہید کے، سر پر چہار طرف (میدان جنگ میں) تلواروں کی چمک کا فتنہ اور فتنہ برزخ کا بدل ہے جو برزخ میں بچاؤ کے لئے کافی ہے اور انکے لئے اس کے بعد برزخ میں کوئی ڈر اور فتنہ نہیں۔

شہدا کے مقام کا قرآن کریم نے تو اجمالاً ذکر فرمایا کہ وہ برزخ میں زندہ ہیں، رزق پاتے ہیں خوش بخوش ہیں بشارتیں اور خوشخبریاں پاتے رہتے ہیں، نہ ان پر غم ہے نہ خوف اور حدیث نبوی نے اسی مقام کی جزوی تفصیلات بھی بیان فرمائیں کہ انکے بسیرے کی جگہ سونے اور زبرجد کے قندیل ہونگے جو عرش میں آویزاں ہیں، وہ سبز پرندوں کے خول میں اڑتے اور جنتوں میں سیر کرتے پھریں گے اور وہاں کے باغوں اور نہروں سے سیراب ہو کر سرسبز و شاداب ہوتے رہیں گے انہیں نشاط میں لانے کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ بھی جاری رہے گا کہ ماتزیدون؟ اور کیا چاہتے ہو؟

یَا عَلِیّ مَا تَشَاؤُنَ مجھ سے مانگو مجھے تمہاری خواہش کا پورا کرنا ہے۔
شہدا کو بدن بھی اس عالم کا دیا جائے گا جو پرندوں کی شکل میں ہوگا۔

(حوالہ عالم برزخ از مولانا طیب قاسمی دیوبندی ص ۱۸، ۱۹)

شہید پر وہ موت طاری نہیں ہوتی جن کو عرف عام میں موت کہا جاتا ہے تو اللہ کے فضل اور شہدا کی اس معراجی منزل میں راہ حق کا نذرانہ، قبول ہو جانا، افضال الٰہی کی کیسی نرالی شان ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ اس حقیقت کو بے نقاب فرماتے ہیں کہ جس کو تم موت کہتے اور سمجھتے ہو، وہ حقیقت میں موت نہیں ہے۔ ہماری راہ میں جان دے کر تم مطلق عالم ممات،، میں نہ چلے جاؤ گے بلکہ پھر بھی زندہ ہی رہو گے اور ہمارے رزق کے مزے اس حال میں بھی تم کو نصیب ہونگے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْ	اور تم ان لوگوں کو جو خدا کی راہ
قُتِلُوا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ	میں مارے جاتے ہیں مرا ہوا نہ سمجھ۔
بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ۔	وہ تو زندہ ہیں۔ ان کے رب کے پاس
(۳: ۱۷)	انہیں رزق دیا جاتا ہے۔
وَلَا تَقُوْلُوا لِمَنْ یُقْتَلُ	اور تم ان لوگوں کو مردہ نہ کہو جو اللہ
فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ	کی راہ میں مارے جاتے ہیں، وہ تو
وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۞	زندہ ہیں مگر تم جانتے نہیں ہو۔

غور سے دیکھئے یہ نہیں کہا کہ جو لوگ فی سبیل اللہ مارے جاتے ہیں ان پر وہ موت طاری نہیں ہوتی جس کو عرف عام میں موت کہا جاتا ہے بلکہ یہ فرمایا کہ ان کی موت کو حقیقی موت نہ سمجھو۔

برزخ از مولانا ابو اعلیٰ مودودی، ص ۳۹

شہدا، یعنی مقتولین" فی سبیل اللہ" جن کی زندگی کی قرآن نے تصریح فرمادی

ہے وہ برزخ یعنی آڑ میں نہیں بلکہ "عندربہم" اپنے رب کی حضوری میں ہیں جہاں ان کو نئی زندگی مل گئی ہے اور وہ روزی پاتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ (۱۶۹/۳)	اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ ہرگز نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کی حضوری میں روزی پاتے ہیں۔

(حوالہ عالم برزخ از اسلم جیراج پوری، ۷۴)

بالآخر مقام عشق حد کمال بندگی کی سرحدوں سے گذر کر موجب قرب تمام عین ذات ہوا۔ اور محمد بہادر خاں شہید نے الحمد اللہ (عندربہم) اپنے رب کی حضوری میں جگہ پائی۔

یَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

(اے عظمت وجلال اور احسان واکرام کے مالک)

۴۸

یہ کہہ کر ان کو اپنے بازو صوفے پر بیٹھا لیا۔

(مولوی سید جلیل اللہ حسینی مضمون کیا پوچھتے ہو کسے کھو دیا) ________

۹

دنگ تھے سب اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ کمال
وہ تھی باطن کی تجلی وہ تھا چہرے کا جمال

کسے دوگے سزا آخر کسے ٹھہراؤگے قاتل؟

۲۵ جون ۱۹۴۴ء کی شب سے آج تک قائدِ ملت پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ مضامین لکھے گئے، منظوم خراجِ عقیدت پیش کئے گئے مگر ان کی موت پر مستقل عنوان کے تحت پہلی بار "بہادر یار جنگ کا سانحۂ رحلت"، کے زیرِ عنوان قائدِ ملت کے قریبی رفیقِ کار مولوی محمد احمد خاں صاحب نے پہلی بار ۱۶ صفحات پر مشتمل ایک معلوماتی مضمون لکھا جو پاکستان کے مشہور ماہنامہ فاران ۱۹۸۴ء کے شمارے میں (صفحہ ۱۳ سے ۲۸ تک) شائع ہوا۔ جو بیحد معلوماتی تجزیہ ہے۔

ہم ذیل میں اس مضمون کے اقتباسات کے ساتھ ساتھ ضروری حواشی کو شریک کر رہے ہیں۔ یہ حاشیہ کہیں وضاحت ہے تو کہیں کسی کمی کا ازالہ یا متعلقہ مسئلہ پر مزید روشنی، کہیں تجزیہ سے اختلاف کی صورت میں بھی اظہارِ خیال۔ ہمارے اپنے تجزیے کی بنیاد پر ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے قائدِ ملت کی موت کے بارے میں اپنی اس قطعی رائے کا اظہار کر دیا کہ بہادر یار جنگ کی موت زہر خورانی کا نتیجہ تھی، جو صد فیصد درست ہے۔

"اس سانحۂ رحلت سے متعلق دو نقطۂ نظر قابلِ ذکر ہیں ایک یہ کہ وفات کا یہ حادثہ گو اچانک پیش آیا لیکن تھا فطری۔ بالفاظِ دیگر بہادر یار جنگ کی موت طبعی تھی، دوسرا نقطۂ نظریہ

ہے کہ یہ حادثہ غیر معمولی تھا اور وفات زہر خورانی کا نتیجہ تھی، میں آج بھی اتنے طویل عرصہ کے بعد جب اس واقعے پر اور اس کے سارے متعلقات اور جزئیات پر غور کرتا ہوں تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ بہادر یار جنگ کی موت زہر خورانی سے واقع ہوئی اور قطعاً طبعی نہ تھی۔"

ان کی رائے میں انہوں نے پانچ وجوہات کو وجہ شبہ قرار دیا ہے۔

"میری رائے میں ان کے وجوہ یہ ہیں:

۱:- ان کی عام صحت بہت اچھی تھی اور مرنے سے ایک لمحہ پہلے تک وہ نہایت ہشاش بشاش تھے۔

۲:- انہیں کبھی دل کا عارضہ لاحق نہیں ہوا اور نہ کبھی سانس رکنے کی شکایت پیدا ہوئی۔

۳:- ان کی موت اچانک، بہت ہی اچانک اور غیر معمولی مشتبہ حالات میں واقع ہوئی۔

۴:- انتقال کے بعد میں نے اور سینکڑوں آدمیوں نے بچشم خود دیکھا کہ ان کے جسم پر نیلگوں نشانات ہیں۔"

"خدا گواہ ہے کہ ہم سب ان کی عام صحت سے مطمئن تھے۔ کسی کو اس کا واہمہ تک نہ تھا کہ ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہونے سے پہلے ہی چھلک جائے گا اور وہ ایک سازشی مرگ ناگہانی کا شکار ہو کر قبول بارگاہ ربّ العزت ہوں گے اور رفیق اعلیٰ سے جا ملیں گے اور دکن کا بہار شباب اس طرح لٹ جائے گا۔ اس کو کم مایہ قوم کی کم نصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا راز اللہ ہی جانتا ہے۔ بہر کیف بلانے والے نے منصب شہادت کے ساتھ بلا لیا۔"

(حوالہ متاعِ گراں مایہ از محمد اکبر حسین رفیق قائد ملت ص ۱۷ ۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، کراچی)

"میں حیدر آباد گیا ۔ میری دو تین دن نواب بہادر یار جنگ سے سیاست پر گفتگو ہوتی رہی اور ان سے یہ طے ہوا کہ وہ بھی میرے ساتھ بمبئی چلیں گے ۔ نواب صاحب اس زمانہ میں اچھے خاصے تندرست تھے اور خدا نخواستہ ان کو کوئی مرض لاحق نہ تھا ۔ روانگی کے دن میں ریلوے اسٹیشن وقت پر پہنچ گیا اور نواب بہادر یار جنگ کا انتظار کرنے لگا وقت تنگ ہوتا گیا اور وہ نہ آئے یہاں تک کہ گاڑی چھوٹ گئی ۔ میں سمجھا شاید دیر سے گھر سے روانہ ہوئے اس لئے وقت سے نہ پہنچ سکے، بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ان کی موت کے متعلق مختلف وجوہات مشہور ہیں واللہ اعلم ۔ بہر نوع قضا نے ہم سے ایک بلبلِ ہزار داستاں چھین لیا ۔

(حوالہ : شاہراہ پاکستان از چودھری خلیق الزماں ص ۹۲۳)

نظام والی ریاست نے دیدار کے وقت جو تاثرات بیان کئے وہ بھی قابل غور ہیں جو ارشادات ہمایونی کے نام سے اخبارات میں شائع ہوئے جس میں قائد ملت کی صحت کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ...... کچھ عرصے سے وہ صحت مند نہیں تھے ۔

" تین برس پہلے بھی ان کی صحت خراب ہو گئی تھی ۔ میں نے ان کو زیادہ محنت نہ کرنے کی نصیحت کی تھی ۔ انہیں اس وقت حلق کا مرض تھا "

لیکن دوسری ہی سانس میں "میت کا چہرہ دیکھ کر فرمایا

کہ بیماری کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ اگر یہ چھ مہینہ بھی بیمار پڑتے تو گھل نہیں سکتے"۔

۵۔ "ایک قیاس آرائی یہ ہے کہ لیاقت اللہ قریشی نے یہ مذموم حرکت بیرون حیدرآباد کی ایک ممتاز شخصیت (لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان (جن کو راولپنڈی کے جلسہ عام میں کسی نے گولی ماردی تھی) کے اشارہ کی بنا پر کی تھی" ص ۱۵۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں، بہادر یار جنگ اور لیاقت علی خاں کے درمیان شدید اختلافات تھے۔ وہ اگرچہ مسلم لیگ کے معتمد تھے لیکن جتنا اعتماد قائد اعظم کو بہادر یار جنگ پر تھا اتنا لیاقت علی خاں پر نہیں تھا۔ لیاقت علی خاں اور ان کے گروپ کے لوگوں ہی کی ریشہ دوانیوں کے جواب میں قائد ملت نے (کراچی والی) آخری تقریر فرمائی تھی جو ان کے غیض و غضب کی مکمل آئینہ دار ہے۔ دراصل یہ تقریر اسی ٹولہ کے خلاف تھی۔

نواب بہادر "میں مسلمانوں کے لئے وہی کام کر رہا ہوں جو ہنڈ بزگ نے کیا تھا۔ اس نے ہٹلر کے لئے میدان ہموار کیا تھا، اور جرمن قوم کو بامِ عروج پر پہنچانا ہٹلر کی قسمت میں تھا۔ (یہ ہٹلر کے عروج کا زمانہ تھا) میں بھی افق میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے بعد ایک شخص پاکستان کو بامِ عروج تک پہنچائے گا۔

نواب بہادر جواباً عرض کرتے ہیں :-

قائداعظم تم سلامت رہو ہزار برس

اور پھر قہقہوں کے ساتھ یہ گفتگو ختم ہوجاتی ہے۔ نہ معلوم قائد اعظم کے ذہن میں وہ کون شخص تھا جو ان کے بعد پاکستان کو بامِ عروج تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ افتخار، وہ

نواب بہادر کو فرمارہے تھے ۔ (حوالہ: بہادر خاں کی یاد میں' از حکیم الدین انصاری ص ۲۸ ، بہادر یار جنگ اہلِ دانش کی نظر میں، مرتبہ نذیرالدین احمد ناشر: بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدر آباد)

یہی ڈر اور یہی احساس تھا جس کی بنا پر لیاقت علی خاں، بہادر یار جنگ کے سامنے، اپنے مستقبل کو تاریک محسوس کرنے لگے تھے۔

ایک اور اہم بات کہ سارے مشاہیر نے نواب صاحب کی شہادت پر تعزیتی پیامات جاری کئے۔ سوائے لیاقت علی خاں .... معتمد عمومی کل ہند مسلم لیگ کے۔ کیا یہ کوئی غیر اہم بات ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے؟

جنرل ضیاء الحق مرحوم کے وزیر قانون سیّد شریف الدّین پیرزادہ نے (جو جناح صاحب کے متعلق کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں)۔

پیرزادہ نے قائداعظم کی موت کے تعلق سے لکھا ہے کہ جناح صاحب کی موت فطری نہیں تھی جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"بوسیدہ ایمبولنس گاڑی

جناح صاحب کی موت فطری نہیں تھی بلکہ انہیں قتل کیا گیا تھا جناح کو جو زیارت نامی مقام پر زیر علاج تھے، ایک سازش کے تحت کراچی لایا گیا اور انہیں ایرپورٹ سے گورنر جنرل ہاؤس تک جانے کے لئے ایک بوسیدہ ایمبولنس گاڑی فراہم کی گئی، ایرپورٹ پر انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے کوئی موجود نہیں تھا۔ یہ ایمبولنس گاڑی ایرپورٹ سے جاتے ہوئے راستے میں خراب ہوگئی۔ محترمہ

فاطمہ جناح اس وقت اپنے بھائی کے ساتھ زیارت سے آئی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ "ایر پورٹ سے کوئی چار میل کے فاصلہ پر موٹر گاڑی خراب ہوگئی اور مجھے بتایا گیا کہ پٹرول ختم ہوگیا ہے، جیسے ہی میں ایمبولنس میں واپس آئی تو جناح صاحب کا ہاتھ ہلا، گویا پوچھ رہے ہوں کہ کیا ہوا۔ جب میں نے تفصیل بتائی تو انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس وقت ہوائیں بھی نہیں چل رہی تھیں اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا دم گھٹ رہا ہے تو ان کو ایمبولنس سے باہر لایا گیا اور ایک اسٹریچر پر لٹا کر اسٹریچر فٹ پاتھ پر رکھ دیا گیا۔" جناح صاحب تپتی ہوئی دھوپ میں فٹ پاتھ پر کئی گھنٹے پڑے رہے اور اسی رات ان کی موت واقع ہوئی۔

بڈھے کا دماغ خراب

پیرزادہ کا کہنا ہے کہ جناح صاحب کو اس سازش اور اس میں ملوث لوگوں کے متعلق پوری تفصیلات معلوم تھیں لیکن وہ ان سے چھٹکارا حاصل کر نہیں سکتے تھے۔

لیکن پاکستانی اخبارات کا کہنا ہے کہ زیارت میں جو بلوچستان میں کوئیٹہ کے قریب واقع ہے۔ جناح صاحب کا خاطر خواہ علاج نہیں ہو رہا تھا۔ جب لیاقت علی خاں ان کی مزاج پرسی کے لئے گئے تو جناح صاحب نے انہیں ڈانٹ پلائی۔ باہر نکلتے ہوئے لیاقت علی خاں کو یہ کہتے سنا گیا کہ بڈھے کا دماغ خراب ہوگیا ہے"۔

(حوالہ: مضمون نگار سید ضیاء اللہ شائع شدہ "اخبار بلٹز"
ہفتہ واری بمبئی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

اس واقعہ سے لیاقت علی خاں کے ظرف اور مزاج کا جہاں

بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے، وہیں قائدِ اعظم کا ان پر عدم اعتماد کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ویسے تو قائدِ اعظم ان سے اس وقت سے متنفر تھے جبکہ بھولا بھائی دیسائی کے ساتھ لیاقت علی خاں نے جو معاہدہ جناح صاحب کے علم و اطلاع کے بغیر کر لیا تھا، اس کی وجہ سے جناح صاحب نے اس کے بعد کبھی لیاقت علی خاں پر بھروسہ نہیں کیا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اس بات کی توثیق کی ہے۔

(حوالہ مضمون نگار سید ضیاء اللہ شائع شدہ در اخبار بلٹز ہفتہ وار بمبئی - ۱۳ار اکتوبر ۱۹۸۴ء -)

چوں کہ لیاقت اللہ قریشی صاحب، لیاقت علی خاں کے خاص آدمیوں میں سے تھے اس لئے اس خصوص میں قائدِ ملت سے ان کے تعلقات کی کشیدگی کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہو گا۔

(۳) " لیاقت اللہ قریشی ریاست گوالیار کے جج تھے، بعض اسباب کی بنا پر وہ علیٰحدہ کر دیئے گئے تھے اور اس کے بعد غالباً فروری ۱۹۴۴ء میں مستقل قیام کی غرض سے حیدرآباد دکن آگئے اور وکالت شروع کی۔"

" حیدرآباد آنے سے قبل انہوں نے قائدِ مرحوم سے رابطہ قائم کیا جس کے جواب میں قائدِ مرحوم نے انہیں ہر طرح کی امداد و اعانت کا اطمینان دلایا (ملاحظہ ہو مکتوب ۱۸/۱۴ مکاتیب بہادر یار جنگ) ان کے حیدرآباد آجانے کے بعد بھی قائدِ مرحوم نے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ رہنے سہنے کا بندوبست کرایا، مقدمات دلائے عدالت کے عہدہ داروں سے ملایا اور ہاشم علی خاں جج ہائی کورٹ کی دعوت میں، انہیں خود اپنی موٹر میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔"

صفحہ ۱۵، ۱۶۔

اس خصوص میں بعض باتیں وضاحت طلب ہیں، لیاقت اللہ قریشی صاحب کا نام، متذکرہ مسئلہ سے متعلق جہاں بھی آیا، مکتوب بنام موصوف ۱۸ مئی کے ذکر ہی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ مذکور خط درج ذیل ہے:۔

۱۵ر جون ۱۹۴۳ء

مولوی لیاقت اللہ صاحب قریشی

جج ہائیکورٹ لشکر گوالیار

مکرمی! آپ کا مکتوب ۱۸ر مئی مسلسل سفر کی وجہ سے میری نظر سے آج گذرا۔ آپ نے اس مکتوب میں ہجرت کا عزم مصمم ظاہر فرمایا ہے اس لئے اب میں انصار بننے کے لئے تیار ہوں اور میرے گھر کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہیں۔ یقیناً آپ کی نگاہ سے مہاجرین کی مشکلات پوشیدہ نہ ہوں گی۔

انشاء اللہ میری طرف سے بھی انصار کی مہمان نوازی اور دستگیری کا پورا مظاہرہ ہوگا۔"

ے کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

نواب صاحب کے متذکرہ خط سے' ان کے اپنے مخاطب سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ "آپ نے اس مکتوب میں ہجرت کا مصمم ارادہ ظاہر فرمایا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی ان کے خطوط نواب صاحب کے موسومہ' جواب پا چکے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نواب صاحب سے ان کی شناسائی یا ملاقات کہاں ہوئی تھی۔

دوسری بات جو قابلِ تذکرہ ہے وہ یہ کہ لیاقت اللہ قریشی صاحب کیلئے حیدر آباد میں سکونت کوئی مسئلہ نہ تھا، کیوں کہ رشید

صدیق حسین ایڈوکیٹ ساکن کوچہ فصیح جنگ، ان کے داماد تھے، اور لیاقت اللہ قریشی صاحب حیدرآباد آنے کے بعد اپنے داماد ہی کے مکان میں سکونت پذیر تھے۔

مکتوب نمبر ۴۱۸ کا سارا تاثر مکتوب نمبر ۵۰۹ کے مطالعہ سے کافور ہوجاتا ہے۔ یہ خط منظر عالم صاحب علی گڑھ کا موسومہ ہے جو ۱۱ر فروری ۱۹۴۴ء کو نواب صاحب نے انہیں لکھا اور اسی تاریخ کو لیاقت اللہ قریشی نواب صاحب سے ملنے آئے تھے۔ اس خط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نواب صاحب ان کے بارے میں مشکوک تھے، نواب صاحب کا یہ جملہ "میں نہیں جانتا کہ ان کے مقاصد کیا ہیں، میں انشاء اللہ گفتگو میں محتاط رہوں گا، لیکن ان کی نسبت آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں" سے نواب صاحب کے ان کے بارے میں شکوک کا پتہ چلتا ہے، منظور عالم صاحب کے خط میں لیاقت اللہ قریشی کے ذکر کا مکمل متن یہ ہے:-

"گوالیار کے وہ قریشی صاحب جو — جج تھے۔ آجکل حیدرآباد میں ہیں، آج میرے یہاں آئے تھے مگر اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں نے ان کو پرسوں آنے کیلئے کہا ہے، میں نہیں جانتا کہ ان کے مقاصد کیا ہیں میں انشاءاللہ گفتگو میں محتاط رہوں گا، لیکن ان کی نسبت آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ فروری ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد آئے اور جون ۱۹۴۴ء میں نواب صاحب کی شہادت عمل میں آئی، نواب صاحب نے ان کی کسی قسم کی کوئی معاونت نہیں فرمائی۔ نواب صاحب کی شہادت کے بعد یہ اچانک حیدرآباد سے غائب ہو گئے کیوں کہ سازشیوں کی فہرست میں ان کا نام بھی شریک سمجھا جاتا رہا۔

مولوی محمد احمد خاں صاحب نے جناب غلام محمد مؤلف حیات بہادر یار جنگ کی کتاب کے حوالے سے جو روایت بیان کی وہ یہ ہے کہ

" مشہور عام روایت ہے کہ انہوں نے (لیاقت اللہ قریشی) دورانِ موٹر پر ایک پان کا بیڑا نواب صاحب کو پیش کیا اور نواب صاحب نے کھالیا۔ کھانے میں ذرا دیر تھی وہ پان جو موٹر پر کھلا دیا گیا تھا اس میں نہ جانے کیا بلا تھی کہ اس کے اثر سے نواب صاحب کے معدہ میں بھوک کی ناقابل ضبط کھرچن پیدا ہو کر خلاف عادت انہوں نے ہاشم علی خاں سے کہا بھئی آخر کھانا کب لگے گا جلدی کرو "

(حوالہ: ص ۱۵۲، ۱۵۴، حیات بہادر یار جنگ از جناب غلام محمد صاحب کراچی)

نواب صاحب جب چائے پیتے یا کھانا کھاتے تو پان کھاتے اور جب وہ گھر میں ہوتے یا کسی دعوت میں تشریف لے جاتے تو بیگم صاحبہ کے ہاتھ کا بنا ہوا پان کھاتے یا ان کی شیروانی کی اوپر کی جیب میں یہ پان ہوتا اور یہ پان جیب کا پان کے عنوان سے جانا جاتا۔ جس دن دعوت میں تشریف لے گئے اس دن بھی جیب کا پان نواب صاحب کے ساتھ تھا۔

" باہر ہی سے انہوں نے پان منگوائے۔ مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ میں ان کے لئے آخری پان تیار کر رہی ہوں۔ مجھے ہمیشہ اس پر ناز تھا کہ وہ میرے سوا کسی اور کے لگائے ہوئے پان نہیں کھاتے "

(حوالہ: کتاب سانحۂ ملت مرتبہ مجلس حیات قومی مضمون بعنوان سہاگ لٹنے کی کہانی بیگم بہادر خاں کی زبانی ۲۵ رجون ۴۴ء ص ۵)

مصنف کو "مشہور عام روایت" کا عنوان خود عدم ثبوت کی بنا پر قائم کرنا پڑا۔ دوسری بات ہاشم علی خاں صاحب سے

"بھئی آخر کھانا کب لگے گا جلدی کرو" کا جملہ مدعوین میں سے کسی نے نہیں سنا۔ مصنف کو کس نے خبر دی؟

" ہاشم علی خاں اہتمام میں لگ گئے "

حالانکہ ہاشم علی خاں اس وقت مدعوین کے درمیان تھے، ادھر کسی نے حقہ نواب صاحب کے آگے رکھا۔ نواب صاحب ایک کش بھی پورا نہ لے سکے تھے کہ زبردست جھٹکا لگا اور اس کے بعد ایک تشنجی دورہ پڑا کہ وہ منھ کے بل گر پڑے، ابھی لوگ سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ مردِ حق دیرکہن کے افسوں کو توڑ کر ربّی الاعلیٰ سے جا ملا۔

(حوالہ: ۱۵۳، ۱۵۴ حیات بہادر یار جنگ از جناب غلام محمد)

مصنف کو یہ تک خبر نہیں کہ حقہ کس نے رکھا اور حقہ جس وقت نواب صاحب کے سامنے آیا اس وقت نواب صاحب نے کیا فرمایا (آخری باب میں اس کی تفصیل کے مطالعہ کا موقعہ ملے گا)

نواب صاحب ایک ہی کش میں جان بحق ہو گئے اور کرسی پر گردن ڈال دی۔ کوئی تشنجی دورہ نہیں پڑا اور نہ ہی وہ منھ کے بل گر پڑے۔ ایک اور غلط بات کہ

" فوری طور پر ڈاکٹروں نے بھی زہر رسانی کی تصدیق کی اور خود نظام دکن اعلیحضرت میر عثمان علی خاں مرحوم نے بھی (جو باضابطہ طب پڑھے ہوئے بھی تھے) نعش دیکھ کر بے ساختہ یہی ارشاد فرمایا "جس کسی نے کیا بہت بُرا کیا" ایک مجمع نے شاہِ دکن کے اس حسرت آمیز جملہ کو سنا "

نظام نے نعش دیکھنے کے بعد جو کچھ کہا من وعن دوسرے دن کے اخبارات میں شائع ہوا۔ ایک ایک لمحے کی بات چھپی مگر متذکرہ نظام سے منسوب جملہ کسی اخبار میں شائع ہوا اور نہ ہی کسی مضمون نگار

یا مصنف کی تصنیف میں نظر سے گذرا۔

جناب غلام محمد صاحب نے صفحہ ۱۵۳ پر نواب صاحب کے ہاشم علی خاں صاحب کے گھر جانے کا ذکر بعنوان "شہادت گاہ کی طرف جاتے ہیں" مقرر کیا۔ نواب صاحب کی موت کا عنوان "موت یا شہادت حسنیٰ" قرار پایا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"عوام کا گمان اس سلسلہ میں مختلف رہا۔ کسی نے نواب صاحب کی زہر رسانی اور موت میں حکومت وقت کا ہاتھ سمجھا۔ کسی کو گمان ایک خاص فرقہ کی کارستانی کا رہا، کسی کا قیاس تھا کہ برطانوی ریزیڈنسی پر اس کی ذمہ داری عائد ہے، پاکستان آکر راقم الحروف نے بعض سنجیدہ لوگوں کا یہ قیاس بھی سنا کہ اس سانحہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم کے ایک خاص فرد کا ہاتھ تھا۔ اور یہ ہاتھ لیاقت اللہ قریشی کے ہاتھ کے ذریعے یہ کام کر گیا۔ واللہ اعلم۔

اس معاملہ میں اپنا مسلک مبہم کو مبہم ہی رہنے دینے کا ہے اور انکشافِ حقیقت کے لئے حشر کے انتظار ہی کا ہے۔"

(حوالہ: حیات بہادر یار جنگ از جناب غلام محمد ۱۵۹، ۱۶۰)

پورا مضمون شہادت سے متعلق یقین کامل کے اظہار پر مشتمل ہے لیکن "عوام کا گمان" اور انکشاف حقیقت کو حشر کے انتظار میں رکھ کر اپنا دامن جھاڑ دیا۔

نوٹ:- یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور کون سی حقیقت ہے جو تلخ نہیں ہوتی "حیات بہادر یار جنگ" کے مصنف غلام محمد صاحب نواب صاحب سے کبھی بھی قریب نہیں رہے، جلسوں میں تقریر سنی، تفسیر میں کبھی شرکت کی، بزم اقبال کے جلسوں میں کبھی آئے مگر

بڑی ہوشیاری و مکاری سے کتاب کے ذریعے جو تاثر وہ اپنے ناظرین کو دیتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نواب صاحب کے قریبی رفقاء میں سے تھے۔

"میں سایہ کی طرح قریب رہ کر ان کو سیاسی جلسوں میں دیکھا اور ادبی محفلوں میں بھی، مؤرخین کے گروہ میں بھی دیکھا اور علماء کے زمرہ میں بھی، منبر پر بھی دیکھا اور محراب میں بھی، ان کے ظاہری ادعا کو بھی سنا اور ان کی حقیقی شکستگی بھی دیکھی، انہیں ہنستے کھلکھلاتے بھی دیکھا اور روتے گڑگڑاتے بھی اور اس قدر قریب آئے، دیکھنے سمجھنے کی اجازت خود ان کے لطف و کرم نے دے رکھی تھی۔ اس سے میری روایات مورخانہ معیار پر بھی محتاج سند نہیں رہتیں بلکہ وہ خود سند ہیں۔"

(ص ۳)

"یہاں یہ بات بلاتکلف کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اس تصنیف میں میری حیثیت بہت سی باتوں میں راوی اول کی ہے" ص ۲ حیاتِ بہادر یار جنگ۔

۱۹۸۲ء میں جب وہ تعمیر ملت کے جلسہ میلاد میں آئے تھے تو قائد ملت کے خادم خاص سید حسین نے بیان کیا کہ میں نے کبھی ان کو نواب صاحب سے ملتے نہیں دیکھا۔ مزید تصدیق کے لئے مولوی عبدالرحمٰن سعید (سعید صدیقی) مولوی محمد احمد خاں صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔

بلاشبہ غلام محمد صاحب بہت سی باتوں میں راوی اول ہیں۔ اور ان کے حوالوں سے جن لوگوں نے نقل کیا اس کی صداقت مشتبہ ہے۔ مثلاً نواب صاحب کی تاریخ پیدائش ۲۷، ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۳، فروری ۱۹۰۵ء لکھی ہے۔

اقتصادیات و اعداد و شمار کی شائع کردہ کسی بھی سو سالہ جنتری میں دیکھ لیجئے تو پتہ چلے گا کہ ۲۷، ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کی مطابقت

۵ مارچ ۱۹۰۵ء ہوتی ہے۔

تعلیم کے باب میں لکھتے ہیں "خود فرماتے تھے کہ میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں تک کسی سے سبقاً سبقاً نہیں پڑھیں،، ص ۲۰ حیات بہادر یار جنگ۔

"نواب صاحب نے فارسی کی ابتدائی کتابیں استاد سے پڑھیں۔ آمدن سی لفظی صفت المصادر اور چہل سبق کے بعد نواب صاحب نے گلستان کی ابتدا فرمائی"۔

(حوالہ: سوانح بہادر یار جنگ جلد اول از نذیر الدین احمد ص ۹۷۔ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدر آباد)

"عید کا موقع ہے، نصیب یاور جنگ اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، بچوں کا ساتھ رہنا بھی ضروری ہے، محمد بہادر خاں اِدھر والد کے اس عمل کے خلاف عید گاہ کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ والد کا اصرار ہوتا ہے کہ یہیں نماز پڑھی جائے۔ صاحب ہمت فرزند عید گاہ کی اہمیت پر تقریر شروع کر دیتا ہے۔ والد منھ پھیر کر محلہ کی مسجد کی طرف بڑھتے ہیں اور محمد بہادر خاں عید گاہ پہنچ جاتے ہیں"۔ ۲۲، ۲۳، غلام محمد۔

قوم مہدویہ میں ایک گروہ جو نماز جمعہ ادا کرتا تھا وہی طبقہ نماز عید میں شریک ہوا کرتا تھا، جو گروہ نماز جمعہ ادا کرنے کے مسئلہ میں اختلافِ رائے رکھتا تھا وہ گروہ نماز عید ادا نہیں کیا کرتا تھا۔ نواب صاحب کا تعلق دوسرے گروہ کے نظریہ سے متفق تھا۔

نواب صاحب نے اپنی زندگی میں ۲۳ سال کی عمر میں پہلی بار نماز عید پڑھی جب کہ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، جس کا ثبوت نواب صاحب کی ڈائری میں درج شدہ مضمون سے ملتا ہے:

"دس بجے نماز عید کیلئے حضرت مولوی سید شہاب الدین صاحب قبلہ کی مسجد کو چنچل گوڑہ گیا، اپنے ہوش میں آنے کے بعد آج پہلی دفعہ میں نے عید کی نماز پڑھی۔ اب تک عدم تکمیل شرائط کی وجہ سے نہیں پڑھتا تھا، اگرچہ اب بھی میرا وہی خیال ہے، لیکن چوں کہ نماز جمعہ کی طرح اس سے کوئی فرض نماز ضائع نہیں ہوتی اور گھر پر بیٹھے ہوئے بیہودہ گوئی میں مشغول رہنے کے بجائے ایک جماعت کثیر کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا اور دوگانۂ شکرانہ ادا کرنا ہر طرح بہتر و مناسب نظر آیا اس لئے شریک ہوگیا۔ نماز کے بعد مسلمانوں کا ایک دوسرے سے ملنا اور سارے رنج وکدورت کو برطرف رکھ کر معانقہ کرنا قابل دید منظر ہوتا ہے۔"

(حوالہ: بہادر یار جنگ کی ڈائری، مرتبہ نذیر الدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، حیدرآباد (۱۹۲۷، ۱۹۲۸ء) ص ۱۴۹، ۱۵۰، صفحہ متعلقہ ۲۴ر مارچ ۱۹۲۸ء)

اب ایک اور غلط بیانی ملاحظہ ہو:

"پندرہ سولہ برس کی عمر ہو چکی ہے، مسیں بھیگ رہی ہیں، سبزہ کا آغاز ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ صرف ٹھوڑی پر کچھ بال نکل آئے ہیں، باقی چہرہ صاف ہے ——— مدرسہ جاتے ہیں تو ہم سبق مذاق اڑاتے ہیں، کوئی "بکرا" کہہ کر پکارتا ہے تو دوسرا کوئی اور پھبتی کستا ہے ——— گھر آتے ہیں تو والد بزرگوار انتہائی مخالف، حکم پر حکم صادر ہو رہا ہے کہ فوراً ڈاڑھی منڈھوا دو۔ اُدھر سے جتنی شدت ہے، اِدھر سے اتنا ہی زیادہ استقامت اور استقلال کا مظاہرہ ہو رہا ہے ——— والد ماجد نے جب دیکھا کہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہیں چلتا تو بہادر خاں کے دوسرے ہم عمر بھائیوں اور رشتہ داروں کو سکھا دیا کہ کبھی بہادر خاں کو پچھاڑ کر اس کی ڈاڑھی

صاف کر دینا، ایک دفعہ جرأت کی گئی، ایک صاحب (رشتہ یاد نہیں) مرحوم کو غافل پاکر، ہاتھ میں قینچی لئے سینے پر سوار ہو گئے۔ مرحوم ویسے بھی قوی تھے اور اب تو ایک جذبہ کارفرما تھا، ان صاحب کو اس بری طرح دے پٹخا کہ پھر سے کسی نے اس قسم کا خیال بھی نہ کیا ——————— اس واقعہ کے بعد سے والد کی خفگی اور بڑھ گئی۔

جواباً عرض ہے کہ نواب صاحب کی مسیں ۱۲ برس کی عمر میں بھیگ چکی تھیں۔ ۱۳ سال کی عمر میں گردجمال بال کی ڈاڑھی ہر تصویر میں عیاں ہے واقعہ متذکرہ کے وقت نواب صاحب کی عمر پندرہ سال بتائی گئی ہے یعنی نواب صاحب کی شادی ہو جانے کے بعد کا یہ واقعہ ہے؟ کیوں کہ نواب صاحب کی شادی کے وقت ان کی عمر پورے پندرہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی (۱۴ سال ۳ مہینے ۲۷ دن کی عمر تھی) خاندانی روایات کے بموجب کم عمر میں شادی کر دی گئی"۔ (حوالہ: سوانح بہادر یار جنگ جلد اول از نذیرالدین احمد ص ۵۹ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدرآباد)

"مرحوم کے صرف ایک لڑکی تھی، ماں باپ کی ساری آرزوؤں کا مرکز و محور، مگر آٹھ برس کی ہونے نہ پائی تھی کہ رحلت کر گئی، بڑے صبر کا مقام تھا اور بہادر یار جنگ یہاں بھی ایک نمونہ بن کر ملت کے سامنے پیش ہوئے۔ مسلمانوں کی ایک رفاحی کمیٹی کا اس روز اجلاس تھا۔ مرحوم اپنی چہیتی بیٹی کو سپرد خاک کر کے سیدھے اس کمیٹی کے اجلاس میں پہنچ گئے اور اپنے قیمتی مشوروں سے اس کی رہبری فرماتے رہے"۔

(حوالہ ۱۴۳ حیات بہادر یار جنگ)

جواباً عرض ہے کہ "نواب صاحب کی شادی کے ۱۹ سال بعد ۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اپنی والدہ کے نام پر طالیمن خاتون عرف کنیز فاطمہ رکھا"۔

"۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ۷ ماہ ۱۵ دن کی یہ نوخیز کلی سپردخاک کر دی گئی"۔

نواب صاحب نے نوحۂ غم لکھا ؎

بنا کے بات میری بگاڑ دی تو نے
میری امید کی دنیا اُجاڑ دی تو نے

دوسری غلط بات کہ بیٹی کو سپردِ خاک کرنے کے بعد رفاعی کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔

بچی کا جب انتقال ہوا نواب صاحب ورنگل کے دَورے پر تھے، ورنگل سے نواب صاحب کو اطلاع دینے اور ساتھ لانے کیلئے یہاں سے موٹر روانہ کی گئی۔ "نواب صاحب نو ۹ بجے شب سیدھا حظیرہ مشیر آباد پہنچے۔ اپنی تمناؤں کو سپردخاک کیا اور ۱۱ر بجے گھر لوٹے، نماز شکرانہ ادا کی، اسی رات دَرد و کرب کے عالم میں "مرگ آرزو" کے زیرعنوان اپنا نوحۂ غم سپردِ قلم فرمایا ؎

بنا کے بات میری بگاڑ دی تو نے
میری امید کی دنیا اجاڑ دی تو نے

(حوالہ: سوانح بہادر یار جنگ جلد اوّل ص ۶۶، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، حیدرآباد)

رات کے ۱۲ بجے وہ کونسی رفاہی کمیٹی تھی جس میں نواب صاحب نے شرکت فرمائی؟۔

ایک تاریخ ساز شخصیت کے تعلق سے پوری طرح نواب صاحب کی شخصیت سے ناواقف شخص نے غیر مصدقہ مواد عوام کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی، یقیناً یہ بڑی جسارت تھی جس کا خود غلام محمد صاحب کو اعتراف ہے۔

"ایسی جامع ہستی کی سوانح نگاری مجھ جیسے بے بساط کیلئے یقیناً بیجا جسارت تھی۔" (حوالہ: حیات بہادر یار جنگ از غلام محمد ص ۱۰)

اس جملہ میں مصنف کے ضمیر کی آواز شامل ہے۔

بہرحال اس قبیل کی شخصیتوں نے نواب صاحب کے نام کو کام میں لاکر پاکستان میں اپنی ناکام زندگیوں کو کامرانی کے منزلوں سے ہمکنار کرلیا۔

"دعوتوں میں حقہ یا پان سگریٹ عموماً کھانے کے بعد پیش کیا جاتا ہے، یہاں اس تہذیبی روش سے ہٹ کر حقہ کھانے سے پہلے ہی پیش کر دیا گیا اور اگرچہ دوسرے مہمان بھی موجود تھے لیکن حقہ صرف بہادر یار جنگ کے روبرو پیش کیا گیا، حقے کی اس طرح پیش کشی بہت معنی خیز ہے۔ اگر کھانے کے بعد حقہ پیش کیا جاتا اور پھر حادثہ پیش آتا تو خیال کیا جاتا کہ کھانے میں کچھ ملا دیا گیا ہوگا اور جب ایک نہیں کئی افراد کھانے پر مدعو ہوں تو کسی ایک مخصوص شخص کے کھانے میں زہر کی ملاوٹ آسان نہیں ہوتی، حقے کے ذریعے زہر دینا آسان تھا۔ بہرحال حقے کی کھانے سے قبل پیش کش اور وہ بھی بطور خاص صرف بہادر یار جنگ کے روبرو پیش کشی پھر معاً بعد اس کا غائب کر دیا جانا اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ حقے کے ذریعے زہر دیا گیا۔

ان اسباب وعلل کی بناء پر میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ بہادر یار جنگ کی شہادت زہر خورانی کا نتیجہ تھی۔ حقیقتِ حال تو جب واضح ہوتی جب اس حادثہ کی باضابطہ طبی تحقیقات ہوتی، لیکن بدقسمتی سے طبی تحقیقات نہ ہوسکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بیگم بہادر یار جنگ نے احترامِ میت کے پیش نظر پوسٹ مارٹم کی کسی طرح اجازت نہیں دی۔"

حقہ کے ذریعے زہر خورانی کی بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔

گھر گھر گھریلو عورتیں، چکی کے گیت کی طرح یہ گایا کرتی تھیں کہ

گیا حقہ میں دم بہادر جنگ ، گئے ملکِ عدم بہادر جنگ

اس دور کے عوامی شاعر جناب حلمی آفندی نے عوامی احساسات کو نظم کیا تھا۔

واقعی وہ تمہاری دعوت تھی یا حقیقت میں وہ عداوت تھی

اژدہا تھا کہ مار تھا حقہ واقعی یادگار تھا حقہ

"یہ مکر بھری دنیا بہادر خاں کے رہنے کے قابل نہ تھی، یہاں سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جاتا ہے، عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا جاتا ہے بالآخر اسی دنیا نے بہادر خاں کو حقہ پیش کر دیا، انسان اپنی حیوانی روایت پر پورا اترا، لیکن خدا کے نیک بندے سے ایسا سلوک دعویداران انسانیت کو مہنگا پڑا۔

ہم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے اور آج اپنی حفاظت کے خیال سے لرزاں و ترساں ہیں"

(حوالہ: کیا پوچھتے ہو، کسے کھو دیا از محترم المقام سید خلیل اللہ حسینی صاحب صدر تعمیر ملت مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں۔ ص ۲۷، مرتبہ نذیر الدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدر آباد)

پوسٹ مارٹم کے بارے میں پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اعلیٰحضرت کے تشریف لے جانے کے بعد جناب کارونر صاحب نے آکر کہا "چونکہ نواب صاحب کی موت مشتبہ حالات میں واقع ہوئی ہے اس لئے پوسٹمارٹم کرانا ضروری ہے تاکہ موت کے صحیح اسباب معلوم ہو سکیں۔

بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کے دوست احباب، نواب صاحب کی نعش کا پوسٹ مارٹم کرانے کے سخت مخالف تھے، بڑی بحث و

مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ ایسے دو اشخاص جو نواب صاحب کے بہت قریب رہے ہوں ۔ بیان دیں کہ موت قدرتی طور پر واقع ہوئی ہے ان کو کسی پر شبہ نہیں ہے ۔

اس کی تکمیل کیلئے مولوی محمد یامین زبیری صاحب معتمد مجلس اتحاد المسلمین کا اور میرا انتخاب ہوا ۔ ہم دونوں نے کارونر صاحب کو لکھوا دیا کہ قائد ملت کی موت قدرتی طور پر واقع ہوئی ہے ، ہم کو کسی پر شبہ نہیں ہے ، بیگم صاحبہ اور ہم پوسٹ مارٹم کروانا نہیں چاہتے ۔ اس کے بعد کارونر صاحب نے نعش دفنانے کی اجازت دیدی ۔

(حوالہ : یادداشت (قلمی غیر مطبوعہ) ازجناب سید یوسف صاحب تصور رفیق قائد ملت ص ۲۵۵ ، ۲۵۶)

نعش کا اگر پوسٹ مارٹم بھی کروایا جاتا تو رپورٹ حرکتِ قلب کے یکایک بند ہوجانے کی جاری ہوتی ۔ کیوں کہ ؎

نہ تو قاتل ہی میرا ہے اور نہ تو تلوار میری ہے

" اگر بالفرض انہوں نے (لیاقت اللہ قریشی صاحب) کسی کے اشارہ پر یہ مذموم حرکت کی تھی تو سوال یہ ہے کہ انہیں اس کے صلہ میں کیا ملا "

ذاتی مخاصمت ، سیاسی اختلاف یا اقتدار کے زیر اثر ایسی سازشوں میں شریک سازش اصحاب کو کچھ نہ کچھ نہیں ، خلاف توقع بھی ملتا ہے جیسے کہ پولس ایکشن کے بعد سازشی ٹولہ عہدوں کے انعام و اکرام سے نوازا گیا ۔ امید پر دنیا قائم ہے ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانے کی امید میں کھونا بھی پڑتا ہے ۔

اپنے اقتدار کی بقا ، اپنے آقاؤں کی خوشنودی اور مزید علاقوں پر حکمرانی کے خواب دیکھتے ہوئے نواب میر نظام علی خاں

والی دکن نے ٹیپو سلطان کی حکومت کو صفِ ہستی سے مٹانے کیلئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ٹیپو سلطان شہید ہوئے، ان کے بچے اسیر ہوئے، رعایا مظالم کا شکار ہوئی مگر نظام علی خاں والی دکن کو حصہ رسدی میں کیا ملا نہ سرزمین ٹیپو کا ایک ٹکڑا نہ ریاست ٹیپو سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے ایک پائی۔ الٹا لینے کے دینے پڑ گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد دکن پر پہلی بار ریزیڈنٹ مسلط کر دیا گیا۔ ۱۷۸ء میں کیپٹن کنوے پہلی بار پہلا ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا اور اس طرح اندرونی آزادی پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

نظام علی خاں والی ریاست دکن نے اگر اس وقت غداری نہ کی ہوتی تو ٹیپو سلطان کی تلوار، انگریز اقتدار کے خاتمے کا باب بنتی۔ دکن کے نام کو حریت پسندوں میں ذلیل کر کے دکن کے دامن پر قیامت تک کیلئے ایک داغ لگا گئے۔ وفاداری کا صلہ ملا تو یہ ملا!

۵ — "ہاشم علی خاں جن کے گھر پر یہ حادثہ پیش آیا۔ اپنی آخری عمر میں دیوانے ہو گئے تھے اور اسی دیوانگی کے عالم میں ان کا انتقال ہوا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس حادثے کے ذمے دار تھے لیکن وہ یقیناً اس راز سے واقف تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حادثہ ان کے علم و اطلاع کے بغیر پیش آیا ہو اور وہ اس کے بعد اس سے واقف ہو گئے ہوں اور اس کا اثر ان کے ذہن و دماغ پر پڑا ہو۔"

اگر حقہ میں زہر دیا جانا مسلم ہے تو اس بات سے انکار کی کوئی صورت نہیں ہے کہ صاحب خانہ اس سازش سے لاعلم نہ تھے، ان کے ذہن پر اس حادثے کا بے حد اثر ہوا اور اسی حادثے کے اثر سے وہ پاگل ہو کر مرے۔

۶ — "حقہ فوراً غائب کر دیا گیا۔"

لیکن سرکاری تحقیق جب عمل میں آئی تو حقہ کا طبی معائنہ کیا گیا اور معمول سے کچھ زیادہ نکوٹین پایا گیا۔ یہ اعلان اخبارات میں شائع ہوا۔

حالانکہ حقہ فوری غائب کر دیا گیا تھا۔ پھر یہ برآمد کہاں سے ہوا۔

سچ ہے ؎

بعض افسانے الگ ہوتے ہیں عنوانوں سے

"اس سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زہر کس نے دیا اور کیوں دیا؟ واضح رہے کہ یہ دونوں سوالات ایک دوسرے سے مربوط ہیں، کیوں کہ ان دونوں سوالات کے صحیح جوابات ہی پر حقیقت واقعہ تک رسائی ممکن ہے۔ ان سوالات کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں، پہلے ان پر ایک نظر ڈال لیجئے۔"

سوال یہ نہیں ہے کہ زہر کس نے دیا اور کیوں دیا؟

کیوں کہ زہر دینے والی خاتون سے بھی ہم واقف ہیں اور کیوں دیا تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ سازش کے تحت دیا۔ سوال تو یہ ہے کہ یہ زہر کس کے حکم سے دیا گیا اور یہ سازش کس کے حکم سے پروان چڑھی اور کامیاب اختتام کا باعث بنی۔

بعض بہت چھوٹی باتوں کو جو بنیادی حیثیت کی حامل ہیں نظرانداز کر دیا یا وہ ذہن سے محو ہو گئے۔ مثلاً ہاشم علی خاں صاحب کے پاس اس سے قبل بھی اس قسم کی دعوتوں کا اہتمام ہوتا رہا ہے؟ اس دعوت میں کیا کسی خاص مکتب خیال کے لوگ ہی زیادہ تھے؟ کھانا باورچی کے ذریعے تیار کروایا گیا یا اہل خانہ نے پکایا۔ کھانا باہر کے حصے میں پکایا گیا یا گھر کے اندر کے صحن میں۔ کیا واقعی دعوتیوں کے لئے کھانا تیار تھا؟ شام کا کھانا اس دور میں بعد مغرب ہوا کرتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ

۸ ربجے تک دسترخوان بچھا دیا جاتا تھا۔ کھانا پکنے اور دسترخوان چننے میں تاخیر کیوں ہوئی؟ نواب صاحب کی شہادت کے بعد سب مہمانوں اور دیگر اطلاع پر آنے والوں کے لئے گھر آنگن ایک ہوگیا تھا کیا تین پتھروں پر دیگیں لگی ہوئی کسی نے دیکھیں؟ اگر صرف اسی بات کی تحقیق کرلی جائے تو مزید تحقیق طلب کوئی بات باقی نہیں رہتی۔

۱:- ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوؤں میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہوگی۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بہادر یار جنگ کی کسی ہندو سے ذاتی دشمنی نہ تھی، ہاں سیاسی اختلاف ضرور تھا لیکن ہندو عوام اور ہندو لیڈر ان کا احترام کرتے تھے اور بعض ہندو تو ان سے محبت کرتے تھے، یوں بھی حیدرآباد کے کسی ہندو کی یہ جسارت ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ قائد ملت کو زہر دیتا۔ پھر دعوت کی اس محفل میں ہندوؤں میں سے کسی کا گذ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے جس پر کسی تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، البتہ یہ بات کہ

۲:- "نیشنلسٹ مسلمانوں پر بھی گمان کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی محض بدگمانی ہے اور بعض بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ حیدرآباد میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی، ان کے لیڈر بیرسٹر اکبر علی خاں تھے جو قائد مرحوم کے جگری دوست تھے۔ ان کے بہادر یار جنگ سے سیاسی اختلافات ضرور تھے لیکن یہ ان کی ذاتی دوستی میں کبھی حائل نہیں ہوتے بلکہ بعض ایسے مواقع پر انہوں نے اعلیٰ حضرت کے سامنے قائد مرحوم کی پُرزور حمایت کی جب وہ ان کی مخالفت کرکے بڑے سے بڑے عہدہ یا منصب حاصل کرسکتے تھے، کردار کی اسی مضبوطی کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے یا ان کے دوسرے ساتھیوں

کی طرف ایسی گھناؤنی حرکت کا انتساب بھی گناہ سے کم نہیں ہے "

سوال بیرسٹر اکبر علی خاں کا نہیں ہے ۔ بلاشبہ ان پر اس خصوص میں شبہ کرنا بھی گناہ کے مترادف ہے مگر قوم پرست مسلمانوں کے تعلق سے یہ نرم گوشہ دراصل حسن ظن ہے ۔

بہادر یار جنگ کی شہادت سے راستہ پوری طرح ہموار ہوگیا اور ریاست حیدرآباد کے خلاف کی گئی سازش کی ابتداء کی انتہاء تھی اس دعوت کے شرکاء کی فہرست پر اگر ایک نظر ڈال لی جاتی تو پتہ چلتا کہ سوائے ڈاکٹر رضی الدین اور بیرسٹر اکبر علی خاں کے کوئی اور ایسا نہ تھا جس کے بارے میں اس کے قوم پرست ہونے یا نظام اور مفادات حاصلہ سے ان شخصیتوں کی وابستگی کا ثبوت موجود نہ ہو، اس دعوت میں ڈاکٹر مسس مقبول علی بھی شریک تھیں جنہوں نے نواب صاحب کو حقہ پیش کیا ۔ یہ یہودن خاتون تھیں، ان کے مراسم سر آرتھر لوتھیاں ریزیڈنٹ حیدرآباد سے دوستانہ تھے ۔

قاضی عبدالغفار، مشہور صحافی اور مصنف لیلیٰ کے خطوط، مجنوں کی ڈائری بھی اس دعوت میں موجود تھے، یہ کس عمر میں وطن سے دکن آئے ۔ آئے یا لائے گئے؟ پیام اخبار کی اجرائی کا مقصد کیا تھا اور اس اخبار کی اجرائی کے سلسلہ میں مالیہ کہاں سے فراہم ہوا، قوم پرست مسلمانوں کی آواز کو عوام تک پہنچانے اور رہبر دکن کے خلاف محاذ قائم کرنے کی غرض سے اس اخبار کی اجرائی عمل میں آئی ہے، کسی مجلسی مسلمان یا قائد ملت کے چاہنے والے نے کبھی اس اخبار کی خریدی قبول نہیں کی ۔ کانگریسی اردو داں ہندوؤں اور غیر ملکی سازشیوں کا ایک ٹولہ اس اخبار کا سرپرست تھا، آگے مضمون میں جس سازشی ٹولہ کا ذکر مضمون نگار نے کیا ہے اس ٹولہ کی سرپرستی کے بغیر اس اخبار کی اجرائی

اور اتنے عرصے تک اس کا جاری رہنا امر محال تھا۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "ایسی گھناؤنی حرکت کا انتساب بھی گناہ سے کم نہیں ہے" قوم پرست مسلمانوں میں خود قاضی عبدالغفار نے نواب صاحب کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا، وہ کون سا اتہام تھا جو قاضی صاحب نے نواب صاحب کے سر نہ باندھا، یہی قوم پرست مسلمان تھے جن کو آپ نے سازشی ٹولہ کا نام دیا ہے۔ اس دعوت میں مشہور زمام شخصیت ہوش بلگرامی بھی مدعو تھے جو قوم پرست مسلمان تھے۔ انگریز اور کانگریسی آقاؤں کے غلام اور سرکار عظمت مدار کے خاص الخاص درباری یہ وہی ہیں جنہوں نے از ابتدا تا انتہا بہادر یار جنگ کو اپنا نشانہ بنایا اور سازشیوں کے یہ میر کارواں تھے۔

قائد ملّت کے متعلق ان کے خیالات سے ان کے عزائم کا پتہ چلتا ہے:۔

"بہادر خاں ایک مہدوی پٹھان تھے، تعلیم تو ایسی نہ ہوئی تھی مگر مطالعہ اور ذہانت نے انہیں طلیق انسان بنا دیا تھا اور تقریروں ہی کی کامیابیوں نے بہادر یار جنگ بنا دیا۔ حکومت تو حکومت انہوں نے بادشاہی کو بھی خطرہ میں ڈال دیا"

(حوالہ: مشاہدات از ہوش بلگرامی ص ۳۳۵)

اصلاحات اور اتحاد المسلمین کے زیر عنوان مشاہدات میں صفحہ ۲۹۴، ۲۹۵ میں بیان کرتے ہیں:۔

اصلاحات اور اتحادُ المسلمین

۱۹۳۷ء میں ایک طرف فیڈریشن کے چرچے تھے اور اس کی سیاسی اداروں کی طرف سے مخالفت تھی تو دوسری طرف حیدرآباد میں اصلاحات دیئے جانے کے شہرے تھے۔ "آئین گار کمیٹی" اپنا کام کر رہی تھی، سیاست

اِدھر کارفرما تھی اور مذہب اُدھر بہادر یار جنگ کے سایہ میں تبلیغی مہم شروع کر چکا تھا۔ پست اقوام عبداللہ اور گھرڑو صاحب کے ناموں سے مسجدوں میں رکوع وسجود کی نقلیں کرنے لگی تھی، تبلیغی مہم کے سرمایہ دار مبلغ خان بہادر علاء الدین اپنے لئے بہشتی کمرے خریدنے کا سودا کر رہے تھے، حور وغلمان ان کی ارضی "خان بہادریت" کو آغوش میں لینے کے لئے فلک پر چشم براہ تھے ان کے رفیق کار حکیم مقصود بھی اپنی تبلیغی حکمتوں کے نسخے لکھتے جا رہے تھے، ان تمام ہنگامہ آفرینیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکن کی تاریخ میں اسٹیٹ کانگرس، ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج نے متحدہ طور پر ستیہ گرہ شروع کر دی۔ مہاتما گاندھی کے اشارہ سے اسٹیٹ کانگرس تو فرقہ واریت کا عذر کر کے علیٰحدہ ہو گئی اور جب آٹھ ھزار سماجیوں نے جیل کی آبادی بڑھا دی اور یہ طبقہ اپنی تھیلیاں بھی خالی کر چکا اور ناکامیوں نے اسے تھکا بھی دیا تو حکومت کی طرف سے اصلاحات کے وعدے پر ستیہ گرہ بند کر دی گئی اور حکومت وسماجی دونوں اپنے اپنے زعم میں اپنی سیاسی کامیابیوں پر نازاں رہے۔

اس وقت تک اتحاد المسلمین سیاسی دنیا میں زیادہ نمایاں نہیں ہوئی تھی مگر ۱۹۳۹ء میں جب وہ سن رشد کو پہنچی اور بہادر یار جنگ کی قیادت دکن کی فضاء پر چھانے لگی تو انہوں نے اصلاحات میں روڑے اٹکانا شروع کئے اور جب اُلجھی ہوئی طبیعتیں نہ سلجھیں تو مسٹر جناح کو دعوت دی گئی، وہ آئے اور جداگانہ انتخاب کے مسئلہ پر اتحادیوں کے ہمنوا ہو گئے۔ اصلاحات کے خواب حیدرآباد کی دنیا بیداری میں دیکھ رہی تھی کہ :۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

اتحاد المسلمین، اور قائد مجلس نواب بہادر یار جنگ کے خلاف

ہوش بلگرامی کی زہرافشانی کے چند نمونے جو نہ صرف ان کے اپنے ذاتی احساسات ہیں بلکہ یہ پوری سازشی ٹولہ کی دلی جذبات کے آئینہ دار ہیں ۔

حیدرآباد میں ویسے تو بہت سی انجمنیں بنیں اور بگڑیں مگر اتحاد المسلمین اتحاد بین المسلمین کا نعرہ لگاتی ہوئی حیدرآباد کے گلی کوچوں میں پھری، وہ اسلام کے جملہ فرقوں میں اتحاد پیدا کرانے کا پیام لے کر ابتداءً محمود نواز خاں کے ذریعہ سے متعارف ہوئی "شیعہ سنی" کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے ارادے کرتی رہی، مقلد و غیر مقلد کو ایک سطح پر لانے کی تدبیریں سوچتی رہی "مہدوی و قادیانی" کو ایک مصلیٰ پر نماز پڑھانا چاہتی تھی۔ جس کے ابتدائی جلسے تو "میلاد شریف" کے نام سے ہوتے رہے آخر بہادر خاں اس کے سنسان پلیٹ فارم پر آئے اور "میلادالنبی" کے جلسوں میں ان کی تقریریں اِدھر اُدھر شروع ہوگئیں، ایک جلسہ میں اعلیٰحضرت نے بھی اُن کی تقریر سُنی اور اس قدر خوش ہوئے کہ بہادر خاں کو "بہادر یار جنگ" بنادیا۔ جنہوں نے اتحادالمسلمین کی بنیاد رکھی تھی وہ محمود سے ایاز ہوگئے اور اس قدر پیچھے رہ گئے کہ پھر ان کو کسی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور بہادر یار جنگ بالکلیہ اس کے "کرتا دھرتا" بن گئے۔ جب اس کی شہرت بڑھنے لگی اور بہادر یار جنگ کے "مہدوی پنجے" اچھی طرح سے گڑ گئے اور ان کی طلاقت لسانیوں نے اس کی بنیادوں کو بہت کچھ مضبوط کر دیا اور علمائے دکن کی بھی لمبی لمبی عبائیں اس میں نظر آنے لگیں تو تدریجی طور پر مذہب میں سیاست کا بھی جوڑ لگا دیا گیا اور انقلاب زندہ باد کے نعرے فضائے دکن میں گونجنے لگے، اتحادالمسلمین ایک انتہا پسندوں کی جماعت بن گئی، حکومت پر نقد و تبصرے ہونے لگے شخصیتوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی اور قمر باغ میں بادشاہ کا ذکر کچھ اس ہنج سے بہادر یار جنگ نے کیا کہ قدامت پسندوں میں ہلچل مچ گئی۔

اور ورنگل کے جلسہ میں بھی ان کی جذباتی زبان بے قابو ہو گئی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بادشاہ نذری باغ میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔

ریاست کی ہندو رعایا ہندوستان کی رعایا نہ تھی جو حقوق طلبی کے لئے شور و غل مچاتی۔ وہ اپنے کاروبار میں کچھ ایسی مصروف تھی اور اپنی پوری کچوریوں میں کچھ ایسی مگن تھی کہ وہ جان بھی نہ سکتی تھی کہ یورپ کی رعایا نے حکومتوں کو کیسے تہ و بالا کیا ہے، ایشیائی ممالک میں رعایا نے کیا انقلاب کئے ہیں اور اس کے دیس والوں کو مہاتما گاندھی نے مصائب اٹھا اٹھا کر کن کن صورتوں سے انگریزوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے تیار کیا ہے، پنڈت نہرو نے لاٹھیاں کھا کھا کر کس طرح ان میں ہمتیں پیدا کرائی ہیں۔ اتحاد المسلمین نے اپنی بلند بانگ تقریروں کی گرج سے دکن کی ہندو رعایا کو چونکا دیا، ان کے لیڈروں نے بھی پر پُرزے جھاڑے، دبی زبانوں سے بیانات بازی شروع ہو گئی۔ آریہ سماجی بھی شور مچانے لگے۔ مہاسبھائی بھی ویدک دھرم کی دُہائی دینے لگے اور اسٹیٹ کانگرس کے بیانات بھی اخباروں میں آنے لگے، ہندوؤں میں بیداری کی کروٹیں اِدھر اُدھر لی جانے لگی مگر حکومت کے رعب سے جمائیاں ہی لیتے رہ گئے اور بستر راحت سے اُٹھ کر مرد میداں نہ بن سکے۔"

(حوالہ:۔ مشاہدات از ہوش بلگرامی ص ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴)

سازشی ٹولہ کے ذریعہ یہ بات نظام کے ذہن میں بٹھا دی گئی تھی کہ بہادر یار جنگ مسولینی کا رول ادا کر رہے ہیں چنانچہ اس خصوص میں خود نظام نے بھی یہ بات کہی تھی، جس سازشی ٹولہ نے "انا الملکی" کے نعرے کو کہ، ہم دکن کے بادشاہ ہیں

وہ نہیں تو ہم نہیں، ہم نہیں تو وہ نہیں

سیاسی نعرہ تھا یہ رنگ دیا تھا کہ یہ کلمہ کلمۂ توحید سے بھی زیادہ اہمیّت

اختیار کر گیا تھا، اس خصوص میں سازشی ٹولہ کے خیالات، نظام کے احساسات قلبی کے بھی آئینہ دار ہیں۔ ذیل کے حوالہ میں نواب صاحب کی شہادت کا ذکر جس تحقیر آمیز انداز اور الفاظ میں کیا گیا ہے، اس انداز اور ان الفاظ کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ سے

اوروں کی وہ عظمت کیا جانے کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں

انا الملکی نعرہ

"دکھنی مسلمانوں کا یہ کلمہ "کلمۂ توحید" سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ "ہم بادشاہ ہیں" اور کنگ کوٹھی کا ساکن صرف "قوم کا مظہر ہے۔" "انا الملک" کا ساز چھیڑا گیا، دوسرے جلسوں میں جو نہ کہنا تھا وہ بھی کہہ دیا گیا، بزعم خود حکومت کی قوتِ برداشت کا امتحان لیا جاتا رہا "شاہی اقتدار" کے استعمال پر نظر تھی، ورنہ ارادے تو یہ تھے کہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جائے اور بادشاہ کو "شاہ شطرنج" بنا کر رکھا جائے مگر اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی، بلارم میں ان کی فوج مستقلاً رہتی تھی اور معاہدہ کے لحاظ سے وہ آڑے وقت میں کام آ سکتی تھی، اگر بہادر یار جنگ کے یہ عزائم کہیں پورے ہو جاتے تو وہ ایک وقت میں ہٹلر بھی بن جاتے، مسولینی کی فسطائیت بھی پھیلا دیتے اور مصطفیٰ کمال کی انقلابی روش بھی اختیار کر لیتے اور اس اتحاد ثلاثہ کی آمیزش سے ملک میں انقلاب عظیم پیدا کئے بغیر نہ رہتے جس کے لئے کسی موزوں وقت کا انتظار کیا جا رہا تھا وہ دکن کے قائد ملت تو بن چکے تھے اور قائد اعظم سے "خرقۂ خلافت" پانے کے امیدوار بھی تھے مگر زندگی نے دفا نہ کی اور "انا الملک" کا نظریہ پیش کرنے والا "دعوت ہاشمی" میں حقہ پیتے پیتے چل بسا۔" (حوالہ: مشاہدات از ہوش بلگرامی ص ۲۹۷، ۲۹۸)

اس ناہنجار نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کا خیال ہے کہ بہادر یار جنگ کی قیادت اسلامی اقتدار کی بے چین کر دینے والی بھوک تھی۔ پولس ایکشن دراصل بہادر یار جنگ کا تیار کردہ تنور تھا۔ ۱۹۴۸ء کے طوفان میں بہادری تنور نے حیدر آباد کے دو صد سالہ اقتدار کو اتحادی شعلوں کے نذر کر دیا۔ اس کے اپنے الفاظ میں وہ یوں گویا ہے:۔

"اتحاد المسلمین کیوں نہ دنیائے سیاست میں اپنا نام اچھالتی جس نے سرزمین دکن میں فرقہ واریت کی تخم ریزی کی ہو، جس کے تاریخی اتحاد کو درہم برہم کیا ہو، جہاں انا الملک کے نظریہ نے ہر مسلمان کو بے تاج کا بادشاہ بنا دیا ہو اور تاجدار کو صرف ان کا مظہر قرار دے کر

مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

کے "حسن ظن" میں مبتلا رہنے دیا ہو۔

یہ بہادر یار جنگ ہی کی قیادت تھی جس نے اسلامی اقتدار کی بے چین کر دینے والی بھوک دکھنی مسلمانوں میں پیدا کی۔ انہی نے حکومت پر بے باکانہ نقد و تبصرہ کی داغ بیل ڈالی، انہی نے قمر باغ کے ایک ایک پتہ کو آنے والی خزاں کا پیغام پہنچایا، انہی نے ورنگل کے جلسہ میں جو نہ کہنا تھا وہ بھی ان کو سنا دیا جو ایسے کلمات کے سننے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے، جہاں کی پرسکون فضا کو اس قدر مکدر کر دیا گیا ہو، جہاں اپنے غیر ہو رہے ہوں، جہاں تخریبی حوصلے زبانوں کی حد تک تو پیدا ہوتے ہوں مگر برطانوی حکومت کی ہیبت قدم نہ اٹھانے دیتی ہو، ورنہ اسی وقت حیدرآباد کی حیثیت نہ معلوم کیا سے کیا ہو جاتی۔ اس کشمکش میں وقت گذرتا رہا اور جب "بہادر قیادت" حقہ کے ایک کش کی تاب نہ لا سکی۔

جس تنور کو بہادر یار جنگ نو دس سال سے سلگا رہے تھے اس میں سے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو طوفان ابل پڑا اور اس کے گرد طواف کرنیوالے

اس طرح جھلس کر رہ گئے کہ صورتیں مسخ ہوگئیں، ملازمانہ راحتیں محدود ہوگئیں اور جاگیردارانہ عشرتیں خواب وخیال ہوگئیں" بہادری تنور" نے حیدرآباد کے روایات کو اور حیدرآباد کے دوصد سالہ اقتدار کو" اتحادی شعلوں" کے نذر کر دیا۔

(حوالہ: مشاہدات از ہوش بلگرامی ص ۷، ۲۲، ۲۲۸)

ہوش بلگرامی کے ان فاسد خیالات کی روشنی میں اس شخصیت کو جاننے کی خواہش فطری ہے کہ آخر یہ فتنہ پرور کس باغ کی مولی تھا، اس خصوص میں ایک دلچسپ تعارفی نوٹ اس کے اصل ونقل پر مشتمل ہدیۂ ناظرین ہے:-

نوٹ

ہوش بلگرامی ——— ایک بلگرامی

ہوش بلگرامی کا نام ساتویں نظام کے ایک سازشی درباری کی حیثیت سے دکن کی تاریخ میں میر جعفر و میر صادق کی طرح قیامت تک زندہ رہے گا۔

بچپن میں ماں کو چھوڑا، بہنوں سے جدا ہوا اور بھائی کو حسرت سے دیکھا اور وطن سے نکل گیا، پھر زندگی بھر نہ ماں کا منہ دیکھنے کا موقعہ ملا نہ باپ بہنوں اور بھائی کا۔ کسی درسگاہ کا یہ فارغ التحصیل بھی نہ تھا، ابتدائی تعلیم استاد جی کے مکتب میں ہوئی پھر جہان کی خاک چھانی، پتہ نہیں ابتدا میں کہاں کہاں سکونت رہی، مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور صحبتوں اور مطالعہ سے استعداد علمی پیدا ہو گئی۔ ابتدائی دور میں مصائب کی زندگی سے دوچار رہے اور پھر کسی طرح درباری دنیا میں پہنچ گئے، غالباً دربار رام پور میں پہلی بار قدم جمائے۔

ریاست حیدرآباد کی خوشحالی کے تذکرے ہندوستان بھر میں تھے

شمالی ہند سے بہت سے لوگ حصولِ روزگار میں حیدرآباد آئے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو صاحب علم و صاحب کردار بھی تھے جن کی دکن میں بڑی پذیرائی ہوئی جن میں عماد الملک سرور جنگ جیسی شخصیتیں شامل ہیں اور بہت سے تو ایسے بھی آئے جنہوں نے ہوشیاری، مکاری، مصلحت پسندی، چرب زبانی، منفی ذہانت سے دکن میں اپنے قدم جما لئے، انہیں میں سے ہوش بلگرامی بھی ایک تھے۔

یہ ۱۹۱۱ء میں آصف سابع کی تاجپوشی کے دور میں حیدرآباد آئے، خیریت آباد میں آباد ہوئے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ جدوجہد اور اہلِ خیر کے رحم و کرم پر بسر ہوا۔ عقدِ ثانی بھی فرمایا، عماد الملک بلگرامی کی سرپرستی میں ذخیرہ کے نام سے ایک رسالہ نکالا، اس وقت تک امراء عظام تک رسائی بھی پالی تھی۔ ان دنوں یہ کالی قبر دارالشفاء میں سکونت پذیر تھے۔

عماد الملک ہی کے نظرِ کرم سے حضور نظام کے حضور پیش ہوئے۔ کچھ ہی دنوں میں ذخیرہ کے سالگرہ نمبر میں شائع شدہ ایک مضمون پر عتاب ہوا، رسالہ ذخیرہ کی کاپیاں ضبط ہوئیں، پریس بند کر دیا گیا (۱۹۱۸ء) اور ۳ دن کی مہلت حیدرآباد چھوڑنے کے لئے دی گئی، پھر بھوپال، جے پور، گوالیار کی خاک چھانتے پھرے۔

۱۹۱۸ء کے بعد ۱۹۲۸ء میں نہ جانے کس کی سفارش پر ۱۰ سال بعد یہ درباری مسخرہ پھر نظام کی طلب پر حاضرِ دربار ہوا اور دمِ آخر تک دکن میں رہا۔ اس دس سال بعد آمد کا حال خود ہوش بلگرامی کی زبانی یوں بیان ہوا ہے۔

" رام پور سے حیدرآباد روانہ ہوا اور چوتھے دن کاچی گوڑہ اسٹیشن پر جب پہنچا تو اعزّہ و احباب کا ایک کافی مجمع پذیرائی کے لئے موجود تھا پھولوں کے ہاروں سے گردن موڑ نہ سکتا تھا، حیرت اس پر ہوئی کہ انہوں

نے بھی ہار پہنائے جو میری شہر بدری کے باعث ہوئے تھے، سب سے بغلگیر ہوتا ہوا یاقوت پورہ کے اس مکان میں پہنچا جہاں میری بیوی اپنے چچا کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھیں۔

دوسرے دن ایک دستار بنی بنائی بازار سے منگوائی، نذر کے لئے چار میناری اشرفی خریدی اور ٹیکسی منگاکر نو بجے کنگ کوٹھی پہنچا، عرض کرایا تو چند منٹ کے انتظار کے بعد حاضری کی اجازت ملی، اندر داخل ہوا، شہ نشین کے قریب پہنچکر آداب بجالایا، نذر پیش کی اور باتوں کا سلسلہ جو شروع ہوا تو بارہ بج گئے، آخر یہ ارشاد فرماتے ہوئے برخاست کی اجازت دی گئی کہ "تمہاری باتوں سے سیری نہیں ہوئی، کل پھر ملوں گا" اس وقت کمال یار جنگ مرحوم بھی باریاب تھے۔ غرض کہ اس روز سے روزانہ باریابی ہوتی رہی۔ گھنٹوں شرف تکلّم بخشا گیا، میری اِدھر اُدھر کی باتوں پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے، زانو پیٹنے لگتے تھے، آخر ایک دن خود ہی ارشاد فرمایا "رام پور اب جاکر کیا کرو گے یہیں رہو" ہفتہ عشرہ کے بعد فرمان مبارک جاری فرمایا گیا کہ "ہوش بلگرامی کا تقرر چار سو روپیہ کی جگہ پر عثمانیہ یونیورسٹی میں کیا جائے"، نہ میں درس وتدریس کے فن کو جانتا تھا نہ طلبہ کو افہام تفہیم کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اور نہ مہذب سرزنش سے ان کی شرارتوں کو کم کرسکتا تھا اس لئے اس خدمت سے خود کو معذور سمجھ کر معذرت کرنی پڑی آخر دو تین ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد انسپکٹری سیونگ بنک کو قبول کرنا پڑا۔

چھ ماہ کے بعد انسپکٹری سے مہتممی پر ترقی ملی اور اس کے چند ماہ بعد نواب صمد یار جنگ بہادر معتمد فوج نے اپنی مددگاری پر منتقل کرلیا، اس طرح ترقی کرتے کرتے بیس[۲۰] سال میں معتمدی تعمیرات تک پہنچا اور سر مرزا اسماعیل کے صدارت سے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے اتحاد المسلمین کی ریشہ دوانیوں کے

کے سبب سے اور یہاں کے سازشی ماحول سے تنگ آکر جنوری ۱۹۴۸ء سے وظیفہ لے لیا۔

ابتدائی زمانہ میں ایک عرصہ تک روزانہ بارگاہ خسروی میں حاضر ہوتا رہا پھر جمعہ مقرر ہوا، تھوڑے عرصہ تک نہ روزانہ کی حاضری رہی اور نہ جمعہ کی، آخر وہ زمانہ آیا جب اعلیٰ حضرت نے یکایک یاد فرمایا، اس وقت سے ۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء تک (تقریباً ۷ ارسال) برابر دو دو گھنٹے، تین تین گھنٹے بلکہ چار چار پانچ پانچ گھنٹے تک حضوری میں حاضر رہتا تھا، دن میں دو دو تین تین مرتبہ بھی جانا پڑتا تھا، صبح سے نکلتا تھا اور سرِ شام کہیں گھر کی صورت دیکھتا تھا، معیشت کی ضرورتوں نے "غلام زریں کمر" بنا کے چھوڑا۔ بعض اوقات راتوں کو بھی بارہ بارہ ایک ایک بجے تک مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی، شہ نشیں پر ایک کرسی میرے لئے بھی رکھوادی جاتی تھی، اس پر بیٹھ کر نہ معلوم کیسے کیسے مسائل چھڑتے تھے اور شہزادی پھڑوں کی فرش پر کمرہ کی آڑ میں بیٹھی ہوئی سب کچھ سنتی رہتی تھی۔

مغلیہ بادشاہوں کے آداب کا لحاظ یہاں قدم قدم پر ہوتا تھا، رکوع آتسلیموں کا طریقہ دستار سر پر اور بکلوس کمر میں جب تک نہ ہو، "غلامانِ زریں کمر" شاہی محلات کے حدود میں داخل نہ ہو سکتے تھے،،

(حوالہ: ۱۴۶ تا ۱۴۸ مشاہدات از ہوش بلگرامی)

نظام کے مزاج میں ہوش بلگرامی نے اتنی جگہ بنالی تھی کہ سازشی ٹولہ کے لئے ہوش کی ذات امید کی کرن بن گئی تھی، وہ کیا قدر مشترک تھا جس نے نظام کو ہوش سے اتنا قریب کر دیا تھا۔ یہ سوال بہر حال جواب طلب ہے مگر ایک وقت آیا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کا ستارہ عروج، زوال سلطنت آصفیہ تک زوال پذیر رہا۔ جس کا سہرا نواب دین یار جنگ کی ایمان افروز فرض شناسی اور ملک و ملت سے ان کی محبت کا یادگار باب ہے۔

ملک کے غدار اور کانگریس کے جاسوس کی حیثیت سے راز طشت از بام ہوا، بادشاہ سے رعایا تک کو اس کی خبر ہو گئی، ملک کے غدار اور کانگریس کے جاسوس کی حیثیت سے سب سے پہلے جو شخص پکڑا گیا وہ ہوش بلگرامی تھا۔ دربار سے رشتہ ٹوٹا، موٹر نشیں پیدل ہوگیا، سرکاری ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے گئے۔ آمدنی کے سارے وسیع تر ذرائع جو ایک حقیر انسان کو میسر تھے مسدود ہو گئے۔

پھرتے تھے میر خوار کوئی پوچھتا نہ تھا

ہوش کو اب پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ ہوش کا بھانڈہ پھوٹ چکا ہے۔ شاہ دکن سے دکن کی رعایا تک انہیں ملک کا غدار اور کانگریس کا جاسوس سمجھتی ہے۔ اس خصوص میں روزنامہ حمایت دکن نے ۸ رجب ۱۳۶۶ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۹۴۷ء کو ایک سخت اداریہ شائع کیا جس میں اخبار مذکور نے لکھا کہ

"ایک نیوز ایجنسی اس خبر کی ذمہ دار ہے کہ نواب ہوش یار جنگ بہادر نے معتمدی تعمیرات سے استعفا پیش کردیا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہم اس خصوص میں اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کہ ہم شاہ ذی جاہ کے پرستاروں اور وفاداروں کی خدمت کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں اور جہاں کہیں بھی غدّاری اور نمک حرامی کا ذرہ برابر بھی خیال گذرے تو ہم اس کی مخالفت بلا لحاظ اس کے اعزاز و مناصب کے کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں کیوں کہ غدّاروں سے جس حد تک مُلک پاک صاف ہو جائے اچھا ہے۔ شاہ ذی جاہ کے مصاحبین خاص اور معتمدین ایسے افراد ہونا چاہئیں جنہیں شاہ پرستی اور جذبۂ وفاداری کے سوا کچھ یاد نہ ہو۔ ان کا ہر فعل، ہر کام ملک اور مالک کی فلاح و بہبود کے لئے ہو، ہر آن مالک پر قربان ہوا کرے۔

نیوز ایجنسی کی خبر میں صداقت ہے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ملک جو اس دورِ ابتلا میں گزر رہا ہے اس میں آپ کا بھی ہاتھ ہے اور ایسے خطرناک

شخص کا ذمہ دارانہ خدمت پر برقرار رہنا خطرے سے خالی نہیں، بندگان اقدس و اعلیٰ کا ادنیٰ کرم تھا کہ ایک معمولی ہستی کو معتمدی کی جلیل القدر خدمت پر مامور کیا۔ ان ابدال شاہانہ کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہمیشہ ممنون احسان رہ کر وفادارانہ طور پر خدمت انجام دیتے، جس آستانہ بوسی کے صدقہ سے نواب بھی بنے اور امارت بھی ملی مگر اس کے خلاف کانگرس اور کانگرسیوں سے ساز باز کر کے غدّاری کی، اور متوقع تھے کہ انہیں اس وفاداری کے صلہ میں کانگرس میں عزت افزائی ہوگی اور مناصب سے سرفرازی ہوگی"۔

جب اقتدار و اختیار کی دنیا ان سے چھن گئی، عیش و آرام اور رنگینیاں ان کا ساتھ چھوڑ گئے تو ان کے پاس ان کی ذات سے وابستہ چند یادیں باقی رہ گئیں اور ان یادوں میں ان کی انا نے ان کو ہمہ دانی کے دھوکے میں مبتلا کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں مشاہدات کے نام سے ۴۴۵ صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔

اس کتاب میں پہلے تو اپنے وطن عزیز بلگرام کی داستاں لکھی بلگرام کے ہر فن کے کامل کا ذکر لکھا لیکن ساری داستاں میں اپنی اصل کا کوئی پتہ نہیں لکھا۔ ہوش بلگرامی۔ ماں باپ کا دیا ہوا نام نہ تھا۔ عماد الملک ہی نے ان کا تخلص ہوش رکھا اور وطن کی مناسبت سے بلگرامی ہوئے۔ ماں باپ کے رکھے ہوئے نام کا نہ ان کو پتہ تھا نہ اہل دکن کو۔ آصف سابع کو بھی ان کی اصل کی فکر تھی۔ تحقیق کے لئے ۳ آدمی بلگرام روانہ ہوتے۔ اصل میں نقل کی اطلاع پاکر آصف سابع بھی پھولوں نہ سمائے۔ ان کے ماضی میں گھنگھروؤں کی چھناچھن کا ذکر، پرانے دَور کی ڈومنی کی تصویر کو ابھارتا اور ان کی شخصیت کو اس تصویر کا تصور رنگ دیتا دیکھائی دیتا ہے۔

ہوش بلگرامی کے تعلق سے خود اس سازشی ٹولہ کے ثنا خواں

نواب صاحب چھتاری کا قلم بھی کہیں کہیں حق گوئی پر آمادہ نظر آتا ہے۔

"ہوش مرحوم حضور نظام کے مصاحبین میں سے ایک تھے، میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جب تک برٹش گورنمنٹ اور ریزیڈنٹ سے نظام پر دباؤ نہ ڈلوایا جائے یہاں کام نہیں چل سکتا۔ میں نے ان سے تو جواباً یہی کہا کہ ایسا کرنے سے مجھے حقِ نمک باز رکھے گا، مگر میں یہ سوچتا رہا کہ جب خود اعلیٰحضرت کے مصاحب ایسا مشورہ دیں تو اس کے دو ہی معنیٰ ہو سکتے ہیں یا ہوش خود اپنے آقا کے وفادارانہ تھے یا میری وفاداری کا امتحان مقصود تھا"

(حوالہ: یاد ایام حصہ سوم از نواب صاحب چھتاری ص ۷۵)

حیدرآباد میں چند لوگ نظام کے اسٹاف کے لوگ کہلاتے تھے غالباً ایسے لوگ سب ہی ریاستوں میں ہوں گے، ان کا کام تھا کہ جو کچھ حکمراں کی زبان سے نکلے وہ اسے بڑی آب و تاب کے ساتھ سراہیں اور اپنی طرف سے بڑھا کر تائید کریں۔

ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ شہزادہ معظم جاہ نے ایک بار مجھ سے ہوش یار جنگ کی شکایت کی کہ ہوش نے نظام کے حضور میں تمام اسٹاف کے سامنے اُن کی بیوی شہزادی نیلوفر کے متعلق ناشائستہ اور توہین آمیز الفاظ استعمال کئے اور معظم جاہ کو بجا طور پر اس سے تکلیف پہنچی۔ میں نے ہوش یار جنگ کو بلایا۔ یہ نظام کے اسٹاف میں تھے۔ اُردو اچھی لکھتے تھے، شاعر اور بہت چرب زبان تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ پرنس معظم جاہ کو شکایت ہے کہ تم نے سرکار کے سامنے پرنسس نیلوفر کے متعلق ناشائستہ اور توہین آمیز الفاظ استعمال کئے، ہوش نے اقرار کیا اور اپنی صفائی میں ایک قصہ سنایا جو بہت مشہور ہے۔

ایک رئیس اپنے باغ میں بیٹھے تھے، مصاحبین گرد و پیش ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ سامنے ایک کیاری میں بیگن لگے ہوئے تھے، رئیس صاحب نے

کہا کہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتے ہیں سبز درخت اور اس میں اودے رنگ کے پھل، بس پھر کیا تھا، درباریوں نے بینگن کی تعریف میں قصیدہ خوانی شروع کر دی اور اسے جنتی میووں کے قریب پہونچا دیا، یکا یک رئیس نے کہا کہ حکماء اس کو اچھی ترکاری خیال نہیں کرتے، طبعاً مفید نہیں ہے، درباریوں نے بھی رخ بدلا اور بیگن کی مذمت اور رسوائی میں مبالغہ شروع ہو گیا، ترکاری بد ذائقہ ہوتی ہے، خون غیر صالح پیدا کرتا ہے، درخت میں لگے ہوں تو یہ معلوم ہوتے ہیں کہ مردہ چوہے لٹک رہے ہیں، نہ صورت خوشنما نہ سیرت اچھی۔ رئیس نے کہا کہ ابھی تو آپ لوگ اتنی تعریف کر رہے تھے، اس پر ایک درباری نے کہا کہ حضور ہم آپ کے نوکر ہیں بیگن کے نہیں۔ اس کے بعد ہوش نے کہا کہ میں نظام کا نوکر ہوں جس کو وہ بُرا کہتے ہیں اُن سے زیادہ برا کہتا ہوں۔ جس کی سرکار تعریف کریں میں بھی قصیدہ خوانی شروع کر دیتا ہوں۔

(حوالہ: یاد ایام از نواب صاحب چھتاری حصہ سوم ص ۱۲۳)

صرف اسی ایک واقعہ سے ہوش کی سفلہ مزاجی کا پتہ چل جاتا ہے یہ بات مارچ ۱۹۳۶ء کی ہے۔

نظام نے جب دلی کا سفر کیا تھا ہوش بلگرامی ہمراہ تھے، دہلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھ کر نظام باہر نکل رہے تھے اور نظام کی سیکورٹی کے لوگ نظام کے اطراف حلقہ بنائے ہوئے تھے، (سیکورٹی اسٹاف تین حلقوں پر مشتمل ہوتا تھا اور نظام درمیان میں ہوتے) (ان دنوں جناب محمد رحمٰن خاں یوزی ساکن چنچل گوڑہ انسپکٹر آف سیکورٹی برائے رائل فیملی اور (V.I.P) تھے۔

جب بھی وائسرائے آتا، یا کوئی مہمان خصوصی یا نظام باہر نکلتے :ز سے ایک فٹ کے فاصلے پر جو شخص ان کے قریب ہوتا وہی محمد رحمٰن خاں

تھے)

نظام کو دیکھنے کے لئے اس قدر اژدہام تھا کہ تھالی پھینک دیتے تو زمین پر نہ گرتی۔ اس اژدہام میں ہوش بڑی کوشش سے نظام کے قریب پہنچنے کے لئے کوشاں تھے تاکہ اہل دلّی یہ جان سکیں کہ نظام سے انہیں کتنی قربت حاصل ہے۔ پہلا حلقہ توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ جناب رحمٰن خان بوزئی صاحب کو اطلاع ہوئی، انہوں نے اشارہ کیا کہ اسے آنے دو، اس طرح تیسرے حلقے میں وہ آگیا۔ جب ہوش تیسرے حلقے میں داخل ہوا حسب اشارہ کسی سیکورٹی آفیسر نے انہیں ہلکا سا دھکا دے دیا بس اب کیا تھا ان کا کندھا ذرا سا نظام سے ٹکرا گیا، نظام کی آواز بڑی گرج دار تھی، برہم ہو کر کہا "ہوش اندھے"۔

بس نظام کی زبان سے یہ ادھورا جملہ ادا ہوا اور ہاتھ پکڑ کر انہیں سیکورٹی کے تینوں حلقوں سے بے عزتی کے ساتھ باہر کر دیا گیا۔ ہزاروں لوگ جو وہاں موجود تھے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔

رحمٰن خاں بوزئی صاحب فرماتے تھے کہ اس واقعے کے بعد ایک مانے تک ہوش بلگرامی نے مجھ سے آنکھ نہیں ملائی۔

اس واقعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نظام سے قربت کے باوجود نظام ہوش کے حقیقی مقام سے بھی آگاہ تھے۔

ہوش بلگرامی کی کتاب مشاہدات جس وقت شائع ہوئی اس کا پیش لفظ کے یم منشی سے لکھوایا گیا جب کہ وہ وزیر زراعت اغذیہ حکومت ہند کے عہدے پر فائز تھے۔

اس مقدمے میں ہوش کے کانگرسی جاسوس ہونے اور نظام سے ان کی قربت کی آگاہی (جس قربت کی بنا پر ہوش کے خدمات سے

انڈین یونین نے استفادہ کیا) کا کھلا ثبوت ملتا ہے۔

"میں مشاہدات کا پیش لفظ لکھنے پر بڑی مسرت کے ساتھ آمادہ ہوا جو میرے حیدرآبادی دوست نواب ہوش یار جنگ کی ایک قسم کی سوانحی یادداشت ہے۔

مجھے مصنف سے ملنے کا موقعہ اس جنونی دور میں ملا تھا جب میں حیدرآباد میں حکومت ہند کے ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے اپنی سرکاری قیام گاہ "دلکشا سدن" میں رہتا تھا، اس وقت رضا کاروں کی جماعت کا ایک دشمن گروہ میرے اطراف گھیرا ڈالے ہوئے تھا اور قدم قدم پر جاسوس لگے ہوئے تھے اور میں چار دیواری میں بند رہنے پر مجبور ہو گیا تھا، ان حالات کو دیکھتے ہوئے میرا یہ فرض تھا کہ میں اس دیوار کو توڑ دوں جو لائق علی حکومت نے میرے اطراف کھڑی کی تھی اور اس خفیہ سازش کا بھی پتہ چلاؤں جو ہندستان کے خلاف ہو رہی تھی، اسی دوران میں مجھے مصنف کے متعلق علم ہوا"۔

یعنی کے، یم منشی ایجنٹ جنرل کو اس وقت یہ علم ہوا کہ سازشی گروہ کے سرغنے ہوش بلگرامی کے بغیر راز معلوم کرنا ممکن نہیں ہے، آگے وہ پیشِ لفظ میں لکھتے ہیں:

"ان دنوں وہ (ہوش بلگرامی) روزانہ نظام کی پیشی میں رہا کرتے تھے اور نواب دین یار جنگ کو توال وقت کو بھی یہ اعزاز حاصل تھا۔

نواب دین یار جنگ اور مصنف (ہوش بلگرامی) جو پکے درباری تھے نظام کے سامنے تو گہرے دوست دکھائی دیتے تھے لیکن ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد پالیسی کے حامل تھے۔ نواب دین یار جنگ۔ انڈین یونین کے سخت مخالف تھے"۔

اس طرح کے، یم منشی نے نواب دین یار جنگ کے دیندار اور با ایمان ہونے کی اور ہوش بلگرامی کے غدار وطن ہونے کی تصدیق کی،

"ہوش بلگرامی کی بول چال نہایت دلکش ہوتی ہے، وہ واقعات کے بیان کرنے میں بڑے مشاق ہیں اور گھنٹوں دل کو لبھانے والی گفتگو کر سکتے ہیں، نظام ہوش بلگرامی کو اپنی پیشی میں اس لئے رکھتے تھے کہ وہ نواب دین یار جنگ کا توڑ کر سکیں اور دوسری طرف نظام خود ان دلچسپیوں کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے، جو مصنف کی گفتگو پیدا کرتی تھی۔" سچ ہے ؎

ہزار شمع فروزاں ہوں روشنی کے لئے
نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کے لئے

آثار و قرائن کی بنیاد پر مضمون نگار نے جو نتائج بیان کئے ہیں اس کی تفصیل سے قبل اُن کے مضمون کے پہلے اس حصے کو پیشِ نظر رکھا جائے جو سازشی ٹولہ سے متعلق ہے تاکہ ان متعلقہ سطور میں یہ بیان مکمل ہو جائے۔

" یہ جماعت کوئی عوامی سیاسی جماعت نہ تھی، نہ یہ کوئی انجمن یا مجلس تھی، یہ ایک سازشی ٹولہ تھا، اس لئے بہادر یار جنگ کے خلاف کھلم کھلا کوئی تحریک ہندوؤں یا مسلمانوں میں نہیں چلا سکتا تھا دوسرے اس ٹولے کے افراد باہمدگر عزیز و رشتہ دار تھے اور ان میں عقائد اور مفادات کا اشتراک بھی تھا، ان میں سے بیشتر افراد ذہین و فریس بھی تھے اور اس ٹولہ کا ایک فرد (علی یاور جنگ) جو دراصل اس جتھے کا "دماغ" تھا اس کو بہادر یار جنگ "الذہین الخبیث" کہا کرتے تھے اور حیدرآباد کا ایک "امیر کبیر" سر سالار جنگ آخر جو خود کبھی ریاست کے سیاہ سفید کا مالک رہ چکا تھا اور جس کے خاندان میں وزارت عظمیٰ کا منصب جلیلہ گردش کرتا رہتا تھا۔ اس ٹولہ کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ وہ حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ کو اپنا خاندانی استحقاق سمجھتا تھا۔ اس ٹولہ کے کچھ افراد تو حکومت کے کلیدی عہدوں پر قابض تھے اور کچھ نظام کے دربار میں اثر و رسوخ رکھتے تھے، اس لئے ان کا طریقہ کار (MODUS OPERANDI)

یہ تھا کہ پہلے نظام کو بہادر یار جنگ کے خلاف بھڑکایا جائے، پھر حکومت کی مشینری کو حرکت دی جائے، جن آثار و قرائن کی بناء پر میں اس ٹولہ کو مورد الزام گردانتا ہوں وہ درج ذیل ہے۔

(الف) یہ ٹولہ بہادر یار جنگ کا ان کی ابتدائی سیاسی زندگی ۱۹۲۸ء سے آخر تک مخالف رہا۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں جب بہادر یار جنگ نے مسلمانان حیدرآباد کی سیاسی برتری کا اعادہ کیا تو اس ٹولے نے ان کی مخالفت کی۔"

"حیدرآباد کے مستقبل کی صورت گری قائداعظم کے ذہنی نقشہ کے مطابق ہوتی، جس میں اس ٹولے کا یقیناً کوئی مقام نہ ہوتا۔ اس کے برعکس یہ ٹولہ ریاست کی سیاست کو اپنے مفادات حاصلہ کے تحفظ کے خاطر اُسی ڈگر پر چلانا چاہتا تھا جس سے کانگریس سے رشتہ جڑتا اور قائد سے رشتہ ٹوٹ جاتا تھا لہٰذا اندرون حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد بہادر یار جنگ کی پوزیشن کا یہ استحکام اور ان کا یہ سیاسی عروج اس ٹولے کے گلے کا پھندا بن گیا تھا اور بہادر یار جنگ کا وجود اس گروہ کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا تھا اور ان کو یہ اندازہ ہوگیا کہ حالات ایک ایسے فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوگئے ہیں کہ بہادر یار جنگ کو مزید موقع ملا تو یہ جتھا ہمیشہ کے لئے قہر و مذلت میں گر جائے گا اس لئے بہادر یار جنگ کو ہٹا کر موجودہ اور آئندہ کے تمام مواقع اپنے لئے محفوظ کر لینا چاہئے۔ میری دانست میں بہادر یار جنگ کا یہ سیاسی عروج اس ٹولے کی گھناؤنی سازش کے باعث بنا اور اس نے اس نوبت پر یہ فیصلہ کیا کہ بہادر یار جنگ کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی انہیں ملک کے سیاسی نقشہ ہی سے نہیں، صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اور اس کے لئے اس نے پوری ذہانت اور عیاری سے کام لے کر بہادر یار جنگ کے ایک دوست کے گھر دعوت کے موقع کا انتخاب کیا اور حقہ کے کش کا انتظام کیا تاکہ

اصل مجرمین کے چہروں پر آخر وقت تک پردہ پڑا رہے اور کسی کا گمان بھی ان کی طرف جانے نہ پائے اور یہی مصلحت تھی حقے کو غائب کر دینے کی!

۳:۔ تیسرا اور سب سے محکم قرینہ، اس ٹولے کو مورد الزام قرار دینے کا یہ ہے کہ بہادر یار جنگ کی موت پر حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کوئی آنکھ ایسی نہ تھی، جو روئی نہ ہو۔ لیکن اس ٹولے کے سرگروہ (سر سالار جنگ آخر) نے اپنے محل (دیوان دیوڑھی) میں بہادر یار جنگ کی خبر رحلت سُن کر مٹھائی تقسیم کی ـــ اس واقعہ کا چشم دید گواہ اس امیر کبیر کا خادم خاص آج بھی حیات ہے اور کراچی (لانڈھی) میں سکونت پذیر ہے۔

۴:۔ بہادر یار جنگ کے وفات کے بعد، حیدرآباد میں جو سیاسی واقعات پیش آئے وہ بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ زہر خورانی کا یہ حادثہ اسی ٹولے کے کرتوتوں کا نتیجہ تھا۔ بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد سے سقوط حیدرآباد تک ریاست میں جو بعض اہم واقعات رونما ہوئے انہیں مختصراً درج کیا جاتا ہے۔

پہلا اور اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ابوالحسن سید علی صاحب نے جو بہادر یار جنگ کے بعد ان کے سیاسی جانشین اور مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہوئے تھے انہوں نے اپنی عاملہ اور مجلس شوریٰ کے علم و اطلاع کے بغیر ریاستی کانگریس کے ہندو لیڈر راما چاری سے سر سالار جنگ کی سرپرستی میں ان ہی کے محل میں خفیہ معاہدہ کرلیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک بہادر یار جنگ کی زندگی میں بھی چلی تھی اور خود انہوں نے ہندو لیڈروں سے متعدد بار مذاکرات کئے تھے لیکن ان مذاکرات میں کسی امیر کبیر نے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی، مگر بہادر یار جنگ کے انتقال کے بعد ابوالحسن سیّد علی اور راما چاری کے

مذاکرات سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں ہوئے اور ان کی موجودگی میں خفیہ معاہدہ طے پایا۔ کیا یہ سب امور معنی خیز نہیں ہیں۔

اس خفیہ معاہدہ کی وجہ سے ابوالحسن سیّد علی کے خلاف مسلمانوں کا شدید ردعمل ہوا اور انہیں صدارت مجلس اتحادالمسلمین سے مستعفی ہونا پڑا۔

آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کا "انعام" اس ٹولے کو کیا ملا؟ وہی جو وہ چاہتا تھا وہی بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد سے سقوط حیدرآباد تک یہ ٹولہ بدستور مملکت آصفیہ کے درو بست پہ چھایا رہا، کلیدی عہدے اور مناصب اسی کے قبضہ میں رہے، دربار میں بھی سرخرو رہا اور سرکار میں بھی۔ پھر سقوط حیدرآباد کے بعد بھی اس ٹولے کی چاندی ہی چاندی تھی۔ اس ٹولے کے افراد، بھارت میں گورنر سفیر اور وزیر بنے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس ٹولے کے کسی کارکن کا کوئی سیاسی کیریر نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی بھی کانگریس کا لیڈر تو کجا معمولی کارکن یا دوآنہ کارکن بھی نہ تھا۔ علمی قابلیت کے لحاظ سے سوائے ایک فرد کے کسی کے پاس نہ کوئی اعلیٰ ڈگری تھی نہ کوئی اعلیٰ معیار کا تجربہ، لیکن ان ہی میں سے ایک صاحب (زین یار جنگ) کے فرزند سعادت علی خاں جو لشتم پشتم میٹرک پاس کرسکے تھے اور انگلستان میں تین سال تک قیام رکھنے کے بعد باوجود وہاں سے کوئی معمولی ڈپلو ما سرٹیفکیٹ بھی حاصل نہ کرپائے تھے وہ بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو کے پارلیمانی سکریٹری بنے اور پھر اس سے بھی بلند تر عہدے پر سرفراز کیے گئے۔ آخر یہ کن "خدمات جلیلہ" کا انعام تھا؟ یہ انعام تھا حیدرآباد کی سیاست کو قائداعظم اور مسلم لیگ سے بےتعلق کرکے کانگریس سے نتھی کرنے اور اس طرح حیدرآباد کو پکے ہوئے پھل

کی طرح بھارت کی گود میں ڈالنے کا! اور یہ گروہ اس "خدمت جلیلہ" کو انجام دینے کے قابل اسی وقت ہوسکا جب کہ اس نے بہادر یار جنگ کا گلا زہریلے تمباکو کے دھوئیں سے گھونٹ دیا! اسی لئے میں کہتا ہوں کہ حیدرآباد (۱۷ ستمبر ۴۸ء کو نہیں۔ ۲۵ جون ۴۴ء کو ختم ہوگیا جب بہادر یار جنگ نے آخری ہچکی لی)

فَاعتَبِروا یا اُولی الابصار"

لائق مضمون نگار نے سازشی ٹولہ میں شامل جن لوگوں کا ذکر کیا ہے بلاشبہ وہ اس جرم کے شریک ہیں اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۹۳۸ء سے سازشی ٹولہ برابر مصروف بکار رہا اور یہی وہ ٹولہ ہے جس کے افراد، پولس ایکشن کے بعد بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوئے۔

اس سازشی ٹولہ کے خدمات جلیلہ کے باعث حیدرآباد کو پکے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی گود میں ڈالنے کا سہرہ ان ہی قوم فروشوں کے سر ہے اور اسی ٹولہ نے بہادر یار جنگ کا گلہ زہریلے تمباکو کے دھوئیں سے گھونٹ دیا۔ کچھ نام درپردہ بھی ہیں جو اس سازشی ٹولے کے رکنِ رکین رہے ہیں۔

علی یاور جنگ کا بھی اس میں ذکر ہے اس تعلق سے خود ہوش بلگرامی نے لکھا ہے کہ

"اتحادی قائدین علی یاور جنگ کے داؤ پیچ سے گھبراتے تھے اور ان کو اس کا اندیشہ لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کس دن یہ بنی بنائی عمارت کو ڈھادیں اور کس وقت ایسا چکمہ دیں کہ اتحادی چاروں خانے چت ہوجائیں دونوں منافقت سے ملتے جلتے تو تھے اور ٹیلیفون سے باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں مگر دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کا موقع تلاش کرتے رہتے تھے،، (حوالہ: مشاہدات از ہوش بلگرامی ص ۳۸۵)

اس طرح علی یاور جنگ کے سازشی مزاج کا ہوش بلگرامی نے کھلے عام اعتراف کیا ہے۔ ہم لاکھ کوشش کے باوجود نواب صاحب شطاری کے اس سازشی گروپ سے تعلق خاطر کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انہوں نے سازشی ٹولہ کے خلاف اہل دکن کے احساسات نفرت کو ملکی غیر ملکی کے زیر عنوان ایک نیا راستہ دیا ہے اور جگہ جگہ اس سازشی ٹولہ کے افراد کی تعریف کی ہے۔

"میں نے حضور نظام کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن حیدر آباد جانے میں ذہنی خلجان تھا۔ حیدر آباد کے متعلق عجیب خبریں مشہور تھیں، درباری سازشیں جو شخصی حکومت میں ہونا لازمی ہیں، حکمراں کی مداخلت، ملازمین گروہ بندی وغیرہ"۔ (حوالہ: یاد ایام ص ۵)

"میں نے اپنے عہدے کا جائزہ پہلی ستمبر ۱۹۴۱ء کو لیا۔ اگست کے مہینہ میں روزانہ اجنبی حضرات کے خطوط حیدر آباد سے آتے تھے، جو متضاد پند و نصائح اور مشوروں سے پُر ہوتے۔ درباری سازشوں کے قصہ، گروہ بندی کی کہانی بڑی آب و تاب سے بیان کی جاتی تھیں۔ درباری سازشوں کا سرچشمہ نواب کاظم یار جنگ کو بتایا جاتا تھا۔ وہ معین انصاری کیبنٹ کے سکریٹری تھے) کے طرفدار تھے۔ یہ بعد کو معین نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ یہ دونوں حضرات ملکی گروہ کے قائدین میں سے تھے۔"

یعنی ملکی گروہ کی قیادت کرنے والے بہ ایمان لوگ نواب صاحب چھتاری کی نظر میں درباری سازشی تھے۔

"غیر ملکی حضرات میں بلگرامی خاندان کے لوگوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ خاندان تین۳ پشت سے حیدر آباد میں رہتا چلا آرہا تھا۔ نواب عماد الملک مرحوم سے لیکر اس زمانے تک جب میں گیا حیدر آباد کی قابل قدر وفادارانہ خدمات اس خاندان کی تھی مگر غیر ملکی دھبہ نہیں

مٹا تھا، اس خاندان کے لوگوں میں نواب علی یاور جنگ کے ساتھ خاص طور پر حسد اور بدگمانی تھی، نواب علی یاور جنگ کی بہت ممتاز شخصیت تھی، ان کی علمی قابلیت، فہم اور زمانہ شناسی حیدرآباد میں بے مثل تھی۔ وہاں وزیر بھی رہے اور حیدرآباد کی تباہی کے بعد حکومت ہند نے U.N.O میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے بھیجا"

(حوالہ: یاد ایام از نواب صاحب چھتاری ص ۷۶)

نواب صاحب چھتاری کا راست ربط و تعلق اسی سازشی ٹولہ کے ساتھ رہا کیوں کہ وہ بھی واردھا کے فسوں گر کے چرن چھونے والوں میں سے ایک تھے۔

"۶ رجون ۴۷ء کو دہلی گیا۔ مہاتما گاندھی جی سے ملا۔ میں نے کہا کہ مہاتما جی جب پہلی بار چھ برس ہوئے میں حیدرآباد گیا تھا تو آپ نے مجھے مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ اب میں پھر حیدرآباد جارہا ہوں، آپ کی آشیرواد چاہتا ہوں۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ ان کی آشیرواد اس شرط کے ساتھ ہے کہ حیدرآباد کے لوگوں کو خوش رکھوں۔ میں نے کہا مسز نائیڈو حیدرآباد کی ہیں ان سے پوچھئے اور یوپی کے متعلق پنتھ جی سے پوچھئے کہ میں نے کبھی فرقہ وارانہ نظر سے کوئی کام کیا۔ رخصت ہوتے وقت مہاتما جی نے کہا، خوش رہو، خوش رکھو۔ مہاتما جی نے ایسا جامع اور پر معانی فقرہ کہا کہ جسے میں کبھی نہ بھول سکا۔

(حوالہ: یاد ایام از نواب صاحب چھتاری ص ۲۲۳)

ایک حافظِ قرآن اور ایک مسلم ریاست کا صدر اعظم، گاندھی جی سے آشیرواد لے۔ اس سے بڑھ کر اس شخص کی اپنی قوم اور متعلقہ ریاست کے مسلم مفادات سے غداری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

اَب ذرا قائدِ اعظم سے متعلق بھی ان کی تحریر پر غور مطلوب ہے۔

"مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی، ان کا طرز گفتگو بالکل یک طرفہ تھا۔ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ سرسی پی راما سوامی آیر (جو ریاست ٹراونکور کے دیوان تھے) کی طرح حکومت ہند سے مجھے بھی لڑنا چاہیئے۔ میں نے یہ بھی کہدیا کہ میں پنڈت نہرو سے بھی ملوں گا، بس اس پر بگڑ گئے اور کہا تم اس مغرور سے مل کر کیوں اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو۔

شام کے ساڑھے چار بجے پنڈت جی سے ملا — وہ چپ سنتے رہے، کہا کچھ نہیں،" ہوا وہی جو قائد اعظم نے کہا تھا۔

۱۷ر جون ۴۷ء کو صبح سردار پٹیل سے نواب صاحب چھتاری ملے اور ان سے کہا کہ

"آپ کی پارٹی کے مقامی لیڈر سرکار کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ پہلے ان کا کام فقط شورش پھیلانا تھا اور اب انتظام کرنا اور ہر شورش کو روکنا ان کا فرض ہے"۔

(حوالہ: یاد ایام از نواب صاحب چھتاری ص ۲۲۵ سے ۲۲۷)

سردار پٹیل نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

سردار پٹیل کا آشیرواد لے کر واپس ہوئے، سردار پٹیل سے ان کی جو گفتگو ہوئی وہ یہ کہ کانگرسیوں کا کام پہلے شورش پھیلانا تھا، اس میں وہ کامیاب ہو چکے ہیں، اب انتظام حکومت ان کے ہاتھوں میں آئے گا اس لئے اب ہر شورش کو روکنا کانگرسیوں کا کام ہونا چاہیئے۔

ان چند حوالوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ نواب صاحب چھتاری کو مسلم مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ ایک مرعوب ذہنیت کے قوم پرست مسلمان تھے اور گانگریس کے ایجنٹ، یہی وجہ تھی کہ ازابتدا تا انتہا یہ سازشی ٹولہ کا اور کانگریس کا ساتھ دیتے رہے۔

سازشی ٹولہ، اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا اور کامیاب

بھی۔ اسباب مخالفت میں صرف سازشی ٹولہ کے مفادات کا متاثر ہونا ہی شامل نہ تھا اور بھی اسباب دعوامل تھے۔ سازشی ٹولہ تو مطلوب تھا۔ مقصود کا۔ آگے اس پر بحث ہوگی۔

قائد ملت کے رفیق خاص مولوی عبدالرحمٰن سعید نے ایک چونکا دینے والی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ :

"شنبہ کا دن تھا۔ درسِ اقبال سے فارغ ہوکر نواب صاحب بعد نماز مغرب ہاشم علی خاں صاحب رکن عدالت العالیہ کی دعوت میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔ موٹر میں سوار ہونے تک میں ڈیوڑھی پر موجود تھا، جوں ہی نواب صاحب اپنے میزبان کے بنگلہ پر پہنچے حُقہ کی خوشبو محسوس ہوئی۔ نواب صاحب کی آمد کے ساتھ ہی حقہ تازہ کرنے کی غرض سے اٹھالیا گیا۔ تازہ حقہ نواب صاحب کو پیش کیا گیا جس کے پہلے ہی کش سے حلق میں پھندا پڑا۔ سانس رک گئی اور موت واقع ہوگئی

نواب صاحب کی حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد میں غیر معمولی مقبولیت سے حضور نظام کے خوشامدی درباریوں نے ان کو باور کرایا کہ نواب صاحب کا وجود تخت وتاج کے لئے خطرہ ہے، اس خطرہ نے سازش کی بنا ڈالی اور ہاشم علی خاں کی دعوت میں سازش کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس حادثہ کے ذمہ دار آصف جاہ سابع اور ان کے درباری ہیں کہ نہایت مہلک زہر حُقہ میں دیکر ملّت کی ایک بیش بہا نعمت کو تاراج کر دیا گیا۔ کسی متنفس کو احتجاج کی ہمت نہیں ہوئی۔ ابوالحسن سید علی نے جو بجا طور پر احتجاج کرنے کے موقف میں تھے ہمّت ہار دی اور تحقیقات کے مطالبہ تک سے گریز کیا کہ مبادا گرفتار کر لئے جائیں۔ بہر حال اس سازش کا پس منظر یہ ہے کہ بیرونی پریس کے کسی کثیر الاشاعت رسالہ میں میر عثمان علی خاں کی دولت مندی کا

افسانہ شائع ہوا اور تصویر نواب صاحب کی چھاپ دی گئی۔ وہ رسالہ آصف جاہ کی خدمت میں اس رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا گیا کہ باہر کی دنیا میں نواب اپنے آپ کو مملکت آصفیہ کا حکمراں ثابت کرا رہے ہیں، یہ ایک دستاویزی ثبوت تھا جس نے میر عثمان علی خاں کو ان کی ہلاکت پر آمادہ کیا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی سازش کی ایک اہم کڑی تھی۔"

(حوالہ: مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید (سعید صدیقی)

اس باب میں سازشی ٹولہ کے تعلق سے جتنی حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے اس سے کوئی بھی واقف انکار نہیں کر سکتا، سازشیوں کی یہ مختصر فہرست ہے، ساتھ ہی سیاسی عوامل میں بہادر یار جنگ کی شہادت کا پسِ منظر اور وسیع تر ہے۔

ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ نظام کی رعایا پوری طرح نظام کی گرفت میں تھی۔ جاپانی عوام کی طرح دکن کے عوام بھی بادشاہ کی ذات کو قابل پرستش سمجھتے تھے۔ علماء، امراء، مشائخین اور سربراہ حکومت شخصیتوں کی ہر حرکت پر نظام کی نظر تھی۔ نظام ان کے شخصی خیالات، خاندانی حالات، کمزوریوں اور خوبیوں سے پوری طرح واقف تھے اور ہر ہر لمحہ کی انہیں خبر ملتی رہتی تھی۔

یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ دکن کی سیاست کا محور، والی ریاست نواب میر عثمان علی خاں کی مزاج شناسی کے سیاسی دائرے میں محدود تھا، بدقسمتی یہ تھی کہ ان کی شخصی اور نجی کمزوریوں کے باعث، ان کی مزاج شناس شخصیتوں میں جو لوگ شامل تھے وہ ایک خاص مکتب فکر کا حامل ٹولہ تھا جس کا تعلق مفادات حاصلہ سے تھا ان کے مزاج کے مطابق انہوں نے سفلہ نوازی کو شعار بنایا۔ جس کے باعث یہ سازشی ٹولہ قریب سے قریب تر ہو گیا۔ لیکن یہ ماننا پڑیگا

کہ نظام کی مرضی اور منشا کے بغیر مطلوب انسان (سازشی ٹولہ) اتنا بڑا اقدام کرنے کی جرأت تو بڑی بات ہے ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

تجزیہ حالات و واقعات کی روشنی میں کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کٹ پتلی کا ناچ ہوا۔ ناگ نے اذان دینے والے سفید مرغ کے گلے کو ڈس لیا۔ مؤذن حق کی آواز سدا کے لئے خاموش ہوگئی مگر ڈور کے کنارے پر رقص کرنے والے سانپ اور کٹھ پتلی، ناچتے رہے۔ ڈور کے کنارے پر، ہر دور میں ہر بادشاہ نے نت نئے اشارے پر ڈور کے کنارے پر کٹھ پتلی کو نچایا ہے۔ حقائق پر نقاب تھی اس لئے یہ عنوان آج تک حقائق کی کھلی کتاب نہ بن سکا۔

کیسے سمجھوں کہ لب بام نہیں ہے کوئی
جب میں روتا ہوں تو ہنسنے کی صدا آتی ہے

کیا یہ حقیقت نہیں کہ
جو کسی کے قتل میں شامل نہ تھے
وہ بھی دھبے خون کے دھوتے رہے

اپنے مضمون کے چوتھے فقرے میں فاضل مضمون نگار نے حکومتِ برطانیہ کے اس سازش میں ملوث ہونے کے خیال کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک نظریہ یہ ہے کہ زہر خورانی کا یہ واقعہ برطانوی حکومت کے اشارۂ چشم و ابرو کا نتیجہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی حکومت بہادر یار جنگ سے سخت ناراض تھی اور یہ ناراضگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب دوسری جنگ عظیم کے چھڑ جانے کے بعد بہادر یار جنگ نے مساعی جنگ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی مہم چلائی تھی۔"

ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے بانی گاندھی جی کو

برطانوی حکومت نے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ سینے سے لگایا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بہادر یار جنگ کو زہر دے دیا۔

" علاوہ ازیں خود قائداعظم نے ۱۹۴۳ء کے وسط میں بہادر یار جنگ کو وائسرائے کے مشیر برائے ریاست ہائے ہند سر فرانسس وائیلی سے دہلی میں ملایا تھا۔ یہ بڑی اہم سیاسی ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں سر فرانسس وائیلی بہادر یار جنگ کی سیاسی فراست و تدبر سے بے حد متاثر ہوا تھا اور اس کے بعد اس نے وائسرائے کو جو مشورہ دیا تھا اس کی وجہ سے بہادر یار جنگ اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں برطانوی حکومت کی پالیسی کا رُخ تبدیل ہو گیا۔"

اس بیان میں تین نکات بیان کئے گئے ہیں:

" بہادر یار جنگ نے مساعی جنگ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی مہم چلائی تھی،، جو مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ البتہ قائداعظم نے اس خصوص میں بیان جاری فرمایا تھا کہ وار کونسلز اور نیشنل وار فرنٹ کی کمیٹیوں میں مسلمان شریک نہ ہوں۔ اس طرح قائداعظم نے مسلمانوں کو مساعی جنگ میں حصہ لینے سے منع فرمایا تھا۔ اس خصوص میں ریاستی مسلمانوں کا موقف سیاسی حیثیت سے بھی جدا تھا۔ قائد ملت نے قائداعظم سے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اختلافی نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی اور قائداعظم سے اس کے لئے رہنمائی چاہی۔

وار کونسلز اور نیشنل وار فرنٹ میں شریک نہ ہونے کی نسبت آپ کے جو بیانات اخبار میں شائع ہوئے ہیں ان کو پڑھ کر ریاستی مسلمان مجھ سے دریافت کر رہے ہیں کہ ان کو حدود ریاست کے اندر اپنے رئیس کی امداد کے لئے اس قسم کی کمیٹیوں میں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں۔ میں ذاتی طور پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ آپ نے جس بنیاد پر

برطانوی ہند کے مسلمانوں کو مساعی جنگ میں حصہ لینے سے منع فرمایا ہے وہ ریاستوں سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ آپ بجا طور پر یہ خیال فرماتے ہیں کہ جب تک حکومت ہند میں مسلمانوں کو مؤثر اشتراک عمل کا موقعہ نہ ملے ہمارا برطانوی ہند میں جنگی مساعی میں حصّہ لینا قطعاً نامناسب ہے لیکن ریاستوں میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، وہاں مسلمانوں کا برطانوی حکومت سے راست تعلق نہیں ہے، ان کے رؤسا حکومتِ برطانیہ سے چند معاہداتی ذمہ داریاں رکھتے ہیں اور حکومتِ برطانیہ کی امداد پر مجبور ہیں۔ اب اگر مسلمانانِ ریاست مساعی جنگ میں امداد سے دریغ کرتے ہیں تو یہ انکار حکومت برطانیہ سے نہیں ہوتا بلکہ اپنے رئیسوں کے مقابلہ میں انکار بن جاتا ہے۔ اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جن ریاستوں میں رئیسوں نے مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ کیا ہے اور کبھی ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا وہاں مسلمانوں کو ان کی امداد سے روکنا نامناسب ہوگا۔

امید کہ آپ بعجلت ممکنہ جواب مرحمت فرماکر مجھے ممنون فرمائیں گے۔

(حوالہ: خط موسومہ قائداعظم خط نمبر ۱۳۴ مؤرخہ ۴ رجولائی ۴۲ء ص ۳۳۱، ۳۳۲، مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی)

قائداعظم جب قائد ملت کی رائے سے متفق ہوئے تو نواب صاحب نے مساعی جنگ میں انگریزوں کی امداد میں پوری دلچسپی سے حصہ لیا۔ یہ ان کے سیاسی تدبّر کا ثبوت تھا۔ " برطانیہ ہند کے طول و عرض میں حالات کی رفتار حکومت کے ارباب حل و عقد کو دعوت فکر دے رہے ہیں، اس حصّہ ملک کا سیاسی مرتبہ شدید انقلابی دور سے گذر رہا ہے۔ خواہ "ویسٹ منسٹر قانون" کے مطابق ہی کیوں نہ ہو وہ آزادی حاصل کرنے کے قریب ہے " (حوالہ: بہادر یار جنگ کی سیاسی تقاریر، مرتبہ نذیرالدین احمد ص ۱۶۵، ۱۶۶، ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد)

ایسی صورت میں وہ انگریزوں کی حربی کارخانوں کے ذریعے امداد کے زیر عنوان، یہ چاہتے تھے کہ حیدرآباد میں آلات حرب کے کارخانے قائم ہوں تاکہ مابعد جنگ جب ہندوستان سے انگریز چلا جائے تو حکومت حیدرآباد اس قابل رہے کہ اپنی ضروریات اور تحفظ کے لئے کسی کا محتاج نہ رہے۔ مجلس اتحاد المسلمین نے اس خصوص میں اپنی یادداشت حکومت کو پیش کی، جو سیاسی بصیرت کی آئینہ دار تھی۔

یادداشت

موجودہ فوجی امداد وقار مملکت کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی

ف ۱۔ حکومت مسلمانانِ حیدرآباد کے اس مستحکم ایقان سے ناواقف نہیں کہ ہٹلریت کے خلاف برطانیہ کی مہیب کشمکش نہ صرف اس کی حریت کی بقا کی خاطر بلکہ اس کے ہر اتحادی اور حلیف کے تحفظ کے لئے جاری ہے مسلمان اس حقیقت کو معلوم کر کے مطمئن اور مسرور ہیں کہ حیدرآباد کے فوجی اور دیگر وسائل اپنے حلیف کی اعانت کے لئے وقف کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن خلق اس امر کا ہے کہ یہ اعانت مملکت کے وقار کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔

آلاتِ حرب کے کارخانے فوراً قائم کئے جائیں

ف ۲۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حیدرآباد کی حربی طاقت اور حق اسلحہ سازی پر خواہ کسی نوعیت کے ہوں بروئے معاہدات کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ عہد ماضی کی حکمت عملی میں سہل انگاری کے باعث حیدرآباد کو اپنی مدافعت کے لئے بیش از بیش

برطانوی حلیف کا دست نگر ہونا پڑا اور نتیجۃً آج بڑی ندامت کے ساتھ ہم مشاہدہ کررہے ہیں کہ حیدرآباد کے نام سے ایک حقیر فوج محاذ جنگ پر جاتی ہے جس کے لئے تعجب ہے کہ آلات حرب تمام وکمال ممالک غیر سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مجلس کی رائے میں باعتبار اقتضائے وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جہاں تک فوجی امور کا تعلق ہے حکومت کے موجودہ طریقہ عمل کا جائزہ لیا جائے اور ملک میں حکومت کی جانب سے بلا تاخیر بہ تعداد کثیر کارخانوں کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ جدید حربی ضروریات کے مطابق مملکتی افواج کے لئے آلات حرب مہیا ہوسکیں۔ ایک واضح حقیقت ہے کہ تاوقتیکہ اس کا انتظام نہ ہو اہلِ ملک بکمال شوق جنگ میں حصہ لینے کے لئے زیادہ سے زیادہ قوت نہیں صرف کرسکتے اس لئے مجلس اپنی رائے میں مناسب تصور کرتی ہے کہ وہ ساری مالی اعانت جو جنگ کے سِلسلہ میں حکومت یا اہل ملک کی جانب سے حاصل ہو فوجی طاقت کی توسیع اور مجوزہ حربی کارخانوں کے قیام کیلئے استعمال کی جائے۔

اس اسلامی مملکت کی حربی طاقت کے از سر نو قیام کے لئے مسلمان ہر قربانی کیلئے تیار ہیں

۴۔ زائد فوج اور حربی کارخانوں کے لئے اشخاص کی فراہمی کے علاوہ مجلس اتحاد المسلمین اپنے اراکین میں سے ضرورت کے مطابق رضا کاروں کی مناسب تعداد مہیا کرنے پر بھی آمادہ ہے جو نہ صرف ملک کا امن و امان برقرار رکھے بلکہ میدان جنگ کی فوج کے لئے محفوظ دستہ کا کام انجام دے سکے گی۔ مجلس کامل وضاحت کے ساتھ بیان کردینا چاہتی ہے کہ اسلامی مملکت کی حربی طاقت کے از سر نو قیام کی خاطر مسلمانانِ حیدرآباد

ہر قربانی اور ایثار کے لئے بے چینی کے ساتھ آمادہ ہیں تاکہ ایک طرف اس ضرورت کے وقت اپنے حلف کی پوری ساز وسامان کے ساتھ اعانت کرسکیں اور دوسری طرف اندرونِ ملک بدامنی کی صورت میں قیام امن کے فرائض بجالائیں۔

حیدرآباد خود مختار رہا ہے، وہ موجودہ پست حالت پر قانع نہیں رہ سکتا۔

۵۔ دوسرا مسئلہ جو کسی طرح کم اہم نہیں، حیدرآباد کی آزادی اور اقتدار کا ہے جس کی جانب مجلس کی توجہ مرکوز ہے۔ ۱۷۲۴ء میں جب سے کہ حضرت نظام الملک آصف جاہ اول نے جنوبی ہند میں اپنی آزادی کا اعلان فرمایا حیدرآباد خود مختار رہا ہے۔ سلاطین حیدرآباد نے اپنی اسی آزادانہ حیثیت میں ضرورت کے وقت برطانیہ کی مدد کی اور اس سے تحائف کا رشتہ قائم کیا۔ دونوں حکومتوں کے درمیان جو معاہدات طے پائے ان کی کوئی دفعہ ایسی نہیں کہ حیدرآباد کو اس کی موجودہ حیثیت تک گھٹا دے جو اس کے وقار کے منافی اور اقتدار کے مغائر ہے۔ یہ تصور موجودہ نسل کے لئے سخت تکلیف دہ ہے کہ حیدرآباد اپنی اس حلیف طاقت کی بدولت اس پستی کو پہنچ گیا ہے جس کی ہمیشہ اس نے آڑے وقتوں میں مدد کی۔ وہ اپنی موجودہ حالت پر قانع رہنے کے لئے آمادہ نہیں جو عہد ماضی کے ایک ناگوار دور کی وراثت ہے۔ حیدرآباد کو وہ پھر ایک بار قوی اور آزاد دیکھنے کے لئے بیتاب ہے تاکہ بلا مزاحمت استبدادی عمل درآمد کے پنجہ سے آزاد ہو کر حیدرآباد حیاتِ نو حاصل کرسکے۔

مملکتِ حیدرآباد خود ہی اپنی قسمت کی تعمیر کرے گی

۶۔ برطانوی ہند کے طول وعرض میں حالات کی رفتار حکومت

کے ارباب حل وعقد کو دعوت فکر دے رہی ہے۔ اس حصہ ملک کا سیاسی مرتبہ شدید انقلابی دور سے گزر رہا ہے، خواہ "ویسٹ منسٹر قانون" کے مطابق ہی کیوں نہ ہو وہ آزادی حاصل کرنے کے قریب ہے جب انگلستان برطانوی ہند کے ساتھ جس نے پوری شدت سے حکومت کی مخالفت کی ہے یہ سلوک کرسکتا ہے تو حیدرآباد جیسا یار وفادار اپنے حلیف کی جانب سے کم از کم اس کا متوقع ہے کہ وہ اس کو اپنی قسمت کی تعمیر اور اپنے ہمسائے یعنی ہندوستان کی آئندہ مقبوضاتی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلق قائم رکھنے کے لئے تنہا اور آزاد چھوڑ دے۔

حیدرآباد کی سابقہ خود مختارانہ حیثیت عود کرآنی چاہیئے

۷۔ یہ امر بھی ناقابل فراموش ہے کہ برطانوی ہند سے حیدرآباد کے تعلقات، معاہدات کی بنیاد پر قائم ہے اور مجلس کی رائے میں ان معاہدات کی جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دفاعی اور تجارتی ہیں۔ اس وقت کوئی اہمیت باقی نہیں رہ سکتی جب کہ برطانیہ براہ راست ان فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہ رہے جو فریق معاہدہ کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر جس لمحہ ہندوستان کو مقبوضاتی مرتبہ حاصل ہوجائے، حیدرآباد کی اپنی سابقہ خود مختار حیثیت عود کرآئے گی اور مقبوضاتی حکومت کے ساتھ جدید معاہدات طے کرنے میں وہ بالکلیہ آزاد ہوگا۔

حیدرآباد کو اسکے سارے سابقہ علاقے واپس ملنے چاہئیں

۸۔ برطانیہ ہند کو مقبوضاتی مرتبہ ملنے کی صورت میں چوں کہ یہی امور اس کے ناگزیر مضمرات ہوں گے اس لئے سب سے

پہلا مسئلہ جو حکومت حیدرآباد کی توجہ کو مرکوز کرسکتا ہے وہ مفوضہ علاقوں کے استرداد کا ہے جو برطانوی حکومت کو ان امدادی افواج کے مصارف کی پابجائی کے لئے تفویض کئے گئے تھے جو اس کے اغراض کے لئے اندرونِ مملکت متعین کی گئی ہیں۔ ملک کے ان مجبور کن حالات کا وجود اب باقی نہیں رہا جن کے تحت گذشتہ زمانہ میں حیدرآباد نے اپنے بعض علاقوں کا نظم و نسق دفاعی اغراض کے لئے برطانوی حکومت کے سپرد کردیا تھا۔ کیوں کہ اب حیدرآباد ان علاقہ جات کا خود انتظام کرسکتا ہے اور اپنے محاصل کے ذریعہ زائد فوج کے اخراجات بھی برداشت کرسکتا ہے جس کی حال اور مستقبل میں اس کو ضرورت ہے۔ مجلس حکومت حیدرآباد سے امید کرتی ہے کہ ہندوستان کو مقبوضاتی مرتبہ عطا ہونے سے بہت قبل ان مسائل کی نسبت کارروائی کا آغاز کرکے اطمینان بخش نتائج کے حصول کی کوشش فرمائے گی۔

الف۔ مجلس ۱۔ حکومتی افواج میں توسیع۔ ۲۔ حربی اسلحہ سازی کے کارخانوں کے قیام کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہے تاکہ اس جنگ کے دوران میں برطانیہ کی خاطر خواہ اعانت کرسکے اور جنگ کے خاتمہ کے بعد اس کی حربی طاقت خود اس کی دفاع کا موجب ثابت ہو۔

ب۔ مجلس اس اضطراب کے ساتھ حکومت حیدرآباد سے وقت کی اس اہم ترین ضرورت کے پیش نظر برطانوی ہند کو مقبوضاتی مرتبہ ملنے کی توقع پر حسب ذیل امور کی نسبت حکومت برطانیہ سے گفت و شنید آغاز کرنے کا شدید مطالبہ کرتی ہے۔

۱۔ امدادی افواج کی برخواستگی جن کو حکومت برطانیہ نے حکومت آصفیہ کے مصارف پر حدود مملکت میں متعین رکھا ہے اور نتیجتاً مقبوضہ علاقہ جات کا استرداد۔

۲۔ برطانیہ کے ساتھ حلیفانہ تعلقات کی اس طرح تجدید کہ جس کے ذریعے حیدرآباد کی داخلی اور خارجی آزادی اور انفرادیت کا تیقن حاصل ہو جائے ۔

خاتمہ پر مجلس اس حقیقت کو پوری شدت کے ساتھ ظاہر کر دینا چاہتی ہے کہ اپنے بیدار سیاسی شعور کے ساتھ مسلمانان حیدرآباد و نیز مسلمانانِ ہند حیدرآباد کے تخت و تاج کو اپنی سیاسی برتری کا مظہر تصور کرتے ہیں ۔ اور اس کی حریت و انفرادیت کی بقا کے لئے والہانہ شوق و اخلاص کے ساتھ ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہیں۔ اس لئے حکومت حیدرآباد کا مقدس فریضہ ہے کہ عظیم تر ہندوستان میں حیدرآباد کی آئینی حیثیت کے دوبارہ حصول میں متذکرہ صدر طریقہ کے مطابق کسی کوشش اور کسی ایثار سے دریغ نہ فرمائے ۔

مجلس کمال عقیدت کے ساتھ دست بدعا ہے کہ ان پیشِ نظر مقاصد کی پیش رفت میں خدائے مسبب حکومت کو کامل بصیرت اور قوت عطا فرمائے ۔

اگر یہ مناسب موقعہ ہاتھ سے نکل جائے یا حکومت بہ اقتضائے وقت سعی بلیغ سے قاصر رہے مجلس کو یقین ہے کہ مسلمانانِ حیدرآباد ہند میں ایسی صورت حال کے باعث جو ناگزیر ردعمل ظہور پذیر ہوگا اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی ۔

"بہادر یار جنگ صدر مجلس اتحاد المسلمین"

پہلی بار جنگ کے زمانے میں مجلس کی جانب سے حصول آزادی کے سلسلے میں اتنے سخت الفاظ میں اظہار مدعا کیا گیا ۔

ساتھ ہی امداد جنگ کے سلسلے میں قائد ملت نے مجلس جاگیرداراں میں جو یادگار تقریر فرمائی اس تقریر میں بھی انگریزوں کے خلاف

تاریخ کے حوالوں سے ریاست حیدر آباد کی امداد کے جواب میں انگریزوں کے مکر و فریب کا تذکرہ اور ہندوستان کے مقبوضاتی درجہ حاصل کرنے سے قبل حیدر آباد کی آزادی کے مسئلہ پر سیر حاصل تقریر فرمائی تھی، انگریز اور نظام دونوں ہی ان خیالات سے سیاسی عدم سلامتی اور آثار بغاوت کے احتمال کی صورت کو پیش نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس دوران نواب صاحب کی ہر حرکت پر کڑی نظر رکھی گئی تھی اور ان کے چاروں طرف خفیہ جال بچھا دیا گیا تھا۔ تقریر کا عنوان اگرچہ امداد جنگ تھا اور سرکاری قرارداد کی تائید کے لئے نواب صاحب کو مدعو کیا گیا تھا اس موقعہ سے نواب صاحب نے پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

دوستو! آج ہم جس مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ جب سے برطانیہ کے باشندے ہندوستان میں آئے اور ہمارے درباروں میں تاجروں کی طرح حاضر ہو کر ہماری امداد کی خواہش کی اس دن سے ہم ان کی برابر مدد کرتے رہے ہیں۔ دو سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ انگریزوں پر کبھی ایسا برا وقت نہیں آیا جس میں ہم نے ان کی دستگیری نہ کی ہو۔ ٹیپو سلطان کے مقابلہ میں ان کی بے چارگی ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کی پریشانی ہم سے دیکھی نہ گئی اور ہم نے اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں اپنی ساری طاقتوں سے ان کی امداد کی اور ہندوستان میں رہنے کے قابل بنایا۔ برطانوی مدبر اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر ہماری امداد شامل نہ ہوتی تو ہندوستان کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم میں ہم نے نہ صرف اپنی فوجیں دیں اپنا روپیہ دیا اور اپنے تمام وسائل سے مدد کی بلکہ ترکوں کی انگریزوں سے مخالفت ہونے

کے باوجود ہماری اخلاقی امداد اور جلالۃ الملک خسرو دکن کی شاہانہ اپیل نے ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں سے منحرف ہونے نہ دیا۔ ان سارے واقعات کی روشنی میں ہمارا آج کا اجتماع جناب صدر کی پرزور اپیل اور راجہ محبوب کرن بہادر کا پیش کیا ہوا رزولیوشن ہماری روایات کے عین مطابق ہے اور ہماری قدیم شرافت کا آئینہ دار ہے۔

اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کا حلیف ہم سب کا حلیف ہے ارشاد ہمایونی بلالحاظ مذہب و ملت ہم سب کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے اس لئے ہم اپنا فرض تصور کرتے ہیں کہ اس جنگ میں اپنے حلیف کی پوری پوری مدد کریں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس رزولیوشن کو پورے جوش کے ساتھ منظور کریں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آپ کی چشم و ابرو کی جنبشوں سے آپ کے قلب کے ارتعاش کا پتہ لگا رہا ہوں اور میرے تصور کے کان اِن آوازوں کو سُن رہے ہیں جو آپ کے قلب کی گہرائیوں میں اٹھ رہی ہے۔ آپ بامروت ہیں اور عقلمند اور میں شوخ ہوں اور دیوانہ، آپ سوچتے ہیں مگر کہتے نہیں اور میں اپنے جذبات کو چھپا نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ ہماری گذشتہ دوسو سالہ امدادوں کا کیا بدلہ ملا۔ اور آج ہم کیا توقع کر سکتے ہیں؟ آپ کے دل سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ کیا ہم اپنے عہدوں کو پورا کرتے ہوئے دوسروں کی بنیادوں کو مضبوط نہ کرتے گئے! اور کیا اس کے بدلے میں آہستہ آہستہ ہماری طاقت کمزوری اور ہماری آزادی پابندی سے نہیں بدلتی گئی۔ کیا دوستی ہی دوستی کے پیرایہ میں ہم کو ایک کمزور ترین قوم اور ملک نہیں بنایا گیا! کیا ہماری گذشتہ جنگ عظیم میں ہماری امداد کے بدلہ میں لارڈ ریڈنگ کا دلخراش اور انصاف کش مکتوب نہیں ملا اور اگر

یہ حقیقت ہے تو ہم آئندہ کیا توقع کر سکتے ہیں! میں چاہتا ہوں کہ آپ کے شبہات کو دور کروں اور آپ کو اس قابل بناؤں کہ آپ قلب و دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ اس وقت برطانیہ عظمیٰ کی مدد کریں اور صرف فرمانِ خداوندی کی تعمیل اور اپنے جذبات کے خلاف تعمیل آپ کے پیشِ نظر نہ ہو!

جنگ کے مقاصد

آپ کو واقف ہو جانا چاہیئے کہ گذشتہ جنگ کے مقاصد اور آج کی لڑائی کے مقاصد میں بہت بڑا فرق ہے۔ آج کی لڑائی حق و صداقت کیلئے لڑی جا رہی ہے۔ برطانیہ کے حل و عقد نے ایک سے زیادہ مرتبہ اعلان کیا ہے کہ وہ معاہدات کا احترام کرانے کے لئے لڑ رہے ہیں اور اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت برطانیہ اور اس کے حلیف چھوٹی قوموں کی آزادی کے لیئے لڑ رہے ہیں۔ ان واضح اور صاف مقاصد جنگ کی موجودگی میں آپ کے ان تمام شبہات کو دور ہو جانا چاہیئے جو اس وقت آپ کو منقبض کر رہے ہیں اور آپ کو یقین رکھنا چاہیئے کہ ہماری یہ امداد سابقہ کی طرح رائیگاں نہیں جا سکتی۔ جنگ کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں، فتح یا خدانخواستہ شکست، ہم کو برطانیہ کی طاقت سے زیادہ ان کی نیت اور مقاصد سے توقع ہے کہ وہ اس جنگ میں اس کی کامیابی کے ضامن ہوں گے اور ہم اس کی کامیابی کے اس لئے متمنی ہیں کہ ہماری قسمتیں اس سے وابستہ ہو گئی ہیں اس کی فتح ہماری زندگی ہے اور اس کی شکست ہماری تباہی۔ ہم کسی دوسرے فاتح سے وہ توقع بھی نہیں کر سکتے جو آج ہم کو حکومتِ برطانیہ سے ہے اگر آپ سمجھ گئے ہیں کہ فتح یقینی ہے تو یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ سب سے پہلی چیز جو ہو گی وہ یہ ہے کہ حسب وعدہ حکومتِ

برطانیہ ہندوستان کو قانون وسٹ منسٹر کے مطابق مقبوضاتی مرتبہ عطا کر دے گی۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہیں کہ ہندوستان میں مخالف حکومتِ برطانیہ کی جو کوششیں پچاس برس سے جاری ہیں بار آور ہوں گی۔ اور برطانیہ اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمن کو آزادی کا پروانہ دے گا، کیا اس حالت میں آپ توقع کر سکتے ہیں کہ دشمنوں کو پروانہ آزادی دینے والی حکومت اپنے دوستوں کو مشورے، ایماء اور اشارے کی نازک زنجیروں میں مقید اور پابند رکھے گی، ہرگز ممکن نہیں۔

کامل آزادی اور بیرونی مداخلتوں کی موت

اس جنگ کی کامیابی حیدرآباد میں ہماری بیرونی مداخلتوں کی موت کا پیغام ہوگی اور حیدرآباد اپنے تمام مسائل اندرونی میں کامل آزاد اور صرف اپنے بادشاہ کی مرضی کا تابع ہوگا۔

ہندوستان کو مقبوضاتی مرتبہ ملنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اَب ہمارے اطراف راست برطانوی حکومت کی بجائے ہندوستانی حکومت کارفرما ہوگی اور یہ امر مسلم ہے کہ ہمارے تمام معاہدات تاج برطانیہ کے ساتھ ہیں۔ مقبوضاتی مرتبہ کے ساتھ ہندوستان کو اختیارات مدافعت بھی کاملاً مل جائیں گے اور ہم نے اپنی مدافعت کے اختیارات اپنی رضامندی سے تاج برطانیہ کے تفویض کئے تھے۔ ان تمام حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا چوں کہ حکومت برطانیہ راست ہماری مدافعت کے قابل نہ ہوگی اور اس بات کے ہم مجاز ہیں اور ہوں گے کہ جدید ہندوستانی حکومت سے جس قسم کے تعلقات مناسب سمجھیں قائم کریں۔ اس لئے لازمی طور پر وہ تمام معاہدات منسوخ ہو جائیں گے جو ہم نے مدافعت کے سلسلہ میں تاج برطانیہ سے کئے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ

چوں کہ اب خود ہم کو اپنی مدافعت کا سامان کرنا ہوگا اس لئے وہ تمام مقبوضات جو ہم نے مدافعتی افواج کے اخراجات کے لئے یا کسی اور طریقہ پر انعاماً و عطاءً تاج برطانیہ کے تفویض کئے تھے ہم کو واپس مل جائیں گے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ جنگ کے وہ لازمی نتائج ہیں جن سے کوئی معاہدات کا احترام کرنے والی حق و صداقت کے لئے قربانی کرنے والی قوم انکار نہیں کر سکتی۔

فتح کا تیسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم نے اپنے اطراف اور جوانب پر چھائی ہوئی اور ہم کو چاروں طرف گھیری ہوئی جس طاقتور حکومت کو اپنے بیرونی تعلقات کا اختیار تفویض کیا تھا چوں کہ وہ ہمارے اطراف راست کارفرما نہ ہوگی اس لئے خود بخود سارے معاہدات باقی نہ رہیں گے جو بیرونی تعلقات کے سلسلہ میں تاج برطانیہ کے ساتھ کئے گئے اور ہم ایسی آزاد مملکت ہوں گے جس کو یہ اختیار ہوگا کہ تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی غیر متزلزل دوستی کو قائم رکھتے ہوئے دنیا کی دوسری طاقتوں کے ساتھ جیسے تعلقات چاہیں قائم کریں میں چاہتا ہوں کہ ان حقائق کی روشنی میں آپ اپنے قلب کے ان تمام شکوک کو رفع کریں جو اس وقت پیدا ہو رہے ہیں اور ان حقیقتوں کو استواری کے ساتھ اپنے قلب میں پرورش کرتے ہوئے جلالۃ الملک کے ارشاد کی تعمیل میں اس جنگ میں حکومتِ برطانیہ کی امداد کریں۔

میں آپ کے قلب کے اس دوسرے شبہ کو بھی جانتا ہوں کہ آپ سوچ رہے ہیں کہ اگر خدانخواستہ برطانیہ کو شکست ہوئی اور ہندوستان پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی، ہندوستان میں نزاع پیدا ہوگیا اور ہمارا ملک ان خطرات سے دوچار ہونے لگا جو آج ہم کو دور نظر آرہے ہیں تو معاہدات کی روشنی میں جو حکومت برطانیہ نے ہم سے کئے ہیں ہم اس

سے کس امداد کی توقع کر سکتے ہیں؟ خصوصاً جب کہ معاہدات کی رو سے برطانیہ
اس وقت ہماری امداد پر مجبور نہیں ہے جب کہ اس کی فوجیں دوسری طرف
مشغول ہیں کیا ہم اتنے طاقتور ہیں کہ ایسی طوائف الملوکی کا مقابلہ کریں۔
میں اس شبہ کو آپ کی موجودہ امداد میں خارج نہیں تصور کرتا
کیوں کہ آپ کی حکومت آج بھی مجبور نہیں ہے کہ آپ کی فوجی طاقت میں
اضافہ نہ کرے۔ یہاں حکومت کو چاہیئے کہ حالت کی نزاکت کا اندازہ
کرتے ہوئے فوراً اپنے یہاں سامان حرب تیار کرنے والے کارخانے
قائم کرے اپنے توپ کے سانچے بندوق سازی کے ٹوٹے ہوئے کارخانوں
کو دوبارہ زندہ کرے اور اپنے ملک کو اس قابل بنائے کہ اپنے حلیف
کی اس پریشانی میں بوقت ضرورت اپنی آپ حفاظت کر سکے، ہم کو
یقین ہے اور برطانیہ سے اس یقین کے قائم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے
کہ جو آلات حرب ہم تیار نہیں کر سکتے اور جن کی موجودہ زمانہ میں شدید
ضرورت ہے مثلاً ہوائی جہاز، مشین گن، دبابے، ہوائی مدافعت کے سامان
انٹی ایر کرافٹ توپیں وغیرہ، وہ ہم کو فراہم کیئے جائیں گے بلکہ بعجلت
ممکنہ فراہم کیئے جائیں گے۔ کیوں کہ زمانہ کی رفتار خطرات کو کچھ زیادہ
دُور نہیں بتا رہی ہے اس کے علاوہ خود ہم جاگیرداروں کا فریضہ ہے
کہ حکومت برطانیہ کی ممکنہ مدد کریں، ملک کے لئے ایک ایسی شہری
فوج تیار کریں جو اندرونی خلفشار کی صورت میں ہمارے کام آئے
مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ خود جاگیرداروں کی نوجوان اولاد نے
اپنے آپ کو فوجی خدمت کے لئے پیش کیا ہے۔ ہمارا شیوہ ہمیشہ سے
سلاطین آصفیہ کی عماری کے سامنے دادِ شجاعت دینا ہے اور آج
بھی ہم کو اپنا یہ فرض یاد ہے۔

برادرانِ طبقہ! اب مجھے یقین ہے کہ اس رزولیوشن کو

جو آپ کے سامنے پیش کیا گیا منظور کرنے میں آپ کو کوئی تامل نہ ہوگا، لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو آپ کے بھائی کی طرح نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے ان قلبی جذبات کو جس کی میں نے اس وقت ترجمانی کی اپنے قلوب کے صندوق میں بند رکھنا چھوڑ دیں۔ تاریخ کے ہر دور میں آپ حکومت کی ریڑھ کی ہڈی رہے ہیں اور آج بھی کسی طبقہ کو سب سے زیادہ حکومت کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کا حق ہے تو وہ آپ ہی کا طبقہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں آپ میں ایک بیداری کی لہر دیکھ رہا ہوں۔

ایک سال قبل جب کہ خطرہ آپ کے دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹا رہا تھا، آپ سو رہے تھے اور آپ کی نیند موت کے خواب سے بھی بد تر نظر آ رہی تھی لیکن آج سات ہزار میل دور خطرہ کو دیکھ کر اس کا احساس پیدا کرنا اور اس کے مقابلے کے لئے تیار ہونا ہر طرح قابل مبارکباد ہے یہ خطرہ گذشتہ خطرہ سے یقیناً عظیم تر ہے۔

ہم کو اس جنگ میں امداد دیتے ہوئے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری امداد دور جا رہی ہے۔ انگلستان کا میدان جنگ ہمارے محاذ کا پہلا مورچہ (یعنی فرسٹ لائن آف ایکشن) ہے اور اس مورچہ کی مضبوطی اور کامیابی پر ہمارے آخری مورچہ کے تحفظ کا انحصار ہے۔

میری یہ تقریر کسی پریشان یا مصیبت زدہ حلیف کے سامنے پیش کردہ شرائط نہیں ہے۔ ہماری امداد غیر مشروط ہے کیوں کہ ہم فطرتاً اور اپنی جبلی شرافت کی وجہ سے اپنے حلیف کی امداد پر مجبور ہیں اور ہمارے آقائے ولی نعمت امداد کر رہے ہیں تو ہماری امداد میں کوئی شرائط نہیں ہو سکتے۔ میری یہ تقریر آپ کے شبہات کے ارتفاع اور مستقبل کے متعلق آپ کے یقین کے اضافہ کے لئے ہے اور اپنے حلیف کی یاد کی تازگی اور اس کے جذبات شرافت صداقت کو ابھارنے کیلئے ہے۔

بحمداللہ اب حیدرآباد میں اتنا شعور پیدا ہو چکا ہے کہ کوئی ناسمجھ سے ناسمجھ آدمی میرے ان خیالات کو تنہا میرے خیالات نہیں قرار دے سکتا یہ ملک اور خصوصاً طبقہ جاگیرداران کے ہر ایک فرد کے قلب کی آواز ہے جس کو نظر انداز کرنا برطانیہ کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کوئی طوفانی سمندر کا کشتی شکستہ مسافر اس تختہ کو نظر انداز کر دے جس کے سہارے وہ موجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور جس کو باقی رکھ کر ہی وہ ساحل مراد تک پہنچ سکتا ہے۔

(حوالہ: بہادر یار جنگ کی سیاسی تقاریر، مرتبہ نذیرالدین احمد ص ۱۷۰ تا ۱۸۰
ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، چیلہ پورہ، حیدرآباد)

"حیدرآباد کی معاہداتی دوستی اور وفاداری کے بدلے میں حکومتِ برطانیہ نے جن طفل تسلیوں سے نظام اور رعایا نظام کو خوش کرتی رہی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے اور جدوجہد کو تیز تر کرنے کے موزوں وقت پر یہ اعلان کیا کہ "حیدرآباد اپنی حکومتِ برطانیہ کے ساتھ تاریخی دوستی کا صرف ایک معاوضہ چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ حیدرآباد کے معاہدات کا احترام کرے اور اس کی آزادی کو تسلیم کرے۔"

سر فرانسس ویلی مشیر وائسرائے برائے ریاست ہند سے بلاشبہ ۱۹۴۳ء میں نواب صاحب کو متعارف کیا اور وہ پہلی بار بہادر یار جنگ کی سیاسی بصارت وبصیرت سے آگاہ ہو سکا۔ ساتھ ہی اس کو اس امر کا بھی اندازہ ہو گیا کہ انگریزوں کے ہندی مسلمان دانشوروں میں سب سے زیادہ باشعور دشمن صرف اور صرف نواب صاحب کی ذات ہے۔ یہ سمجھنا کہ اس ملاقات کے باعث نواب صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں برطانوی حکومت کی پالیسی کا رُخ بدل گیا تھا، سراسر غلط ہے۔

سرفرانسس وائیلی سے قائدملت نے فرمایا تھا کہ
"مجھے کہا جاتا ہے کہ میں مخالف برطانیہ ہوں۔ میں آج آپ کو اس کے متعلق وہی جواب سنانا چاہتا ہوں جو میں نے دہلی میں وائسرائے کے مشیر سیاست سرفرانسس وائیلی کو دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ
" میں مخالف برطانیہ ہوں اور نہیں ہوں، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے ہندوستان پر برطانیہ کے تسلط کو ناپسند کرنا اور ہندوستان کی آزادی کی تمنا رکھنا اور اس کو برطانوی اقتدار سے جس قدر جلد ہو آزاد کرانے کی کوشش کرنا میرا فطری حق ہے اور مجھے اس پر ناز ہے جس طرح ایک آزادی پسند محب وطن انگریز کو اپنے اس جذبہ پر ناز ہو سکتا ہے کہ اس کا وطن جرمنوں کے تسلط سے محفوظ رہے کیا کوئی انگریز اس کو برداشت کرے گا کہ فرانس جرمنی اس پر حکومت کرے اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اس کو میرے اس جذبہ آزادی کی قدر کرنی چاہیئے"

(حوالہ: تقریر شائع شدہ رہبر دکن، مؤرخہ ۲۰ر مارچ ۱۹۴۴ء)

سرفرانسس وائیلی سے اس ملاقات کے بعد نواب صاحب کا نام انگریزوں کے مخالف مسلم زعماء میں سرفہرست آگیا۔

حیدرآباد کا ریزیڈنٹ تو سارے ممالک محروسہ میں اگر انگریز کا کسی کو دشمن سمجھتا تھا تو وہ نواب صاحب کی ذات تھی۔

نواب میر معظم حسین (رئیس جنگ نبیرہ فخرالملک) جو ریزیڈنٹ کے پرسنل سکریٹری تھے ان سے ایک راز کے واقعہ کا علم ہوتا ہے۔

آزادی ہند کے اعلان کے بعد جب ریزیڈنٹ حیدرآباد سے جارہا تھا اس وقت ایک الماری جس میں راز کے کاغذات تھے۔ نواب میر معظم حسین کے حوالے کیں اور کہا کہ مجھے تم پر بھروسہ ہے

یہ سارے کاغذات جلا دینا۔

اس الماری کے ایک خانے میں ساری کی ساری فائلیں نواب بہادر یار جنگ سے متعلق تھیں، اس کے یہ معنی ہوئے کہ نواب صاحب کی شہادت کے بعد بھی ان کے اعصاب پر نواب صاحب کی انگریز دشمنی کا خوف طاری تھا۔

سکندر آباد کی میلاد کمیٹی کے زیر اہتمام کربلا میدان میں ہر سال ماہ ربیع الاول میں میلاد کمیٹی سکندر آباد کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتا تھا جس کمیٹی کے صدر خاں بہادر احمد علاء الدین (احمد نواز جنگ) تھے۔

قائد ملت کی زبان بندی کی مدت کے ختم پر اور نظام کے تقریر کرنے کے فرمان جاری کئے جانے کے بعد میلاد کمیٹی سکندر آباد نے نواب صاحب کی زیر صدارت جلسہ میلاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کی اشاعت کے بعد ریزیڈنٹ نے معتمد میلاد کمیٹی کے نام مراسلہ جاری کیا جس میں مرقوم تھا کہ حدود ریزیڈنسی میں نواب بہادر یار جنگ کو تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اقطاع ہند میں جو شخص تقریر کر سکتا ہے جو برطانوی علاقہ ہے وہی شخص کنٹونمنٹ کے علاقے میں تقریر نہیں کر سکتا۔ ہزار کوششوں کے باوجود اجازت نہیں دی گئی، مسلمانوں نے احتجاجاً جلسہ ملتوی کر دیا۔

دوسرے سال بھی یہی صورت پیش آئی لیکن اس بار یہ رعایت دی گئی کہ بہادر یار جنگ اپنی تقریر قلمبند کر کے جلسہ میں پڑھیں اور اس کی ایک کاپی ریزیڈنٹ کو روانہ کریں۔ نواب صاحب نے تقریر قلمبند کر کے پڑھنے سے انکار کر دیا۔

اس بار حکومتی کوششوں کے باعث جلسہ ملتوی نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ جلسہ نظام کی ایما پر منعقد کیا گیا تھا تاکہ ریزیڈنٹ کا مقام

متاثر نہ ہو۔

مولانا مظہر علی کامل نے اپنی تقریر کے بعد ایک قرارداد مذمت پیش کی "حیدرآباد و سکندرآباد کا یہ عظیم الشان جلسہ حکومت سکندرآباد کے اس فعل کو سخت غم و غصہ کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس سال بھی اس نے نواب بہادر یار جنگ کی تقریر صدارت کی اجازت نہیں دی حالانکہ نواب صاحب کو نہ صرف ممالک محروسہ سرکار عالی میں تقریر کی عام اجازت ہے بلکہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے مرکزوں میں نواب صاحب کی تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ حکومت سکندرآباد کا نواب صاحب کو کسی اقرار کا پابند کرنا، اس جلسہ کی رائے میں غلط ہے اور مسلمانوں کی دل آزادی کا باعث ہے۔

یہ جلسہ میلاد کمیٹی کے اس فعل پر اپنی بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے طریقۂ عمل کو قابل مذمت قرار دیتا ہے کہ ایک مذہبی جلسہ میں حکومت سکندرآباد کی اس مداخلت کو کمیٹی نے آسانی کیساتھ برداشت کرلیا۔ (حوالہ: یادداشت (غیر مطبوعہ) از رفیق قائد ملت جناب سیّد یوسف تصوّر صاحب مرحوم ص ۲۰۲ تا ۲۱۳)

ہاشم علی خاں کے گھر دعوت میں ریذیڈنٹ کی جانب سے جو خاتون نمائندہ موجود تھیں اس کا ذکر آخری باب میں موجود ہے۔ ویسے یہ خیال کہ "انگریزوں کے گاندھی جی جیسے مخالف کو زہر نہیں دیا گیا"، تو بہادر یار جنگ کو برطانوی حکومت زہر کیوں دیتی، برطانوی حکومت نہیں مقامی ریزیڈنٹ اس سازش میں شریک تھا۔ ریاستوں میں جو مظالم، بادشاہوں اور راجاؤں نے اپنی رعایا پر کئے ان کا شمار بھی مشکل ہے اور خود مضمون نگار نے ریذیڈنٹ کے بارے میں اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ

" ان اختلافات کا دوسرا بڑا سبب ریزیڈنسی تھی، ریزیڈنٹ

کی حیثیت آئین و معاہدات کی رو سے برطانوی سفیر کی سی تھی لیکن برطانوی حکومت کی ڈپلومیسی نے رفتہ رفتہ ریزیڈنٹ کو سفیر سے بڑھا کر نظام کا "سیاسی نگراں کار" (POLITICAL CONTROLLER) بنا دیا تھا۔ ریزیڈنٹ کو یہ مرتبہ کیسے حاصل ہوا۔ یہ بجائے خود تاریخ حیدرآباد کا ایک دلدوز باب ہے اور اس کی تفصیلات میں جانا موضوع زیر بحث سے خارج ہے۔ بہرحال یہ امر واقعی تھا کہ ریزیڈنٹ نہ صرف برطانوی سفارت کی نگرانی کیا کرتا تھا بلکہ مملکت حیدرآباد کے اندرونی سیاسی معاملات میں بھی ملوث تھا اور نظام پر اس کا خاصا دباؤ رہتا تھا۔ بہادر یار جنگ کی کوئی تقریر یا سیاسی سرگرمی ریزیڈنٹ کو ناگوار گذرتی تو وہ فوراً نظام پر اثر انداز ہوتا اور عثمان علی خاں کا ایک عتاب نامہ بہادر یار جنگ کے نام صادر ہو جاتا ان دو اسباب کے سوا نظام کے عتاب کا کوئی تیسرا سبب نہ تھا۔ نہ میرے علم میں ہے۔"

مندرجہ بالا مضمون سے ریزیڈنٹ کے نواب صاحب سے شدید جذبۂ انتقام کا پتہ چلتا ہے اور وہ سر فرانسس وائیلی ملاقات صرف خوش فہمی بن کر رہ جاتی ہے۔

بدقسمتی سے نظام اور قائد ملت کے تعلق سے اس جرم میں نظام کے بری الذمہ ہونے کے باب میں مضمون نگار کا خیال بڑی حد تک خیالی اور قیاسی ہے اور روایاتی شاہ پرستی نے مضمون نگار کے قلم کو گمراہ کر دیا وہ لکھتے ہیں:

"۵:۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس حادثہ میں حیدرآباد کے آخری حکمراں میر عثمان علی خاں کا ہاتھ تھا کیوں کہ بہادر یار جنگ ان کے مخالف تھے اور نظام ان کے وجود کو اپنے تخت و تاج کے لیے

خطرہ تصور کرتے تھے ۔ اس گروہ نے نظام اور بہادر یار جنگ کے ظاہری تعلقات کو خصوصاً خطاب و جاگیر کی واپسی کے واقعات کو (جو بہادر یار جنگ کی زندگی کے آخری ایام میں رونما ہوئے) ذہن میں رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے ۔ نظام اور بہادر یار جنگ کے باہمی تعلقات کی مفصل تاریخ تو یہاں بخوف طوالت بیان نہیں کی جا سکتی لیکن اس کا لب لباب یہ ہے کہ ان کے درمیان سخت اختلافات بھی پیدا ہوتے رہتے اور پھر صفائی بھی ہو جاتی تھی ۔ ان اختلافات کے بنیادی اسباب دو ہی ہوا کرتے تھے ایک یہ کہ نظام کے اطراف مصاحبین کا ایک ایسا گروہ تھا جو انہیں قائد مرحوم کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکاتا رہتا تھا کہ بہادر یار جنگ حقیقتاً ان کے وفادار نہیں ہیں ۔ حُسنِ اتفاق سے ایک دوسرا اتنا ہی با اثر گروہ ایسا بھی تھا جو اس قسم کے شرانگیزیوں کا فوراً ازالہ کر دیا کرتا تھا "۔

غرض جاگیرداری سے بہادر یار جنگ ازخود دست بردار ہوئے لیکن نظام دکن سے ان کے تعلقات کا اس واقعے سے خاتمہ نہیں ہو گیا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ نظام قائد مرحوم کے ذاتی دشمن تھے ۔ جو گروہ اس خیال کا حامی ہے وہ تو یہی کہتا ہے کہ نظام نے پہلے تو جاگیر چھین لی پھر ان کی جان لے لی مگر یہ ہوائی باتیں ہیں ۔

بلکہ بہادر یار جنگ کی زندگی کے آخری دور میں تو عتاب کے بجائے نظام دکن نے واپسی خطاب و جاگیر تک کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا ذکر بہادر یار جنگ کے مکتوب بنام قائد اعظمؒ میں بھی ملتا ہے ۔ (دیکھئے مکاتیب بہادر یار جنگ ص ۴۳۹ مکتوب ص ۴۲۹)

خفگی و ناراضی کے مواقع پر بھی میں قائد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہوں اور بعض مرتبہ ایسے موقعے بھی آئے کہ ان

سے بالکل تنہائی میں نظام دکن کی افتاد طبیعت اور ان کی ریاست سے متعلق تفصیلی بات چیت ہوئی۔ میں نے انہیں بعض وقت با چشم گریاں، نہایت دلگیر و دل گرفتہ اور نظام پر سخت تنقید کرتے ہوئے بھی پایا لیکن انہوں نے کسی مرتبہ بھی یہ نہیں کہا یا یہ تاثر نہیں دیا کہ نظام ان کی جان کے درپے ہیں یا انہیں کوئی جسمانی آزار پہنچانے والے ہیں۔

آخری زمانے میں خطاب و جاگیر کی واپسی کا جو واقعہ پیش آیا اس کے متعلق بھی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ نظام نے ناراض ہو کر قائد مرحوم کی جاگیر اور خطاب چھین لئے تھے اور ان کی تقریر پر پابندی عائد کر دی تھی۔ حقیقت یوں ہے کہ نظام نے جاگیر و خطاب چھینے نہیں تھے بلکہ خود قائد مرحوم نے انہیں واپس کر دیا تھا۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ زہر خورانی کے اس اندوہناک واقعہ میں نظام کا ہاتھ ہو"

قائد ملت نظام کے فرمان ۸ ستمبر ۱۹۴۱ء کی روشنی میں یا تو مسلمانوں کے قائد کی حیثیت سے مظلوم اور بے سہارا انسانوں کی خدمت انجام دے سکتے تھے یا جاگیردار کی حیثیت سے برقرار رہ سکتے تھے۔

(تفصیل کیلئے دیکھئے سوانح بہادر یار جنگ جلد دوم ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ مصنفہ نذیر الدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، حیدر آباد)

جاگیر اور خطاب سے دست برداری کے بعد نواب صاحب نے اپنی تقریر میں نظام کے عدم اعتماد اور اپنی وفاداری اور خطاب و جاگیر سے دست برداری کو پروانہ آزادی سمجھا اور صاف صاف اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ "تعلیمات اسلام میں ایک بڑی قربانی نہت سول

کی طرف سے فدیہ کا کام نہیں دی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں میری طرف سے جو ہوگا وہ سب معاشدار ارکان مجلس کا فدیہ تصور کیا جائیگا۔

میں اپنے مالک کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے معاشدار رہنے یا سیاست میں حصہ لینے کا انتخاب خود ہماری صوابدید پر چھوڑا۔ اب سوچنا چاہیئے کہ آیا میں بحیثیت معاشدار ہر قسم کی سیاسی کوشش سے الگ رہ کر اپنے مالک کا حق نمک ادا کرسکوں گا یا وقت آگیا ہے کہ سیاسیات حاضرہ سے متعلق رہ کر میں اس نمک خواری کا حق ادا کروں جس کا شرف میری پانچ پشتوں کو نصیب رہا ہے۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ امتحان وفا کا وقت ہے۔ مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خود غرض، تن آسان بندۂ زر اور نمک حرام نہ ہوگا۔ اگر میں اس زمانہ میں محض اپنی جاگیر اور اعزاز کے خیال سے مالک اور ملت و ملک کی خدمت گذاری سے روگردانی کروں۔ یہ تو بہت مبارک ہوا کہ اب دیوانہ کوئے محبت جیب و دامن کی فکر سے بھی آزاد ہو رہا ہے۔ میں اس کو اپنے لئے نہ کوئی پابندی سمجھتا ہوں نہ سزا بلکہ یہ تو میرے لئے پروانہ آزادی ہے۔ پابندی بھی ایک سزا ہوتی ہے اور میں کسی سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ کسی شاعر نے میرے ہی لئے کہا ہے ؎

وفا خطا تھی خطا میں نے زندگی بھر کی
اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

میں آج اپنی پانچ پشتوں کے کھائے ہوئے نمک کو حلال کر رہا ہوں اور نہایت مسرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ؎

بیا جاناں تماشہ کن کہ در انبوہ جاں بازاں
بصد ساماں رسوائی سر بازار می رقصم

تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خوں خوار می رقصم

انشاء اللہ زمانہ خود بتادے گا کہ میں کیا ہوں اور میں نے کس طرح اقتدار شاہی کا تحفظ کیا ہے اور یہ میری خدمات نہ کسی بڑی تنخواہ کی خاطر ہیں اور نہ منصب و جاگیر و خطاب کی خاطر!

" میرے آشیانے پر بجلی چمک رہی ہے، اس کو جل جانے دو، تمہارے لئے یہ مبارک فال ہے، یہی ابر تمہارے گلشنِ حیات پر برسیں گے اور بہت جلد اس میں بہار آئے گی۔ میں اپنے اجڑے ہوئے آشیانے کی خاکستر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اٹھاؤں گا، ہوائیں چل رہی ہیں، ابر چھٹیں گے۔ آفتابِ امید چمکے گا اور دنیا دیکھے گی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور باطل کے پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے "

ایک قریبی شخصیت نے پوچھا (جب جاگیر اور خطاب واپس کر دیا) یہ کیا کیا؟ تو نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے جواباً ارشاد فرمایا ؎

آ گئے تھے برق کی زد میں تمام اہلِ چمن
ہم نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

مضمون نگار کا یہ بیان کہ "بہادر یار جنگ از خود دست بردار ہو گئے۔ لیکن نظام دکن سے ان کے تعلقات کا خاتمہ نہیں ہوا اور پہلے نظام نے جاگیر لی اور پھر جان لی یہ ہوائی باتیں ہیں۔ نظام قائد مرحوم کے ذاتی دشمن نہیں تھے"، قبل اس کے کہ عتاب واپسی خطاب والی بات چھیڑی جائے ایک اور بات جس کا ذکر مضموں نگار کے مضمون میں نہیں ہے وہ بھی نظام کی قائد ملت سے بے پناہ محبت کا ثبوت ہے۔

قائد ملت کو شہر بدر کرنے کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، نواب صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی، قبل اس کے کہ احکام جاری ہوں انہوں نے خود ہی شہر حیدرآباد کو خیرباد کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اور پورے انتظامات بھی۔ نظام کو راز کے ذرائع سے اس کا علم ہوا اور اس خصوص میں ۱۵ ار مارچ ۱۹۴۲ء کو "یک دوکلمہ" کے زیر عنوان اخبارات میں نظام کا فرمان شائع ہوا:-

یک دوکلمہ

از نظر ما صحافتی بیان مولوی بہادر یار جنگ زیر عنوان " فی الحال تخلیہ شہر کا ارادہ نہ کریں۔

مؤرخہ ۲۴ ر صفر در رہبر دکن گذشتہ واو ہر چہ کہ گفتہ است لائق توجہ کہ مبنی بر واقعہ وہم خیر سگالیست۔ تاہم انسان را باید کہ بر مواقع امتحان پائے استقامت را تزلزل نہ آید بلکہ داند کہ ہر چہ در قسمت مقدر گشتہ است ایں غیر مبدل لہذا آں در وقوع روزے آمدنیست نظر برآں باجرأت وہمت مقابلہ شداید بکند درانحالیکہ تصور او ایں باشد کہ "برسر اولاد آدم ہر چہ آید بگزرد"۔

(رہبر دکن ۱۱- اردی بہشت ۱۳۵۱ف مطابق ۱۵ر مارچ ۱۹۴۲ء یکشنبہ)

ترجمہ فرمان

یک دوکلمہ

" فی الحال تخلیۂ شہر کا ارادہ نہ کریں" کے عنوان سے مولوی بہادر یار جنگ کا صحافتی بیان ہماری نظر سے گذرا۔

مؤرخہ ۲۴ر صفر کے رہبر دکن کی پچھلی اشاعت میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ لائق توجہ اور واقعات پر مبنی اور خیر سگالی بھی ہے۔

تاہم انسان کو چاہیئے کہ امتحان کے موقعوں پر پائے استقامت میں تزلزل نہ آئے بلکہ جو کچھ مقدر ہے اس کو غیر مبدل سمجھنا چاہیئے کہ اس کے واقع ہونے میں کوئی تاخیر نہیں۔ اس کے پیشِ نظر مشکلات کا جرأت اور ہمت سے مقابلہ کرنا چاہیئے اس حال میں کہ ان کا تصور اس معاملہ میں یہ ہو کہ " برسر اولاد آدم ہرچہ آید بگزرد "

آدم کی اولاد پر جو مصیبت بھی نازل ہوتی ہے گزر جاتی ہے۔

(فرمان کا ترجمہ رفیق قائد ملت مولوی عبدالرحمٰن سعید، سعید صدیقی مقیم شکاگو نے فرمایا۔)

" نظام کے اطراف سازشی گروہ ہی کا دور دورہ تھا، سر اکبر کی سرپرستی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور اس سازشی گروہ کی بنیادیں اس درجہ مضبوط کر دیں کہ سازش کے سارے راستے ہموار ہو گئے، جس کا ذکر اس باب میں مذکور ہے۔ یہ سمجھنا کہ نظام کے پاس ایک با اثر گروہ ایسا بھی تھا جو اس قسم کی شرانگیزیوں کا فوری ازالہ کر دیتا تھا۔ صرف خوش آئندہ خیال ہے۔ وفادار موجود تھے لیکن ان کا نظام پر اثر نہیں تھا، نظام بہادر یار جنگ کو بے وفا، مالک کا باغی اور ہونے والا مسولینی سمجھتے تھے، یہی بات کونسل کے ارکان بھی کہتے تھے اور ان سب کا یہ یقین تھا۔ اس طرح نواب صاحب کی وفاداری محتاج توثیق ہوئی۔ ہر امیر و رئیس اور زعمار ملت سے نظام، بہادر یار جنگ کی وفاداری کے بارے میں اپنے شک کا اظہار کرتے تھے، بہادر یار جنگ میموریل لکچرس (مدینہ ٹکنیکل کالج) میں جس میں راقم الحروف بحیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا تھا بیرسٹر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا:

" سرکار ہمیشہ مجھ سے بہادر یار جنگ کی وفاداری کے بارے میں دریافت کرتے، میں عرض کرتا سرکار بہادر یار جنگ آپ کے بعد وفادار

خادم ہیں۔ سرکار کو صرف میری اس بات پر یقین نہیں آتا تھا"

آنریبل سر عبدالعزیز وزیر حکومت آصفیہ کے نام نواب صاحب کے خط سے ہمارے مندرجہ بالا خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ خود بہادر یار جنگ یہ جانتے تھے کہ نظام کے خیالات ان کے بارے میں کیا ہیں تب تو انہوں نے نظام کے متعلق دعا کی کہ "خدا اعلیٰ حضرت کو اپنے حقیقی دوست اور دشمن کی صحیح تمیز عطا کرے"

آنریبل سر سیّد عبدالعزیز صاحب حیدرآباد

مکرمی! السّلام علیکم۔ مزاج شریف۔ محبت نامہ باعث تشکر ہوا۔ آپ کا وجود انتہائی پریشانی اور ابتلار میں بھی میرے لئے وجہ تسکین رہا اور میں ہمیشہ آپ کو اپنا ایک مخلص دوست اور کرم فرما سمجھتا رہا ہوں۔ آج آپ نے جن جذبات خلوص و محبت کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لئے غیر متوقع نہیں ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور خوش رکھے۔

سید صاحب! اس ساری کارروائی میں صرف ایک دفعہ مجھے آپ سے رنج رہا۔ آج اس کا ذکر اس لئے کر دیتا ہوں کہ آج کے بعد وہ کھٹک بھی باقی نہ رہے جو کبھی کبھی دل میں پیدا ہو جاتی ہے کہ کیا آپ بھی مجھے اعلیٰ حضرت کا بے وفا سمجھتے ہیں!؟ آج چوں کہ آپ نے اپنے خط میں اس کو صاف کر دیا اس لئے میں بھی ذکر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ وہ عرض داشت جس میں کونسل نے مجھے بے وفا، مالک کا باغی اور ہونے والا مسولینی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی اس سے آپ بھی متفق تھے۔ آپ کا یہ عذر کہ واقعات آپ کی تشریف آوری سے قبل کے تھے اس لئے معقول نہیں ہے کہ بحث واقعات سے نہیں بلکہ نتائج سے ہے جو آپ کی موجودگی میں نکالے گئے۔ اور آپ نے ان نتائج سے اتفاق کیا۔ بہر حال آپ کے آج کے خط نے وہ کھٹک بھی دل سے دور کر دی۔ آپ بھی اس جملۂ معترضہ کو فراموش

کر دیجیے۔

میں ان کیفیات سے واقف ہوں جو گذشتہ ۶ ماہ سے آپ کے قلب پر گذرتے رہے ہیں۔ گو میں آپ سے بہت کم ملا لیکن ہمیشہ میں نے آپ کے ان احساسات کو صحیح سمجھا۔ ان کی دل سے قدر کی اور جہاں جہاں موقعہ ملا ان کو صحیح طور پر پہونچایا۔ میں خوش ہوں کہ آپ اپنے جذبات پر غالب آ گئے اور آپ نے استعفیٰ نہیں دیا۔ اللہ آپ سے حیدرآباد کی صحیح خدمت لے اور آپ دیر تک یہ خدمت انجام دیں۔

اَب تو دل کچھ مردہ ہوگیا ہے۔ آپ احباب خوش ہوتے ہیں اس لئے میں بھی خوش ہوں ورنہ میرے لئے تو یہ پیغامِ رنج ہے کہ میری وفا محتاجِ توثیق بھی ہوئی۔ اگر آپ دل کی بات سننا چاہتے ہیں تو یہ ہے کہ دل بیٹھ گیا۔ اب اس میں وہ امنگ نہیں رہی جو ایک سال پہلے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے خدمت بلاجزا" میں جو لطف ملتا تھا وہ اب مکرمت و عطا میں بھی نہیں ملتا۔

میں آپ کے ساتھ دعا میں شریک ہوں کہ خدا اعلیٰ حضرت کو سلامت رکھے اور ان کو اپنے حقیقی دوست اور دشمن کی صحیح تمیز عطا کرے آمین۔ ــــــــــــــــ "آپ کا مخلص"

(حوالہ: خط نمبر ۱۶۰ مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۱ء ص ۲۰۷، ۲۰۸، مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی)

یہ سمجھنا کیسی خوش فہمی ہے کہ آخری زمانے میں نظام کے تعلقات بہادر یار جنگ سے مخلصانہ ہو گئے تھے۔

"راہ کی مشکلات کا کچھ نہ پوچھئے، قائدِ اعظم کی راہ میں انگریز ہے، ہندو ہیں اور خود ان کے جماعت کے منافقین ہیں اور میرے راستے میں سب سے بڑھ کر ایک اور طاقت ہے جس کو نہ توڑ سکتا ہوں، نہ

جس کے رہتے اپنے منزل کی طرف بڑھ سکتا ہوں، اپنی فکر کی واماندگیوں کا حال ممکن نہیں کہ زبان قلم سے ظاہر کرسکوں۔"

(حوالہ: خط نمبر ۳، ۵ الف ص ۴، ۵ مورخہ ۱۸ اپریل ۴۴ ۱۹ء بنام جناب محمد علی استاد دینیات جامعہ عثمانیہ)

نواب صاحب کے روایاتی اطاعت کے رویہ سے شاید یہ اندازہ لگایا گیا کہ نظام سے بہادر یار جنگ کے تعلقات حد درجہ استوار تھے، مضمون نگار نے اس تلخ حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ قائد ملت کی سیاسی زندگی کے لمحات کی موجوں کا راستہ نظام کی سیاست کے ظلمات کے بیچوں بیچ سے گذرتا رہا لیکن اس کے باوجود روایاتی اطاعت کے ساتھ مسلمانوں کے جائز حقوق کا مطالبہ اور جدوجہد سیادت وقیادت کا سخت امتحان تھا۔ نظام اور ان کے درباریوں کے حال چال سے وہ اہلِ وطن پر آنے والی سیاسی مصیبت اور مصائب سے اپنی سیاسی بصارت وبصیرت کے باعث پوری طرح آگاہ تھے اور دکن پر پولس ایکشن سے دس سال قبل وہ اپنی آنکھوں سے حیدر آباد کی سلطنت کو ہندوستان کے سمندر میں ایک موج کی طرح لہراتے، دوسو برس کے حاکم ازلی اور ابدی کو غلام بنتے دیکھ رہے تھے۔

"دل چاہتا ہے کہ جذباتِ قلب کو صفحۂ قرطاس پر نہ لاؤں۔ احتیاط گریبان گیر ہے لیکن سنئے کہے دیتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ حکومت میری نہیں رہی۔ میں جانتا ہوں کہ اس کو اسلامی حکومت کہنا اسلام کے لئے باعث ننگ وعار ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ خاکِ حجاز اقبالؒ کے الفاظ میں خشت بنیاد کلیسا بن گئی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری ساری امیدوں کا مرکز اور ساری آرزوؤں کا ٹھکانہ مجبور اور دوسروں کے اشارے کا محتاج ہے۔ میں اس کو بھی سمجھتا ہوں کہ

بالآخر مجھ کو شکست ہوگی۔ حیدر آباد کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے جائے گی اور ہندوستان کے سمندر میں حیدر آباد بھی ایک موج کی طرح لہرائے گا۔ دو سو برس کے حاکم ازلی اور ابدی غلام بن جائیں گے۔ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ بے وجہ نہیں ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی عدمِ جمعیت، خلاف ورزیٔ قوانینِ الٰہی، سستی، عیش پسندی اور کاہلی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس تمام عذابِ الٰہی کا مستحق بنالیا ہے۔

اسلامی سلطنت کے تصور میں جی رہا ہوں، اسلامی سلطنت کو پیدا کروں گا یا اسی تصور میں ہمیشہ کے لئے دنیا سے آنکھ بند کر لوں گا۔ اس کو طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ جن پر چھ سو برس سے حکومت کی ہے ان کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دوں۔ کریلا ہوں اور نیم چڑھا۔ پٹھانوں کے محفوظ خون نے خلقت و جبلت میں آزادی بھر دی تھی، اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے مطالعہ نے اس کو جِلا دے دی۔ یہ خیال نہ کیجئے کہ صرف مندر کے سامنے جُھکنا گوارا نہیں ہے، کلیسا کے اقتدار کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے مینار و کلس ڈھلتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ کاخ دیوان کی اینٹوں کو جھڑتا ہوا دیکھ رہا ہوں، بنیادوں کا تزلزل محسوس کر رہا ہوں۔ واقعات یقین دلا رہے ہیں کہ باپ، بیٹا، روح القدس کی بجائے وہاں برہما، وشنو اور شیو کی مورتیاں کھڑی ہونے والی ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں خلیج بنگال سے امنڈتے ہوئے طوفان کو چھوڑ کر بحیرۂ عرب کے پھٹتے ہوئے بادلوں کی طرح متوجہ ہو جاؤں۔ دیکھنے والی آنکھ منع کر رہی ہے اور سوچنے والا قلب روک رہا ہے۔ لیکن میرا اگر بس چلے تو شاید تھاپی لے کر اپنی زندگی کی خاطر اور مسجد کے مضبوط ہونے تک کلیسا کی دو چار اینٹوں کو مضبوط کر دوں۔"

(حوالہ: خط موسومہ مولوی غلام احمد وکیل نظام آباد مورخہ

۲۴ر مئی ۱۹۳۸ء خط نمبر ۳۷، ص ۱۲۶ تا ۱۲۷، مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی)

نظام کس درجہ مہربان تھے، مضمون نگار کو قائد ملت کے خطبۂ صدارت کے ان اقتباسات سے بھی اندازہ ہو جائے گا۔

آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ حکومت نے ہم کو آج کے جلسہ کی اجازت ایک بہت ہی عجیب وغریب شرط کے ساتھ دی تھی اور وہ شرط یہ تھی کہ "اس جلسہ میں کوئی سیاسی بات نہ ہو جو قابل اعتراض ہو"۔ کبھی آپ نے اتنا مبہم اور بے معنیٰ حکم حکومت کے کسی ذمہ دار ادارے کو دیتے ہوئے دیکھا ہے۔

ہمارا نعرہ کہ اعلیٰ حضرت کا تخت وتاج ہمارے سیاسی و تمدنی اقتدار کا مظہر ہے" تین سال کی کامل خاموشی کے بعد جس میں وہ یقیناً ناقابل اعتراض رہا۔ آج قابل اعتراض بن گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ ہماری ان تین سال کی صحبتوں میں بلند کئے ہوئے نعرہ ہائے تکبیر بھی قابلِ اعتراض تصور کئے جائیں اور کسی کی انتہائی بغاوت بھی بنظرِ لطف وکرم ناقابل اعتراض قرار پائے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اس جماعت کے ساتھ کیا جارہا ہے جس کے خون کا ہر قطرہ، جس کی سانس کا ہر تموج جس کی زندگی کا ہر لمحہ، جس کی صلاحیتوں کا ہر گوشہ اس سلطنت کی وسعتِ آزادی اور استحکام کیلئے وقف ہے، میں حکومت کی ان تمام کارروائیوں کی اس سے بہتر مثال نہیں سمجھ سکتا جیسے کوئی درخت کے کسی ڈالے پر پیڑ کی طرف منھ کر کے بیٹھے اور پھر اس ڈالے کو تراشنا شروع کر دے۔

سیاسی اجتماعی اداروں کی زندگی کا وہی دَور سب سے

زیادہ صبر آزما ہوتا ہے جبکہ غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہوں۔ اپنوں کو غیر بنایا جا رہا ہو۔ افترا پردازیوں کے طوفان اٹھ رہے ہوں، آشیانے کو آگ لگ رہی ہو اور وہی پتے ہوا دے رہے ہوں جن پر تکیہ کیا گیا تھا۔ یہی وقت آپ کے شعور و فہم کی آزمائش کا ہے۔

(حوالہ: خطبات مرتبہ نذیرالدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدآباد (خطبہ سالانہ ۱۳۵۹ ہجری)

مشکل یہ تھی کہ دکن کے مسلمان اور ان کا قائد تو نظام کے تھے مگر وہ نہ مسلمانوں کے تھے اور نہ قائد ملت کے، جس کا اعتراف خود قائد ملت نے فرمایا کہ "مشکل یہ ہے کہ جن کو ہم اپنا سمجھتے ہیں وہ فی الحقیقت ہمارے نہیں"۔ (حوالہ: خط ۵۲ مورخہ ۱۲ر مارچ ۳۹ء مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی)

نظام تو یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا نام و نشان ان کی سلطنت سے باقی ہے۔ چنانچہ شب دوشینہ کی بدمستیوں میں کھوتے ہوئے نظام نے پہلے تو اپنی بدمستیوں کا حال لکھا ہے ؎

شب دوشینہ کی بدمستیاں میں کیا کہوں ساقی
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گراں باقی

اور اسی غزل میں مسلمانوں پر اپنے کرم کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثماںؔ
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

بہادر یار جنگ نے اس شعر کو یوں بدلا کہ صورتِ حال بدل گئی۔

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثماںؔ
مسلمانوں سے تیری سلطنت کا ہے نشاں باقی

نیاز حیدر نے جو اسی سال مرحوم ہوئے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جب تاریخ نے باب بدلا اور جس دن نظام کی سلطنت ان کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ نظام کے اسی شعر پر طبع آزمائی فرمائی تھی ؎

وہ کہتے تھے کہ ان کی سلطنت ہی کے تصدق میں
مسلمانوں کا ہے اس ملک میں نام ونشان باقی
عقیدت سے ادب سے گن رہی ہے من چلی دنیا
کہ ہیں دستار شاہانہ میں کتنی دھجیاں باقی

نظام کی عقل و حرارت کی کمی پر قائد ملت نے ارشاد فرمایا تھا کہ "عقل و حرارت کی کمی ہے، بیشک اب وقت آگیا کہ انتظار کے بغیر اس خود غرض اور ابلہ فریبی کی دنیا کے زمین وزماں کو برہم کردیا جائے۔ خدا وہ وقت جلد لائے۔"

(حوالہ: مکتوب نمبر ۲ ۱۹۴۲ء مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی)

قائد ملت کی شہادت میں نظام کے ایما و منشا کو جو لوگ شریک نہیں سمجھتے تعجب ہے کہ ان میں رفیق قائد ملت مولوی محمد احمد خاں صاحب جیسی شخصیت بھی شامل ہے۔ اپنے مضمون میں قاتل کو تلاش کرتے کرتے انہیں ہر موڑ پر صرف سازشی ٹولہ نظر آیا۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ

کئی ذہن رسا پردے کے پیچھے کام کرتے ہیں
وہی قاتل نہیں جو لے کے خنجر سامنے آئے

تاریخ شاہد ہے کہ شاہوں نے سیاست کی شاہ راہ پر ہر اہل حق کے سر کو تن سے جدا کیا ہے۔ اور مورخ نے شاہ سے اس کی شہادت حاصل نہیں کی، تلوار کا مزاج، مورخ کا رہنما بنا

قاتل سے گفتگو کی ضرورت نہیں رہی
خود زخم پوچھ لیتے ہیں تلوار کا مزاج

تہذیب وفا کی نگاہوں کو نیچا کرنا اور حیا کی پیشانی کو عرق آلود، یہ کوئی شاہوں سے سیکھے۔

اگرچہ غیبی حقائق (جو تنہا عقل اور حواس ظاہری کی مدد سے معلوم نہیں کیے جا سکتے، قرآن سے ہم آہنگ اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں حقیقتوں کی صورت میں اپنا سر ابھارتے ہیں تو شاہوں کے زرخرید ضمیر فروش مورخ تاریخ کے ان صفحات کو افسانوں کے اوراق میں ملا دیتے ہیں تاکہ تاریخ کا چہرہ اس باب میں حقیقت کو بے نقاب نہ کرسکے ؎

کبھی افسانوں میں تاریخ کے اوراق ملے
کبھی تاریخ ملا دی گئی افسانوں میں

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روایتی شاہ پرستی جو ہماری گھٹی میں پڑی ہے اور ہم شاہوں کے تذکروں کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں، ہماری اس خوئے بد پر اقبال نے کہا تھا ؎

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

اس روایتی شاہ پرستی نے جرم کے چہرے پر افواہوں کے پردے ڈال دیئے، تاکہ مجرم کو کوئی صاف پہچان نہ لے اور یہ نہ کہہ سکے کہ "قاتل تم ہو"۔ فاصلہ ہاتھ کا دامن سے دور نہ تھا۔ لیکن ہاتھ کے فاصلے کو خود ہم نے اوپر سے نیچے گرا دیا۔ پتیاں پھول کی گرتی ہیں خزاں میں جیسے، دست طفل خفتہ سے رنگین کھلونے جیسے ورنہ

فاصلہ ہاتھ کا خود ہم نے بڑھا رکھا ہے
ورنہ دامن وہ بہت دور ہوا ایسا بھی نہیں

بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی سے جون ۱۹۷۶ء میں "بہادر یار جنگ

مشاہیر کی نظر میں" کے زیر عنوان کتاب کے دیباچہ میں جناب مجید فاروقی صاحب نے اس جرم سے متعلق نظام کی بے گناہی پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا ہے :

" نظام دکن نواب صاحب کی مساعی اور ان کی افادیت سے بے خبر نہیں تھے ۔ وہ خوب جانتے تھے کہ خود ان کی بقا کے لئے مسلمانانِ دکن کا تحفظ کس قدر ضروری ہے ۔ ہر اس سازش میں جو نواب صاحب یا مسلمانِ دکن کے خلاف ہوتی، نظام دکن میر عثمان علی خاں کو ملوث کر دینا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے ۔ نواب صاحب کی وفات بڑی اچانک اور پراسرار حالات میں ہوئی ۔ اکثر لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ موت فطری نہیں تھی ۔ قطعیت کے ساتھ کہنا کہ یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے بہت مشکل ہے اور اب تو اس کا امکان بھی باقی نہیں رہا کہ اس راز پر سے کبھی پردہ اٹھ سکے گا ۔ یہاں بھی (پاکستان) بعض ذہن نظام دکن کو اس سازش میں شریک کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں مگر تقاضائے احتیاط یہی ہے کہ جو بات ثابت نہ ہوسکی اس کے متعلق اس قسم کے دعووں سے پرہیز کیا جائے جیسا کہ عرض کیا گیا نظام دکن کو نواب صاحب کے مشن کی افادیت کا پورا پورا احساس تھا پھر ایسی صورت میں ان کا ایک ہستی کے خلاف سازش کرنا جو خود ان کے لئے پشت پناہ تھا مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے ۔"

یہ خیال تنہا جناب مجید فاروقی صاحب کا نہیں ہے ۔ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی کے ارکان کی اکثریت اس کی حامی ہے (شاید یہی وجہ ہے کہ بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی میں نواب بہادر یار جنگ کی اتنی بڑی اور رنگین کوئی تصویر آویزاں نہیں ہے جتنی بڑی سات

نظام کی تصاویر ہیں اور نظام کا حیدرآباد ٹرسٹ بھی اس عمارت میں ہے) لیکن پاکستانی عوام کی اکثریت نظام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود کوششوں کے نظام کے نام سے نہ کوئی بلڈنگ پاکستان میں موجود ہے اور نہ ہی کسی چھوٹی سے چھوٹی گلی کا نام، نظام کے نام سے منسوب ہے۔

ایک وسیع سیاسی پس منظر موجود ہے جس پسِ منظر میں نظام کی مخالفت کے اسباب سامنے آتے ہیں۔ جناب بادشاہ حسین نے اپنے مضمون میں کس قدر صداقت سے اس امر کا تجزیہ کیا کہ نظام کیوں مخالف ہو گئے تھے "ایک مطلق العنان بادشاہ کسی فرد کو ایسی بلندی پر دیکھنا نہیں چاہتا"

" حیدرآباد کے مسلمانوں میں بہادر یار جنگ کی شخصیت اور اتحاد المسلمین کے ادارے نے سیاسی شعور بیدار کر دیا اور یہ شعور بڑھتے بڑھتے ایک ایسی اتحادی اکائی کی صورت اختیار کر گیا کہ ہندوؤں کی اکثریت اس کو اپنے مفاد کے لئے خطرہ سمجھنے لگی، اس کا مظاہرہ آئے دن ہوتا رہتا تھا، خصوصاً اس وقت یہ بات زیادہ نمایاں ہو گئی جبکہ ریاست میں اصلاحات کے نفاذ کے لئے کمیشن کا قیام عمل میں آیا، علاوہ سر اکبر حیدری سے جو کہ وزیر مالیات تھے اور بعد کو وزیر اعظم بھی ہو گئے تھے بہادر یار جنگ کی معرکہ آرائیاں جاری رہتی تھیں۔ سر اکبر کی پالیسیوں پر بہادر یار جنگ کھل کر اور برملا اعتراض کرتے تھے۔ جب اِن اعتراضات نے شدت اختیار کر لی تو سر اکبر نے بہادر یار جنگ کے خلاف رویّہ اختیار کر لیا۔ ایک طرف تو وہ نظام کے کان بھرتے تھے تو دوسری طرف حیدرآباد کے انگریز ریزیڈنٹ کو انکی سرگرمیوں کے خلاف اکساتے تھے۔

بہادر یار جنگ کی شخصیّت جوں جوں بلند ہوتی گئی یہ ریشہ دوانیاں بڑھتی گئیں، کانگریس تو مخالف تھی ہی، ریزیڈنسی بھی مخالف ہو گئی اور نظام کو بھی سر اکبر نے فراہم کرلیا، ان کی جرأت سے سب ہی خائف تھے۔ ان کی صاف گوئی سے سب ڈرتے تھے اور ان کے خلوص سے سب ہی کو اپنا اقتدار چِھن جانے کا خطرہ تھا۔ لہذا نظام کو آلۂ کار بنا کر ان کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ طرح طرح کی ترغیب دی گئی اور قسم قسم کے اندیشوں کا اظہار کیا گیا لیکن وہ اپنی جگہ پر چٹان کی طرح اٹل رہے مگر اس مرد مجاہد کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

بالآخر یہ بات نظام کے ذہن نشیں کرائی گئی کہ بہادر یار جنگ ان کا اقتدار چھیننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس بلندی پر محسوس کرتے ہیں کہ جہاں تک نظام کی بھی پہونچ نہیں، ظاہر ہے ایک مطلق العنان بادشاہ کسی فرد کو ایسی بلندی پر دیکھنا نہیں چاہتا، نظام نے شخصی طور پر اپنے اثرات استعمال کر کے انہیں خائف کرنا چاہا"

(حوالہ: بلبل ہزار داستاں از سید بادشاہ حسین ص ۹۵، ۹۶۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں، کراچی)

سر اکبر حیدری سے اصلاحات کے سلسلے میں شدید اختلافات کے دور سے نظام کی مخالفت کا سلسلہ نقطۂ عروج پر آیا، اور درباری سازشوں سے ان کے اختلافات اس وقت اور بڑھ گئے جب تبدیلی وزرار کا مسلہ نواب صاحب نے اٹھایا، کیوں کہ یہ وزرار چند خاندانوں کے مفادات کا باہمی بھنور تھا۔ ملک کے ملی مفادات کو اپنے سازشی اور ذاتی مفادات پر قربان کر دینا ان کا مسلک تھا۔ بقول قائد ملت کے" بعض ارکان کی رکنیت باب حکومت کی عمر، خود باب حکومت کی عمر کے برابر ہو گئی تھی"

سر اکبر کی ذات ایک نزاعی شخصیت کی حامل تھی، ان کے دور میں ہندو طبقہ کو آبادی کی بنیاد پر مسلمانوں پر سیاسی برتری کا تصور، ریاست کے اقتدار اعلیٰ کے خاتمہ کی تمہید تھا۔

قائد ملت، نظام کی ریاست کی سیاست کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے اور قدرت نے انہیں سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے کی بے پناہ صلاحیتوں سے سنوارا تھا۔

نظام اور مسلمانانِ دکن کے حقوق کی حفاظت وصیانت کی صرف ایک صورت یہ تھی کہ تاج آصفی اور اقتدار شاہانہ کو ملتِ اسلامیہ کا اقتدار اور والیٔ ریاست کو اس اقتدار کا مظہر سمجھا جائے۔ اس سیاسی مصلحت کو سازشی ٹولہ نے رنگ دیا اور نظام کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اس عنوان سے بہادر خاں خود دکن کے مسولینی بننا چاہتے ہیں۔

سر اکبر حیدری مسلم مفادات کے خلاف ریشہ دوانیوں کے سلسلے میں قائد ملت کو سیاسی حیثیت سے بے دست و پا کرنے کا ہر حربہ استعمال کر کے جب خود بے دست و پا ہو گئے تو ستمبر ۳۹ء میں نظام آف حیدر آباد سے اس سیاسی مسئلہ کی یکسوئی قائدِ اعظم کی معرفت عمل میں آئی۔

سر اکبر حیدری کے متعلق نواب صاحب اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ

"سر اکبر حیدری میرے خلاف اعلیٰ حضرت کے کان بھر دیتے ہیں" (یادداشت از سیّد یوسف تصور، غیر مطبوعہ ص ۶۲)

۲۴ اگست ۱۹۴۰ء کو سر اکبر حیدری نے جیتی ہوئی بازی کو ہار دیا۔

" مسلمانوں کی خصوصی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے نظام دکن نے مجلس کے قائد کو خفیہ لیکن تحریری تیقن دیا کہ صرفِ خاص کے ان کے اپنے نامزد کردہ نمائندے لازماً مسلمان ہوا کریں گے ۔ اس طرح مقننہ میں مسلم اور غیر مسلم کا تناسب ۵۱ : ۴۹ رہے گا ۔ یہ تیقن مجلس کے صدر، مسلمانوں کے قائد محمد بہادر خاں نے بڑی جدو جہد، کشمکش کے بعد حاصل کیا جو بڑی سیاسی کامیابی تھی ۔ گویا انہوں نے مروجہ اصول جمہوریت کا رُخ موڑ دیا اور دکن میں مسلمانوں کی تاریخ بنائی ۔ مقصد حاصل ہونے کے بعد ممکن تھا کہ اعلان نہ کیا جاتا لیکن عوام کو اپنے اعتماد میں لینے کے لئے نہایت ہی محتاط اعلان کیا گیا کہ مجلس اتحاد المسلمین چند تیقنات کے ساتھ دستوری اصلاحات کو قبول کر رہی ہے، یہ فتح نہیں تو اور کیا ہے کہ (۱۲) فیصد مسلمانوں کو مقننہ میں اکثریت دلا دی گئی ۔

یہ عظیم الشان کامیابی حیدری حکومت اور ان کے اعیان کیلئے بہت بڑی ہزیمت تھی ۔ قائد ملت کی روز افزوں مقبولیت سے حیدری حکومت لرزاں و ترساں تھی ۔ اس کا منصوبہ تھا کہ نواب صاحب کو اس طرح پابند کیا جائے کہ ان کی مساعی بے نتیجہ ہو اور قیادت کا اثر زائل ہو جائے ۔ لیکن ان کی شخصیت ہند گیر اہمیت کی حامِل تھی ۔ ریاستی حکومت کو یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ ان کے خلاف تشدد برتنا کل ہند احتجاج کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اسٹیٹ پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے مشورہ سے نواب صاحب کے خلاف کوئی موثر کارروائی عمل میں لائی جائے ۔ ادھر حضور نظام کو ان کے خوشامدی درباریوں نے باور کرایا کہ نواب صاحب کی بے پناہ مقبولیت سے اس امر کے آثار پیدا ہو گئے ہیں کہ جرمنی کے ہٹلر اور اٹلی کے مسولینی کی طرح وہ دکن میں آمریت اختیار کر لیں ۔ اس لئے مناسب ہے کہ مرحلہ اول

ہی میں اس اندیشہ کا ازالہ کر دیا جائے۔

غرض سازش کی تکمیل کے بعد حکومت نواب صاحب کی ذات کو ریاست کی مستقبل کے لئے خطرہ سمجھ کر حکومت ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کو مطلع کیا کہ وہ ان کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس زمانہ میں سر فرانسس والیِ حکومتِ ہند کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے انچارج تھے اور نواب صاحب کی قیادت کی روز افزوں مقبولیت سے بھی وہ آگاہ تھے۔ انہوں نے اس مسئلہ میں عجلت کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اولاً بطور احتیاط برطانوی ہند کے مسلم قائدین سے نواب صاحب کے اثر ورسوخ اور مجوزہ گرفتاری کے بعد اس کے ردعمل کے بارے میں رائے دریافت کی۔ ان قائدین نے غالباً رقابت کے باعث نواب صاحب کے بارے میں مثبت قسم کی رائے کے اظہار سے نہ صرف عمداً گریز کیا بلکہ اپنے جواب میں ان کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی۔ اِن آرا کے بین السطور سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ پر نواب صاحب کے ساتھ ان قائدین کی رقابت واضح اور نواب صاحب کے بارہ میں صحیح نتیجہ پر پہنچ کر ریاستی حکومت کو جواب دیا کہ وہ نواب صاحب کو صرف اپنی ذمہ داری پر گرفتار کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جواب سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے معہود ذہنی کا پتہ چلتا تھا اس لئے حیدری حکومت کو گرفتاری کی تجویز پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن مخالفین کی سازشوں کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ ہندو طبقات کا عناد تو ایک بین حقیقت تھی، حکومت تو ایک زخمی دشمن کی طرح ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ حکمراں کے تو وہ رقیب قرار دیئے گئے۔ قوم پرست مسلمان ان کے سیاسی مسلک سے متفق نہ تھے۔ مشائخین اکرام ان سے حسد کرنے لگے تھے۔ دَرونِ خانہ بھی فضا موافق نہ تھی۔

ایک گہری سازش نہ معلوم کتنے عرصہ سے خفیہ طور پر بروئے کار لائی جارہی تھی جس سے قائد ملت لاعلم نہ تھے۔ وہ اکثر اپنے خطاب عام میں فرماتے تھے کہ "میرے آشیانے پر بجلی منڈ لارہی ہے، اس کو جل جانے دو"، عین اس زمانے میں جب کہ وہ حیدرآباد کو انگریزوں سے کئے ہوئے معاہدات کی روشنی میں آزاد کرانے کی سعی فرمارہے تھے۔ ہاشم یار جنگ کے دعوت میں مہلک زہر آلود حقہ سامنے لایا گیا، دام ہمرنگِ زمیں تھا۔ ایک کش کے ساتھ ہی طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ حقہ فوراً غائب کر دیا گیا۔ موقعہ پر موجود ڈاکٹروں نے رائے دی کہ حلق میں پھندہ پڑ جانے کی وجہ سے موت واقع ہوگئی ہے، ایک زعیم ملت جو سارے برصغیر کا محبوب، ہر مبتدا کی خبر، ہر ابتدا کی انتہا، ہر ضمیر کا مرجع، ایک ذات اور لاکھوں بندگانِ خدا کی عزت و آبرو، ہر ایک کا قبلۂ امید، آن کی آن میں عالمِ ناسوت سے عالمِ لاہوت بلکہ عالمِ ملکوت میں پہنچ گیا۔

سازش ایوانِ شاہی کی تھی، کسی کو احتجاج کی ہمت نہ ہوئی سب کے منہ پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ عرصۂ دراز تک عوام میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ شکوک ظاہر کئے گئے لیکن کوئی فریاد رس نہ تھا، جب قاتل ہی مسند عدالت پر قابض ہو تو خونِ ناحق کی سزا کس کو دی جاسکتی ہے۔ ۱۹۴۴ء کے قیامت خیز حادثہ کا ردعمل قدرتی طور پر ۱۹۴۷ء میں ظاہر ہوا، جس طرح محمود گاواں کے قتلِ ناحق کے بعد برید شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوا اسی طرح آصفی تخت و تاج ہند یونین کے قدموں تلے روندا گیا۔ بہرحال عالمِ الغیب والشہادۃ کی حکمتوں کا کس کو علم ہے۔ ایک پاک باطن، پاکباز، متقی و پرہیزگار، مبلغ پیامِ حق اور خادمِ خلق کو حرص و آز، مکر و فریب، فتنہ و فساد،

دغا و سازش کی اس ناپاک دنیا میں عمر طویل عطا کرنا قدرت ہی کو منظور نہ تھا۔ وہ ملکوتی طائر اس مقام پر پہنچ گیا جو اس کے شایانِ شان تھا۔ عمرِ دراز کی ہماری دعائیں، زندہ باد کے نعرے مؤثر ثابت نہ ہو سکے لیکن اس مقبول بارگاہِ الٰہی کی دعا کہ اس کی عمر کا باقی حصہ قائدِ اعظم کو دے دیا جائے فوراً قبول ہو گئی۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی"

(حوالہ: سوانح بہادر یار جنگ از نذیر الدین احمد مشمولہ مقدمۃ الکتاب ص ۲۵، ۲۶ از مولوی عبدالرحمٰن سعید، سعید صدیقی شکاگو)

قائدِ ملت کی زندگی کا آخری زمانہ ان کی سیاسی زندگی کا نقطۂ عروج تھا اور اس وقت تک دنیائے سیاست ان کی فیصلہ کن سیاسی قوت کا لوہا مان چکی تھی۔ ان کا عروج حاسدین کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔

ان کی زندگی میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو ان سے حسد کرتے تھے مگر کسی میں ان کے مقابل آنے کی جرأت نہ تھی، نواب صاحب نے اس منصوبے کو رد کر دیا تھا جو چند اہم شخصیتوں کی سرپرستی میں ابوالحسن سید علی اور ہندو لیڈروں نے مل کر بنایا تھا۔

(حوالہ: مخلص انسان از میر لایق علی ص ۲۶۴ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

"آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کی تنظیم، پاکستان میں شرکت۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں نمایاں طور پر شریک ہونا، یہ تمام خدمات ایسی نہ تھی جو حریفوں کو خاموش بیٹھنے دیتیں۔ چنانچہ بہادر یار جنگ کے خلاف سازشوں کا جال پھیل گیا"

(حوالہ: مولوی عبدالحامد بدایونی ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء حیدرآباد)

" ایک چراغ جس کی تیز روشنی سے صرف ظلمت کدہ دکن ہی نہیں بلکہ پورا ہندوستان منور ہو رہا تھا، سازشی نظام، انگریز سامراج اور نظام کا سازشی ٹولہ اسے برداشت نہ کرسکے۔"

(حوالہ: بے تیغ سپاہی از صدیق علی خاں، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

اعلاء کلمۃ الحق کا جو خمیازہ علامہ جمال الدین افغانی کو ترکی میں بھگتنا پڑا وہی بہادر یار جنگ کے لئے حیدرآباد میں مقدر تھا۔ جمال الدین کو زہر آلود خلال کے ذریعہ ختم کیا گیا اور بہادر یار جنگ کو حقہ میں زہر دیا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ جب اس مرد مجاہد کو شہید کیا گیا وہ حکومت حیدرآباد کا باجگزار بہادر یار جنگ نہیں بلکہ حیدرآباد کا ٹیپو تھا۔

(حوالہ: حیدرآباد کا ٹیپو از عبدالوحید خاں ص ۲۲۶، مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

دکن کے قدیم فرماں رواؤں نے سلطان المجاہدین ابوالفتح ٹیپو کے ساتھ جو سلوک کیا تھا (جس سے دکن کی تاریخ داغدار ہوگئی تھی) یوں لگتا ہے کہ جیسے سرزمین دکن نے ایک دوسرے بے تاج و تخت ٹیپو کو جنم دیا ہے جس نے بے شمار محاذوں پر اسلام دشمنوں سے بے تیغ و سنان جنگ کی اور سرخ رو ہوا،

اس نے ٹیپو شہید کے خون کی آبرو رکھ لی۔

(حوالہ: کچھ یادیں، کچھ باتیں، از نصر اللہ خاں ص ۳۱۳۔ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں۔ کراچی)

بہادر یار جنگ اور ٹیپو سلطان میں کئی مماثل خصوصیات تھیں دونوں نے نامصائب زمانہ میں مسلمانانِ دکن اور بالواسطہ مسلمانانِ ہند

کو دوبارہ اوج کمال تک پہنچانے کی سر توڑ کوشش کی اور دونوں آصف جاہی سازشوں کا شکار ہوئے۔ ایک نے سنتِ حسینی پوری کی اور دوسرے نے سنتِ حسنی۔

تاریخ اسلام میں سرور کائنات کے دونوں نواسے مؤمن کے عمل کے نمونے ہیں۔ صداقت کے لئے طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کے سبق انہیں دو بارگاہوں سے حاصل ہوتا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ دو بڑے دکنی دماغ ان بزرگ ہستیوں کے راستے پر گامزن ہوئے اور ثابت کر دیا کہ اسلام ہر زمانہ میں شہیدوں کے سچے پیرو پیدا کرتا ہے۔

(حوالہ: ہمارا نواب از مولوی اکبر وفا قانی مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں مرتبہ نذیرالدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، حیدر آباد)

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

اصولِ قانونِ شہادت کی روشنی میں بہادر یار جنگ کی شہادت

۲۵ر جون ۱۹۴۴ء کی شب عدلیہ کے عہدہ دار ہاشم علی خاں کے بنگلے واقع بنجارہ ہل پر دعوت سے قبل بہادر یار جنگ کی موت واقع ہوئی اس عظیم قائد کی موت پر ۵۶ سال سے سیاسی اسرار کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی بھی اس موت کو طبعی موت ماننے کیلئے تیار نہیں ہے اور ان کی موت کو ان کے انتقال کے دن سے آج تک سیاسی محرکات پر مبنی سازش سمجھا جاتا رہا ہے۔

اس شبہ کی ابتدائی بنیادی باتوں میں جو باتیں عام ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں جو شبہ کی تقویت کا باعث ہیں۔

۱۔ جسٹس ہاشم علی خاں کی دعوت میں جانے سے قبل جب وہ ڈیوڑھی سے روانہ ہوئے تو ہشاش بشاش اور بالکل صحت مند تھے، دعوت میں جانے کے بعد بھی وہ وہاں بلبلِ ہزار داستاں کی طرح گویا تھے۔

۲۔ وہ دعوت جس میں نواب صاحب مدعو تھے سوائے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور بیرسٹر اکبر علی خاں کے پہلے ان کے ہمنوا اور دوسرے ان کے دوست تھے، باقی شرکاء دعوت کے سیاسی کردار نظام والیٔ ریاست سے ان کے معنی خیز ربط اور تعلق کی بنا پر مشتبہ تھے۔

۳۔ دورانِ گفتگو نواب صاحب کو بطور خاص حقہ پیش کیا گیا، نواب صاحب نے حقہ پیش کرنے والی خاتون ڈاکٹر مس مقبول علی سے پوچھا یہ کیا؟ جواباً اس نے کہا کھانے میں دیر ہے اس لئے حقہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہاں چار باتیں قابلِ غور ہیں۔ (الف) دعوتوں میں حقہ، پان

سگریٹ کھانے کے بعد پیش کیا جاتا ہے، اس تہذیبی روش سے ہٹ کر کھانے سے قبل حقہ کیوں پیش کیا گیا۔ چوں کہ یہ دعوت شاہی عداوت کے زیرِ عنوان تھی، حقہ کی نے میں زہر ملا دیا گیا تھا اور ایک ہی کش میں قایدِ ملّت کا جاں بحق ہو جانا اس کا ثبوت تھا (ب) کھانے کی اس دعوت میں کھانے میں زہر نہیں ملایا جا سکتا تھا کیوں کہ کسی مخصوص شخص کی رکابی میں زہر ملا کھانا پیش کرنا قرینِ قیاس نہیں ہو سکتا، حقہ کے ذریعے زہر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ (ج) کھانے سے قبل حُقے کی پیش کشی، معاً اس کا غائب کر دیا جانا اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ حقے کے ذریعے نواب صاحب کو زہر دیا گیا، اگرچہ حقہ غائب کر دیا گیا تھا لیکن پنچنامہ کے وقت پولیس کو کچرے کی ڈھیر (کچرے کی کنڈی) میں ملا، بعد معائنہ حکومت سرکارِ عالی نے بذریعہ اخبارات اعلان کیا کہ "حقہ میں نکوٹین کی مقدار قدرے زیادہ تھی"، کیا یہ وہی حقہ تھا، اگر وہی حقہ تھا تو پولیس کو صاحب خانہ کے گھر سے کیوں برآمد نہیں ہوا؟۔

(د) حقہ جس نے پیش کیا وہ ڈاکٹر مس مقبول علی تھی (جن کے شوہر ڈاکٹر مقبول علی کارونر تھے) یہ ایک یہودی خاتون تھی، اس کے کردار از ابتدا تا انتہا سیاسی اعتبار سے بھی مشکوک تھے، سازشی ٹولے سے ان کا گہرا ربط و تعلق تھا۔ سر آرتھر لوتھیاں رزیڈنٹ حیدرآباد سے اس کے مراسم نہایت دوستانہ تھے۔ (آج سے تقریباً ۵ سال قبل یہ جرمنی سے اپنے ... لڑکوں کے ساتھ حیدرآباد آئی، اسے دواخانہ اسری میں شریک کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک عرصے سے پاگل تھی اور اسی حالت میں ان کی موت واقع ہوئی۔)

حقہ میں زہر کے واقعہ کی تصدیق اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو نظام کے درباری سازشی اور درباری مسخرے نے تحریر کئے ہیں،

مخفی مباد سازشی ٹولہ کے ذریعے یہ بات نظام کے ذہن میں بٹھا دی گئی تھی کہ بہادر یار جنگ مسولینی کا رول ادا کر رہے ہیں، خود نظام نے بھی یہ بات اپنے مخصوص درباریوں سے کہی تھی، اس کی تائید مزید اس طرح ہوتی ہے کہ نواب صاحب کی موت کے بارے میں انجانے میں ہوش بلگرامی کے قلم نے یہ بات اس سے اُگلوا دی۔

"اگر بہادر یار جنگ کے یہ عزائم کہیں پورے ہو جاتے تو وہ ایک وقت میں ہٹلر بھی بن جاتے، مسولینی کی فسطائیت بھی پھیلا دیتے اور مصطفیٰ کمال کی انقلابی روش بھی اختیار کر لیتے، اور اس اتحاد ثلاثہ کی آمیزش سے ملک میں انقلابِ عظیم پیدا کئے بغیر نہ رہتے جس کے لئے کسی موزون وقت کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

دعوت ہاشمی میں حقہ پیتے پیتے چل بسا۔"

(حوالہ: مشاہدات از ہوش بلگرامی ص ۲۹۷، ۲۹۸)

۴۔ نواب صاحب کے منھ سے مسلسل خون رس رہا تھا اور جسم پر نیلے نشان نمایاں ہو رہے تھے۔

۵۔ جسٹس ہاشم علی خاں کے گھر میں جس وقت قائد ملت کی وفات کی خبر کے بعد مختلف اکابرین، عمائدین اور مجلسی عہدہ دار و عزیز و اقارب جمع ہوئے تو ان میں سے کسی نے بھی اس امر کی گواہی نہیں دی کہ دعوتیوں کیلئے کھانا پکایا گیا تھا، دعوت تھی، مدعوین تھے مگر دعوتیوں کی ضیافت کے لئے کھانا نہیں پکایا گیا تھا، دعوت دراصل

؎ وہ ان کے دام میں آنے کا ایک بہانہ تھا

اَب سوال یہ تھا کہ ؎

کس نے فلک کا چاند زمیں پر بچھا دیا

بہادر یار جنگ کا قاتل ایک انسان تھا، "انسان انسان کا

بچہ سہی مگر حیوانوں میں رہ کر انسان انسان نہیں رہ سکتا۔"

کنگ کوٹھی پر پردہ پڑا ہوا تھا اور قائدِ ملت کے ہر چاہنے والے کی نگاہ کنگ کوٹھی کے پردے کے پیچھے چھُپے ہوئے قاتل پر لگی ہوئی تھی مگر وہ اقتدار کا بت تھا، والیٔ ریاست تھا، کسی کی زبان گویا نہ ہوسکی، اور یہ راز سربستہ رہا، کیوں کہ ؎

محرومیوں کے چپ حدِ اظہار بن گئی
تھے ہونٹ جس جگہ وہیں دیوار بن گئی

یہ ہیں وہ ابتدائی شبہات جو ۲۴ برس سے تحقیق طلب ہیں اور اب یہ واقعہ ثبوت طلب واقعات کی فہرست میں ہے جس طرح عدالت میں کسی مجرم پر جرم عائد کئے جانے کے بعد شبہات پیش ہوتی ہے اسی طرح کی شہادت اس شبہ کا فیصلہ کر سکتی ہے۔

اصولِ قانون، شبہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ شبہ کی حقیقت کو قانون کی مدد سے بڑی تقویت ملتی ہے۔

"شبہ۔ ایک زیادہ قوی لفظ ہے۔ ایسا خیال جو دوسرے سے پیدا ہوتا ہے، کمزور نہیں ہوتا،"

(اصولِ قانونِ شہادت از ڈبلیو اے یم بسٹ)

اگر ہم (BON NIER) کے اس قانونی نقطۂ نظر کو ملحوظِ خاطر رکھیں کہ

"صداقت کی دریافت میں انسانی ذہن کے خزانوں کی تحقیق کو ان مصنوعی قواعد کی تحقیق پر سبقت ہونی چاہئے جو اس کی تائید میں وضع کئے گئے ہیں۔"

"فہم انسانی پر تین نقطہ ہائے نظر سے غور کیا جا سکتا ہے یعنی ماخذ ہائے تصورات کے نقطۂ نظر سے، ان اشیاء کے لحاظ سے جن کا

ذہن انسانی کو شعور ہوتا ہے یا واقعات یا قضیات کی صداقت یا بطلان کے متعلق ہمارے یقین کی شدت کے لحاظ سے" BACON اصولِ قانون شہادت میں وجدانی شعور کو علم اور یقین کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

ذہن انسانی کے باہمی تعلقات کا شعوری نتیجہ شدت یقین کی صورت میں ادراک کہلاتا ہے، اس طرح یقین کی حد مناسب کا عنوان بھی ادراک ہے اس طرح قرائنی شہادت کی بنیاد پر ابتدائی شبہات بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ لیکن فہم انسانی ماخذ ہائے تصورات کو شعور کی مدد سے واقعات کے تسلسل وارتباط کے سہارے یقین کی منزل کی طرف لیجاتے ہیں۔

کسی ملزم کو شریک جرم سازش ثابت کرنے کے لئے پہلے نفس جرم سازش کو ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے بعد ازاں "شریک جرم سازش" کو ثابت کرنا پڑتا ہے، اس بنیادی نقطۂ نظر کے پیش نظریہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جو وجہ تحریک بنے قائد ملت کی شہادت کے، اس سوال کا جواب وہ سیاسی پس منظر ہے جس پس منظر میں قائد ملت کی بے باک قیادت سازشی بساط سیاست کے مہروں کو مائل بہ شکست کر رہی تھی، یہ وہ وقت تھا جب ابنائے وطن نے مذہبی آزادی کے پردے میں سیاسی اقتدار کے حصول اور سیاسی منصوبوں کو جارحانہ بنیادوں پر مقصد براری کا ذریعہ بنانے کے لئے ۱۹۳۷ء میں میدان عمل میں کود پڑے۔ سر اکبر نے اصلاحات کا اعلان کر کے اپنی حکومت کی سیاسی شکست کا اعتراف کر لیا، اس وقت تک قائد ملت کی آواز دکن کے مسلمانوں کے قلوب کی ترجمان بن چکی تھی۔ نواب میر عثمان علی خاں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا کہ مسلمانان مملکت آصفیہ کے مفادات و امتیازات حقوق کی برقراری کے بغیر اصلاحات کا اعلان، مسلمانوں کے سیاسی اقتدار

کی بقا اور معاشی و ثقافتی حیثیت کا تحفظ جو توارثاً و تعاملاً انہیں حاصل رہا ہے۔ اس سے وہ محروم ہو جائیں گے۔

اصلاحات کی یہ جنگ، ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہی، بالآخر سر اکبر نے والی ریاست کا فرمان نسبت اصلاحات جاری کروا دیا (نظام والی ریاست کو ان کی شاہی کی بقا کی ضمانت دے دی گئی) اس طرح حکومت نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں کے دو صد سالہ وقار و تمکنت کو اپنی شاہی کی بقا پر بھینٹ چڑھا دیا۔

لسان الامت، ان ساری سازشوں کے خلاف ہر محاذ کے مقابل ایک محاذ قائم کر چکے تھے، کیوں کہ وقت کا تقاضہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت و صیانت، اس امر کی متقاضی تھی کہ، قائد ملت کے جذبہ اندرون کی بے قراریوں، منصب قیادت کی ذمہ داریوں کا تقاضا تھا کہ کامل تدبیر کے ساتھ منصب قیادت کی ذمہ داریوں کو پورا کیا جائے، افہام و تفہیم روایاتی اطاعت کے دائرے میں مطالبات کی کوششیں، اپنا رنگ نہ جما سکیں۔ مجبوراً قائد ملت نے سر اکبر کو "راست اقدام،، کی بالمشافہ یادداشت دی۔ سر اکبر نے اس کی وضاحت چاہی، قائد ملت نے جواباً فرمایا:- "ہر وہ عمل جس سے حکومت کو پریشان اور اس کو مسلمانوں کے مطالبات ماننے کیلئے مجبور کیا جا سکے"۔ والی ریاست نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کیا اور اس موقعہ پر قائد اعظم کا سہارا ہی واحد وسیلہ تھا۔ ماہ مئی ۱۹۴۱ء میں اس خصوص میں قائد اعظم سے نظام والی ریاست کی مراسلت ہوئی۔ چار خط قائد اعظم کے نام لکھے۔ ان خطوط کا سلسلہ ماہ جون ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ والی ریاست کے خطوط اور قائدِ اعظم کے جوابات کا مطالعہ، نظام کے ناپاک عزائم کا آئینہ دار ہے۔

فرماں روائے دکن حضور نظام کا خط قائداعظم کے نام

خانگی اور بصیغۂ راز

حیدرآباد مؤرخہ ۲۹ مئی ۱۹۴۱ء

جناب محمد علی جناح صاحب!

آپ کا مکتوب مؤرخہ ۲۲ مئی وصول ہوا جس سے بڑی مسرّت ہوئی۔

میرے فرمان مؤرخہ ۴ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ جس کی اشاعت عمل میں آچکی ہے یہ نہایت ضروری تھا کہ اس کی اجرائی میں وقت ضائع نہ ہو جیسا کہ آپ کو علم ہے۔ بہادر یار جنگ کی تباہ کن سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں کی سیاسی صورتِ حال نہایت سنگین ہوچکی ہے اس لئے یہ ضروری تھا کہ غلط فہمیوں کو دور کیا جائے یا مزید پیچیدگیوں کو ٹالا جائے، اس لئے میری نظر میں جو کچھ میں نے اور میری حکومت نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا وہ بالکلیہ صحیح اور حق بجانب ہوگا۔

(۲) علاوہ ازیں جیسا کہ آپ کو علم ہے، ریاستہائے ہند کے حالات برطانوی ہند کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ریاستیں اقتدارِ اعلیٰ کے زیر نگرانی ہیں اور ان کو معاہدات ذمہ داریاں نبھانی ہیں، برطانوی حکومت سے وفاداری کو ریاستیں کسی خاص فرقہ کی حرکات سے جو ان کے حدود میں مقیم ہے متاثر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتیں، ان تمام امور پر کسی فریق یا فرد سے مشورت کے

وقت خواہ وہ کوئی ہو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۳) میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ جو کچھ بھی اب تک طے ہوا ہے اس کو برطانوی حکومت کی منظوری حاصل ہے، اس حکومت کا خیال ہے کہ حکمراں کی اپنی چند ذمہ داریاں ہیں جن سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا، مجھے اعتماد ہے کہ میں نے جو کچھ اظہار کیا ہے اس کو آپ مکمل طور پر سمجھ گئے ہوں گے۔

(۴) علاوہ ازیں آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے ریاست حیدرآباد میں میں صرف مسلمانوں کا حکمراں نہیں ہوں بلکہ اسی طرح دوسری اقوام اور فرقوں کا بھی حکمراں ہوں جو میری رعایا ہیں، اس لئے میرا سلوک ان سب سے کسی ظاہری امتیاز کے بغیر یکساں اور مساویانہ ہونا چاہیئے، زمانۂ حاضر میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے جب کہ ساری دنیا میں تبدیلی اور انقلاب آگیا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ریاست میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یعنی (۱۵) لاکھ سے زیادہ نہیں اور ان کے مقابلہ میں دوسرے فرقے زبردست اکثریت میں ہیں۔ مسئلہ کے کسی حل سے پہلے اس اہم حقیقت پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۵) آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بہ حیثیت حکمراں میرا یہ فرض ہے کہ ریاست میں ہر قیمت پر امن و امان کا تحفظ کروں۔ میرا یہ بھی فرض ہے کہ مختلف فرقوں کے مفادات کی حفاظت کروں جو میری سرپرستی میں امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور کسی فرقہ کو یہ کہنے کا موقعہ نہ دوں کہ ان کے خلاف میں تعصب یا جانب داری برت رہا ہوں اور یہ کہ ان کے ساتھ انصاف کرنے میں، میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے اور میری حکومت نے جو کارروائی کی ہے وہ پوری ریاست بالخصوص مسلم فرقہ کی بہتری کے لئے کی گئی ہے اور یہ عمل

بہادر یار جنگ کو خطرہ سے بچانے کے لئے کیا گیا ہے، اس کے برعکس اگر وہ اپنی نامناسب پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے تو بالآخر فرقۂ مسلم کو نقصان پہنچائیں گے، اس لئے حکمراں اور اس کی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ تاخیر ہونے سے قبل حالات کو درست کر لیا جائے۔

(۶) میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بات قابل اعتماد ذریعہ سے میرے علم میں آئی ہے کہ جب سے بہادر یار جنگ نندی ہلز سے جہاں وہ آپ سے ملاقات کے لئے گئے تھے کھلے طور پر اپنے رفقاء سے کہہ رہے ہیں کہ اگرچہ مسٹر جناح نے اخبارات میں اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہے کہ مسلم لیگ کا مختلف ریاستوں کے ادارہ جات سے کوئی تعلق نہیں ہے کیوں کہ وہاں کے حالات بڑی حد تک برطانوی ہند کے حالات سے مختلف ہیں اور یہ کہ مسٹر جناح نے بوقت ضرورت حیدرآباد میں اتحاد المسلمین کی مدد سے انکار کر دیا ہے تو ان کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے وہ جو کچھ بہتر اور مناسب سمجھتے ہیں عمل کرنے میں آزاد ہیں۔ چوں کہ مسٹر جناح نے ایک سے زائد موقعوں پر ان کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے جذبات مجروح ہوئے ہیں وغیرہ۔ مجھے علم نہیں ہے کہ جو بیان میرے کانوں تک پہنچا ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے، تاہم بہادر یار جنگ کے کردار سے میں شخصی طور پر واقف ہوتے ہوئے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان بڑی حد تک صداقت کا حامل ہے، بہر حال اس کا مجھ سے اور میری حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے مناسب خیال کیا کہ اس کی جو کچھ بھی اہمیت ہو میں آپ کے علم میں لاؤں۔

(۷) آپ کے مکتوب مورخہ ۲۴ ر مئی کی ایک نقل سر اکبر حیدری نے میرے ملاحظہ کے لئے بھیجی ہے اور انہوں نے آپ سے ملنے کے لئے نندی ہلز کو ایک خصوصی پیامبر بھیجنے سے قبل مجھ سے اسی مسئلہ پر طویل گفتگو کی

اور خصوصی پیامبر نے واپسی پر آپ سے ملاقات کا ایک نوٹ بھی پیش کیا۔ محولۂ صدر مکتوب میں آپ نے صدر اعظم اور ان کے رفیق کار سید عبدالعزیز سے خواہش کی ہے کہ اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں کے خلاف کوئی مزید اقدام نہ کیا جائے۔ دوسری طرف بہادر یار جنگ کا عمل کچھ مناسب نہیں ہے، یا وہ ان کو دیئے ہوئے مشورہ کے مطابق نہیں ہے (جیسا کہ مجھے لکھے ہوئے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے) ایسی صورت میں کیا عمل کیا جائے؟ مسئلہ زیر بحث کے اس پہلو پر بھی غور کیا جائے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم حتی الامکان مزید اقدام سے احتراز کریں گے لیکن اگر بہادر یار جنگ اپنے عمل سے ہمیں کسی اقدام پر مجبور کریں تو پھر ہمارے لئے کوئی اور صورت نہیں ہے۔ حکومت کے وقار کو قائم رکھنے کیلئے ان کے عمل کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے کیوں کہ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ بہادر یار جنگ نے اپنے قدیم طریقۂ کار میں ہنوز کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے بلکہ آپ کے اور کسی اور کے مشورہ کا لحاظ کئے بغیر جو اُن کے مفاد میں ہے اپنے عمل کو مستحکم ارادہ کے ساتھ جاری رکھا ہے اگر یہ صورتِ حال باقی رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جبکہ ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا جس کے لئے کوئی اور نہیں بلکہ وہ تنہا ذمہ دار ہوں گے۔

بہرحال یہ تمام امور اولین اہمیت کے حامل ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے اور یہ کہ ریاست کے مفاد کو اولیت حاصل ہے جس کو ایک فرقہ کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا یا بہادر یار جنگ جیسے غیر محتاط شخص کے عمل کو ترجیح نہیں دی جا سکتی جو طبعاً سیاستداں یا عاقبت اندیش نہیں ہے بلکہ اسکے برعکس وہ بالکل ہی ناتجربہ کار تنگ نظر ہے جس کے بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے، ان کی سابقہ تاریخ میرے بیان کی تصدیق کرتی ہے، میرے خیال میں انکی مثال آئینہ خانہ میں ایک سانڈ کی سی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ نیلگری کی سرد آب و ہوا میں آپ رو بہ صحت ہوں گے۔

آپ کا مخلص

قائداعظم محمد علی جناح کا خط
نظام آف حیدر آباد کے نام

مکتوب مورخہ ۱۴ ؍جون سنہ ۱۹۴۱ء

یور اگزالٹڈ ہائنس! آپ کے مکتوب مورخہ ۲۹ ؍مئی اور میری مزاج پرسی کا بہت بہت شکریہ!! میں مسرت کیساتھ آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ اب میں بالکل تندرست ہوں اور بمبئی کو واپس آ گیا ہوں۔

آپ کے مکتوب میں کئی مسائل درج ہیں جن پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پیشہ ورانہ مصروفیت کے سلسلے میں حیدر آباد آنے کا امکان ہے اسی وقت ان مسائل پر مزید گفتگو ممکن ہے۔ اس اثنا میں نہ تو آپ کی حکومت اور نہ بہادر یار جنگ کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو موجودہ پیدا شدہ مشکلات میں اضافہ کا باعث ہو اگرچہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ سے شخصی طور پر گفتگو کے بعد مسئلہ کا اطمینان بخش حل نکل سکتا ہے کیوں کہ مجھے یقین واثق ہے کہ بہادر یار جنگ کا کوئی ارادہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی ایسا کام کریں جو اولاً آپ کے لئے یا برطانوی حکومت کے تعلق سے مضرت رساں ہو۔ اگر میں اپنے نظریہ میں درست ہوں تو پھر حل کے حصول میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہے۔ بہر حال ہم اپنی ملاقات میں مسئلہ زیر بحث پر مزید گفتگو کریں گے۔

اپنی بہترین آرزؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

فرماں روائے حیدرآباد حضور نظام کا خط قائدِ اعظم کے نام

مکتوب مؤرخہ ۱۸؍جون ۱۹۴۱ء حیدرآباد خانگی بصیغۂ راز

جناب محمد علی جناح صاحب! میرے مکتوب مؤرخہ ۲۹؍مئی کے جواب میں آپ کا مکتوب مؤرخہ ۱۴؍جون وصول ہوا جس سے مسرت حاصل ہوئی۔

آپ کے مکتوب کے مندرجہ مقصد کے سلسلہ میں آپ سے ملاقات کی غرض سے سر اکبر حیدری اور سید عبدالعزیز بہت جلد بمبئی پہنچ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہادر یار جنگ کی موجودہ سرگرمیوں سے پیدا شدہ صورت حال پر گفتگو ہوگی بلکہ مسئلہ کے پورے حقائق سے آپ کو واقف کرایا جائے گا تاکہ آپ رائے قائم کرلیں کہ بہادر یار جنگ نے کس حد تک آپ کے مشورہ پر عمل کیا ہے جو آپ نے ان کے مفاد کے حق میں حال ہی میں بمقام نندی ہل ان کو دیا تھا اور یہ کہ میں اور میری حکومت اس مسئلہ سے نمٹنے کیلئے جو کچھ کریں گے اس میں ہم کہاں تک حق بجانب ہوں گے، اگر ہم کو بہادر یار جنگ یہ کچھ کرنے پر مجبور کریں۔

آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ موجودہ حالات کو ہم مزید مدت کے لئے برداشت نہیں کرسکتے کیوں کہ ہمارے نقطۂ نظر سے اب صورت حال سنگین ہو چکی ہے۔ دوسری طرف ہندو کسی اقدام کا فیصلہ کرنے سے قبل حالات کا بڑی احتیاط کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں (میرا مطلب ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ سے ان کا تعلق ہے) کیا بہادر یار جنگ کے چیلنج کو ہم بے معنی قرار دیں؟ مجھے اعتماد ہے کہ آپ میرے مفہوم کو یا اس نازک مسئلہ کو جو میں نے تحریر کیا ہے بخوبی سمجھ لیں گے۔

آپ کا مخلص

قائدِاعظم کا خط نظام آف حیدر آباد کے نام

مکتوب مؤرخہ ۲۷ر جون ۱۹۴۱ء

یُور اگزالٹڈ ہائنس! آپ کا مکتوب مؤرخہ ۱۸ر جون ۱۹۴۱ء مجھے وصول ہوا اب جبکہ سر اکبر حیدری اور مسٹر سید عبدالعزیز سے مسئلہ زیر بحث پر مکمل گفتگو ہو چکی ہے، میں آپ کے مکتوب کا جواب ارسال کر رہا ہوں، اس امر کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے مکتوب کی مندرجہ خواہش کے مطابق مسٹر تقی الدین بھی اس گفتگو کے وقت موجود تھے۔ میں نے بہادر یار جنگ کو بمبئی آنے کی دعوت دی تھی کہ وہ بھی گفتگو سنیں اور اس بارہ میں ان کو کچھ کہنا ہے تو کہیں۔ ان سے بھی طویل گفتگو رہی۔

ان سب سے صاف وصریح اور بے لاگ گفتگو کے بعد مجھے امید ہے کہ اطمینان بخش حل نکل آئے گا، لیکن قبل اس کے کہ میں آپ کی خدمت میں اپنا مؤدبانہ مشورہ پیش کروں، میری رائے ہے کہ اس مسئلہ پر آپ سے گفتگو کا ایک موقعہ ملے اور مجھے کامل اعتماد ہے کہ اس کے بعد ہم مسئلہ کا حل نکال لیں گے اور یقیناً حل نکلنا چاہیئے جس کو آپ کی منظوری حاصل ہوگی۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے اور اس کا جو مفہوم ہے میں اسکو بخوبی سمجھتا ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں۔ اس اثنا میں مجھے امید ہے کہ آپ اور آپ کی حکومت کوئی اقدام نہیں کرے گی کیوں کہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے سلسلہ میں، میں بہت جلد حیدر آباد آ رہا ہوں اور آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں گا۔ میں اپنی آمد کی تاریخ سے آپ کو مطلع کروں گا، میں سمجھتا ہوں کہ مقدمہ کی پیشی ۸ر جولائی کو مقرر ہے اور میں ایک دو روز قبل وہاں پہنچ جاؤں گا۔

اپنی بہترین تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

فرماں روائے دکن حضور نظام کا خط

قائدِ اعظم کے نام

مکتوب مؤرخہ ۳۰ر جون سنہ ۱۹۴۱ء

خانگی بصیغۂ راز

محترم مسٹر جناح!

میرے مکتوب مؤرخہ ۱۸ر جون سنہ ۱۹۴۱ء کے جواب میں آپ کا مکتوب مؤرخہ ۲۷ر جون وصول ہوا جس سے بڑی مسرّت ہوئی۔

براہ کرم یہ امر آپ کے علم میں رہے کہ مسئلہ زیر بحث میرا کوئی شخصی یا خانگی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک سرکاری مسئلہ ہے جس کی اطلاع حکومت ہند کو دی گئی ہے اور اس کی نازک اور سنگین نوعیت ہے جس میں حکمراں اور حکومت دونوں کے وقار کا انحصار ہے۔ اس لئے میں آپ کے یا کسی اور کے مشورہ کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہوں مگر کونسل کی متفقہ رائے کو جسے حکومت ہند کی بھی منظوری حاصل رہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ کسی تیسرے فریق کی تجویز یا رائے کے لحاظ کے بغیر اپنے استحقاق کی بناء پر طے پائے گا۔

بہر حال خانگی طور پر آپ سے گفتگو کرنے کیلئے بخوشی آمادہ ہوں کیوں کہ میری حکومت کے صدر اعظم اور وزیر قانون سے آپ نے بمبئی میں گفتگو کی ہے لیکن مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی جب تک کہ جانچ پڑتال نہ ہو جائے فی الحال میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کس نتیجہ پر پہنچوں گا اور اس کو مزید تاخیر کے بغیر طے ہو جانا چاہیئے کیوں کہ عرصہ سے یہ مسئلہ معرضِ التوا میں ہے۔

آپکا مخلص

مسئلہ اصلاحات پر نظام والی ریاست کا فرمان شاہی (یا مسلمانوں کے سیاسی قتل کا پروانہ) شائع ہوا۔

منصب قیادت پر فائز بہادر یار جنگ نے بھی روایتی اطاعت کے جامہ کو تار تار کر دیا اور دشمن کی سرنگ میں شتابہ لگا دیا، کنگ کوٹھی کے در و دیوار ہل گئے، اب بہادر خاں کو شاہی آبرو کی شکن کی کوئی پرواہ نہ تھی، قربتوں کی دوریاں جو نہاں تھیں عیاں ہوتی گئیں دل و نگاہ کے فاصلے بڑھتے گئے لیکن قائد کو نظام کے پرچم کو نہیں خدا کی بڑائی (العظمۃ للّٰہ) کے پرچم کو سر بلند رکھنا تھا، آثار و نشانات، شاہ و شہنشاہ اسلام کی عظمت کا اثاثہ نہیں، نظام والی ریاست نے قائد ملت سے نظریں پھیر لیں مگر اس وقت تک نگاہِ وقت ان کو اپنا چکی تھی۔

والی ریاست نواب میر عثمان علی خاں کا خط مؤرخہ ۲۹ مئی ۱۹۴۱ء

۱۔ ایک طرف اصلاحات کے اعلان کو تقاضائے وقت قرار دیتا ہے۔

۲۔ اس خط کی دوسری قابلِ تذکرہ بات کہ "ریاست حیدرآباد میں، میں صرف مسلمانوں کا حکمراں نہیں ہوں ـــ اس ریاست میں مسلمان اقلیت میں ہیں یعنی (۱۵) لاکھ سے زیادہ نہیں (مخفی مباد مہاراجہ کشمیر نے کبھی ایسی بات نہیں کہی کہ کشمیر میں ہندوؤں سے مسلمانوں کی آبادی ۸۰ فیصد زائد ہے، میں صرف ہندوؤں کا بادشاہ نہیں ہوں)

تیسری بات بہادر یار جنگ کے خلاف رکیک الفاظ کا استعمال، اس خط میں قائد ملت کے تعلق سے نظام نے لکھا ہے کہ

"(۶) میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بات قابلِ اعتماد ذریعہ سے میرے علم میں آئی ہے کہ جب سے بہادر یار جنگ نندی ہلز سے جہاں سے وہ آپ سے ملاقات کے لئے گئے تھے کھلے طور پر اپنے رفقاء سے کہہ رہے ہیں کہ ـــ مسٹر جناح نے بوقت ضرورت حیدرآباد میں اتحاد المسلمین کی مدد سے انکار کر دیا ہے تو ان کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے، وہ جو

کچھ بہتر اور مناسب سمجھتے ہیں عمل کرنے میں آزاد ہیں چوں کہ مسٹر جناح نے ایک سے زائد موقعوں پر ان کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے جذبات مجروح ہوئے وغیرہ۔ مجھے علم نہیں ہے کہ جو بیاں میرے کانوں تک پہنچا ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ تاہم بہادر یار جنگ کے کردار سے میں شخصی طور پر واقف ہوتے ہوئے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان بڑی حد تک صداقت کا حامل ہے بہر حال اس کا مجھ سے اور میری حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے مناسب خیال کیا کہ ان کی جو کچھ بھی اہمیت ہو میں آپ کے علم میں لاؤں۔"

خط کا مندرجہ بالا حصّہ پڑھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ ایک والی ریاست کی یہ تحریر ہو سکتی ہے، قائد اعظم کو قائد ملت سے بدظن کروانے کی یہ طفلانہ کوشش مضحکہ خیز بھی ہے اور نظام کے مزاج کے جزء لاینفک ان کی سفلہ مزاجی کی غماز بھی ہے، ان کی سفلہ مزاجی نے ہی ان کو سیہ بختی کے دن دکھائے۔

اسی خط میں نظام نے بہادر یار جنگ کو اپنے جوابی عزائم سے آگاہ کیا ہے" اگر بہادر یار جنگ اپنے عمل سے ہمیں کسی اقدام پر مجبور کریں تو ــــ ان کے عمل کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب کہ ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا جس کے لئے کوئی اور نہیں بلکہ وہ تنہا ذمہ دار ہوں گے۔ بہادر یار جنگ جیسے غیر محتاط شخص کے عمل کو ترجیح نہیں دی جا سکتی جو طبعاً سیاستدانوں یا عاقبت اندیش نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ بالکل ہی ناتجربہ کار تنگ نظر ہے جس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، ان کی سابقہ تاریخ میرے بیان کی تصدیق کرتی ہے، میرے خیال میں ان کی مثال آئینہ خانہ میں ایک سانڈ کی سی ہے۔"

اصلاحات کے باب سے نظام کے عزائمِ مجرمانہ کو آغاز ہوتا ہے اور یہ باب مزید دو ابواب کے بعد شہادت کا عنوان بن جاتا ہے صرف اسی ایک خط کے مندرجہ بالا فقروں پر اصولِ قانونِ شہادت کی روشنی میں غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ "مقدمات میں جہاں جان یا آزادی کا سوال ہوتا ہے بہت احتیاط کرنی چاہیئے۔ سماج کے حسن اخلاق کے معیار اور تقدس کی تنظیم میں قومیں اور زمانے مختلف ہوتے ہیں، ضمیر کے اصولوں اور جرأت میں انسان ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔"

"جب کوئی شخص قصداً کسی امر حیثیت عرفی کو شائع کرتا ہے تو کینہ قیاس کرلیا جاتا ہے ایسی صورتوں میں فعل بذاتہ کینہ آمیز ہوتا ہے" اور واقعات خود ناطق ہوتے ہیں، اس قسم کے واقعات اس حد تک عقل کے مطابق ہوتے ہیں کہ اخلاقی یقین اور قانونی قرارداد میں کامل ہمنوائی ہوتی ہے، فوجداری مقدمات میں ایک عام کینہ آمیز نیت ایک ہی نوع کے عام افعال کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے، فریب کا قیاس صرف نتیجے سے نہیں بلکہ ارادے سے کیا جاتا ہے۔" (حوالہ: اصول قانونِ شہادت از ڈبلیو۔ اے۔ بسٹ)

اصول قانون شہادت کی مندرجہ بالا بحث نظام کے خط سے ان کے ارادے اور کینہ آمیز نیت کو ثابت کرتی ہے۔ اور یہی کینہ آمیز نیت بالآخر دو اور سیاسی مرحلوں کے بعد، قائد ملت کی شہادت کا عنوان بنی،

بالآخر نظام کو ہار ماننی پڑی اور نظام کو قائد ملت اور قائد اعظم کی ایماء پر مرحمہ اصلاحات کا اعلان کرنا پڑا لیکن ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عالمگیر چھڑ گئی اور مرحمہ اصلاحات کے ملتوی کئے جانے کا حکومت کی طرف سے اعلان شائع ہوگیا۔

؎ دل کی دل میں رہ گئی افسوس نادانی ہوئی۔

منصب قیادت کی ذمہ داری

حیدری دورِ وزارت

مجلس اتحاد المسلمین کی صدارت کی گراں بار ذمہ داریاں ایک ایسے پر آشوب زمانے میں ان کے کندھوں پر آئی جب کہ برطانیہ ہند سے اٹھنے والی سیاسی تحریکوں کی سیلابی موجوں کا رُخ پوری طرح ساحلِ دکن کی طرف تھا اور دوسری طرف یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمن، پولِستان پر حملہ کر کے دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز کر چکا تھا۔ جنگ کے دوران سیاسی بازی گری نے مصالحت کے پہلو نکالے۔

ہندوستان کو مابعد جنگ مقبوضاتی درجہ دینا طے پایا۔ ایسی صورت میں حیدرآباد کی سابقہ خود مختار حیثیت کی بنیاد پر مفوضہ علاقوں کے استرداد اور حلیف برطانوی حکومت کے درمیان خود مختاری کے مسائل کا سوال تھا۔

نظام والی ریاست اس نازک سیاسی موڑ پر جب کہ ابنائے وطن کو انگریزوں نے سیاسی ہتھیار کے لئے سیاسی مضراب فراہم کئے تھے۔ مصلحت وقت کے تقاضوں کو اپنا رہے تھے اور ان کو اپنی ذات اور دولت کے تحفظ کی طمانیت کافی تھی، ایک مسلمان فرمانروا کی اس ناعاقبت اندیشی سے دکن کے مسلمانوں میں اپنی بے بسی کا احساس جاگا۔ اَب وہ منزل آچکی تھی جب ریاست کے مستقبل کی صیانت کی کامل ذمہ داری منصب قیادت کا فرض بن چکی تھی۔

منصب قیادت کی ذمہ داری کا تقاضہ یہ تھا کہ مستقبل کی صیانت کے لئے مسلک اور نصب العین کو استوار کر کے قومی و سیاسی جدوجہد کی ایسی راہِ عمل متعین کی جائے جو وقت کے سیاسی تقاضوں کا ساتھ دے سکے، قائد ملت اس نازک سیاسی صورت حال میں پورے جوش عمل اور

تنویر یقیں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے چوں کہ مستقبل کی صیانت کی جوابدہی کی تاریخی ذمہ داری اس مرد حر کے شانوں پر تھی۔

قائد ملت نے نظام اور حکومت برطانیہ کو دکن کے مسلمانوں کے احساسات وجذبات سے آگاہ کرتے ہوئے دکن کی آزادی کے تعلق سے جرأت، صداقت اور پوری دیانت کے ساتھ عوامی احساسات کی ترجمانی فرمائی۔

" دوسری عالمگیر جنگ آج صفات انسانیت کی تباہی کا سامان پیدا کر رہی ہے۔ مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کرنی ہے کہ دو متحارب فریقوں میں کون برسر حق ہے لیکن مجھے یہ ضرور دیکھنا ہے کہ اس عظیم الشان جنگ کے نتائج و عواقب ہندوستان اور حیدرآباد پر کیا مرتب ہوں گے۔ جو سوال کبھی کبھی حیدرآبادی مسلمان کے دل میں کھٹک جاتا ہے اور اس کو بے چین کر دیتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کی بے ریا، مخلصانہ اور وفادارانہ دوستی کا تاریخ کے ہر دور میں ان کو کیا صلہ ملا اور آئندہ وہ کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

اگر اس جنگ عظیم کا نتیجہ یہی ہے کہ دو سو سال کا غلام ہندوستان دنیا میں پھر ایک مرتبہ زیر سرپرستی تاج برطانیہ آزادی کی سانس لے تو اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یقیناً یہ ہونا چاہیئے کہ حیدرآباد نے جتنے اقتدارات ذمہ داریاں اور جتنے علاقہ جات اور مقبوضات تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے حلیف کے تفویض کئے تھے وہ سب بلا کسی شرط کے اس کو واپس کر دیئے جائیں اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوں گے کہ ایک طرف حیدرآباد کے جغرافیائی حدود میں برار شمالی سرکار اور مچھلی پٹن داخل ہوں گے اور دوسری طرف حیدرآباد ایک آزاد اسلامی سلطنت کی حیثیت سے آزاد ہندوستان اور دنیا کے دوسرے آزاد ممالک سے اپنے

سیاسی تعلقات قائم کرنے کا مجاز ہوگا۔ (حوالہ: خطبات بہادر یار جنگ ص ۹۲، ۹۳، ۹۵، ۹۷ دارالاشاعت سیاسیہ حیدر آباد)

ایک طرف مسلمانوں کے قائد کی یہ مساعی کہ حیدر آباد اپنے پورے شاندار ماضی اور سابق جغرافیائی موقف کے ساتھ ایک اسلامی حکومت کی صورت میں آزاد و خود مختار حکومت کی حیثیت سے باقی رہے تو دوسری طرف نام نہاد ناخدا کی ناعاقبت اندیشی کا یہ حال کہ بیرونی طوفان کو دعوت نامہ لکھنے اور دام موج کے پہنچنے سے پہلے وہ کشتی حیات کو غرق کر دینے پر مائل تھے۔

ناعاقبت اندیش نام نہاد ناخدا کے حال زار پر تبصرہ کرتے ہوئے قائد ملت نے ارشاد فرمایا:۔

" ہندوستان کے وسیع سمندر میں موجیں اُٹھ رہی ہیں، طوفان آرہے ہیں، سطح مرتفع دکن کے خاک کے ذرے ان طوفانوں کو خود آگے بڑھ کر دعوت دے رہے ہیں اور کشتی دکن کے نام نہاد ناخدا ان طوفانوں کو اٹھتا ہوا دیکھ کر لرزہ بر اندام حیات سے مایوس اور دام موج کے پہنچنے سے پہلے کشتی حیات کو غرق کر دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔

حیدر آباد کی انفرادیت اور استقلال کی بقاء ضروری ہے۔

(حوالہ:۔ خطبات بہادر یار جنگ، دارالاشاعت سیاسیہ حیدر آباد)

" برطانوی حکومت نے جب ہندوستان کو قلمروی مرتبہ دینے کا اعلان کیا تو بہادر یار جنگ کے سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ لگا، انہوں نے پیراموشی کے تار و پود بکھیرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اس مطالبہ میں شدت پیدا کر دی، سیاسی بصارت کا تقاضا یہی تھا اور اس خصوص میں قائدِ ملت کو فوری فیصلہ کر کے دکن کے سیاسی مستقبل کی صیانت کی ضمانت حاصل کرنا تھا۔

سیاست سے زیادہ کسی اور شعبۂ حیات میں فوری فیصلوں کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ (حوالہ: دکن کی ایک کثیر جہتی شخصیت از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۴۴، روح ترقی ۱۳۶۷ھ)

حیدرآباد کی خود مختار حیثیت کی بنیاد پر مفوضہ علاقوں کے استرداد اور حلیف برطانیہ کی حیثیت میں ریاست کی کامل خود مختاری کے مسائل کے حل میں مسٹر گڈنی ریزیڈنٹ کے علاوہ سر فرانسس وائیلی مشیر حکومت ہند سے ملاقاتیں کیں ۔ صدر اعظم باب حکومت کو ایک جامع یاد داشت پیش کی، جس میں وزیر اعظم باب حکومت کو لکھا کہ

اب جب کہ سر اسٹافورڈ کرپس کے ہندوستان بھیجے جانے کا اعلان ہوا ہے، مجلس جناب کی توجہ کو اس طرف منعطف کرانا ضروری تصوّر کرتی ہے یہ امر یقیناً جناب کے پیش نظر ہوگا کہ حیدرآباد کی حیثیت ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے بالکل مختلف ہے ۔ حیدرآباد کا معاہداتی موقف ہمیشہ ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کا رہا ہے اس لئے مجھے اور مجلس کو یقین ہے کہ اس کے مسائل پر عام ریاستی مسائل سے ہٹ کر خصوصی حیثیت میں غور کیا جائے گا حیدرآباد نے اپنے حلیف کی ہر آڑے وقت میں جس کشادہ پیشانی اور وسعتِ قلب کے ساتھ امداد کی ہے اس کے حقیقی اعتراف کا اگر کوئی وقت ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے ۔ (حوالہ: مکتوب نمبر ۲۶۹ مؤرخہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۲ء بنام صدر اعظم مملکت اسلامیہ آصفیہ)

قائد ملت کے اس اعلان آزادی کے مطالبہ سے حکومتی حلقہ میں زلزلہ آ گیا ۔ کنگ کوٹھی سے ریزیڈنسی تک دہلی اور شملہ میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی ۔

نواب صاحب کی سیاسی سرگرمیاں، ساتھ ہی ریاست حیدرآباد سے باہر ان کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت کے باعث حیدری حکومت جو اس موقعہ پر لرزاں و ترساں تھی چاہتی تھی کہ نواب صاحب کے خلاف معاندانہ

حربے استعمال کئے جائیں مگر عواقب و نتائج کے بھیانک تصور سے خائف بھی تھی، اس خصوص میں حکومت ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ سے مشاورت کی کہ وہ نواب صاحب کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔

سَر فرانسِس وائیلی حکومت ہند کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے انچارج بھی تھے۔ جنہیں نواب صاحب کی قیادت کی روز افزوں مقبولیت کا اندازہ تھا۔

پولٹیکل ڈپارٹمنٹ نے جواباً مطلع کیا کہ ریاستی حکومت نواب صاحب کو اپنی ذمہ داری پر گرفتار کرسکتی ہے اس جواب سے اسٹیٹ پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے معہود ذہنی کا پتہ چلا تو حیدری حکومت مجبوراً اس ارادے سے دست بردار ہوگی۔

اصلاحات کے دور سے سر اکبر کی نواب صاحب کے تعلق سے معاندانہ کارروائیوں کا درپردہ سِلسلہ چلتا رہا، نظام کے اطراف ان کے خوشامدی سازشی درباریوں سے سر اکبر نے ایک ایسا حلقہ بنا دیا جو سر اکبر کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں ان کی معاونت کرتا رہا۔ خود نظام کے ذہن میں یہ بات بیٹھا دی گئی کہ نواب صاحب کی بے پناہ مقبولیت سے اس امر کے آثار پیدا ہوگئے ہیں کہ اٹلی کے مسولینی اور جرمنی کے ہٹلر کی طرح وہ دکن میں آمریت اختیار کریں گے، مرحلہ اول تو ختم ہوگیا مگر مرحلہ دوم میں پھر ایک اور سیاسی بساط بچھائی گئی۔

دوسری بساط سیاست

۱۹۴۱ء

جاگیر و خطاب سے دست برداری ۸ رستمبر ۱۹۴۱ء کو جریدہ غیر معمولی میں نظام کا ایک فرمان شائع ہوا جس کی رو سے معاشداروں کو سیاست

میں حصہ لینے پر امتناع عائد کر دیا گیا۔ اس طرح اگر وہ معاشدار (جاگیر دار منصب دار وغیرہ) اپنی معاش سے دست بردار ہو کر سیاست میں حصہ لینا چاہیں تو وہ اپنے فیصلے میں آزاد تھے۔

یہ فرمان قائد ملت کو سیاست کے میدان سے ہٹانے کے لئے سر اکبر اور درباری سازش کا آخری وار تھا، والی ریاست یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح بہادر یار جنگ کو اپنے خطاب، جاگیر اور لوازمہ سے محروم ہونے کا تصور ہی سیاست سے دست بردار ہونے پر مائل کر دے گا۔ دوسری طرف قائد ملت مزاج باغباں سے پوری طرح واقف تھے، اور انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ان کے قومی و ملّی کاموں میں جو ریاست کی بقاء کی ضمانت تھے، حیدری حکومت اور نظام والی ریاست کی بصارت سیاسی سے محرومی کے باعث قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں، نظام اور ان کے سازشی درباریوں کی سازشوں سے وہ پوری طرح واقف تھے اور اس سازش و آزمائش سے مقابلے کے لئے تیار و آمادہ بھی، انہوں نے اس رکاوٹ کے خلاف جو مجلس کے راستے میں پیدا کی جا رہی تھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:-

"مجلس کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ملازمین سرکار کو اس میں شرکت کی ممانعت کی گئی اور اَب معاشداروں، خطاب یافتہ، اور صاحب مناصب واعزاز مسلمانوں کو بھی اس کی شرکت سے ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔"

قائدِ ملت کو نظام کے تعلق سے اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ

"جن کو ہم اپنا سمجھتے ہیں وہ فی الحقیقت ہمارے نہیں۔"

(حوالہ: مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم ص ۴۶)

نظام کے فرمان کی روشنی میں قائد ملت نے ۳ راکتوبر ۱۹۴۱ء کو جاگیر

خطاب، جمعداری سے اپنی دست برداری کا استعفیٰ راست نظام کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس طرح قائد ملت نے جاگیر، جمعداری، موروثی اعزازات پالکی، میانہ چتر، آفتاب گیری، بھالا برچھا، بلم اور ڈنکہ نشان سے سبکدوش ہو گئے۔

نظام نے ہر سطح پر کوشش کی کہ قائد ملت اپنی دست برداری سے دست بردار ہو جائیں مگر یہ ممکن نہ ہو سکا، والی ریاست نے اس خصوص میں فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان اپنی خفت مٹانے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے جاری کیا گیا کہ یہ اتفاق ہے کہ اس قانون کا اطلاق بہادر یار جنگ پر بھی ہوتا ہے کیوں کہ وہ بھی معاش دار ہیں۔ ویسے نظام والی ریاست انہیں اپنا خیر خواہ سمجھتے ہیں اور عقلمند و فہیم بھی۔

"ہم نہیں چاہتے کہ کسی خاص وجہ کے بغیر اُن کو خاندانی اعزاز سے محروم کر دیا جائے اور وہ بلاشبہ ہمارے خیر خواہوں میں سے ہونے کے علاوہ عقلمند اور فہیم ہیں۔"

قائد ملت کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ نظام والی ریاست کو ان کی وفاداری پر شک تھا اور وہ سازشیوں کے ذریعے قائد ملت کی راہِ وفا میں جو ریاست کی صیانت کی ضمانت تھی، کانٹے بچھا رہے ہیں۔

"میں اپنے مالک کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے معاشدار رہنے یا سیاست میں حصہ لینے کا انتخاب خود ہماری صوابدید پر چھوڑا۔ اب سوچنا چاہیئے کہ آیا میں بحیثیتِ معاشدار ہر قسم کی سیاسی کوشش سے الگ رہ کر اپنے مالک کا حق نمک ادا کر سکوں گا یا وقت آگیا ہے کہ سیاسیات حاضرہ سے متعلق رہ کر میں اس نمک خواری کا حق ادا کروں جس کا شرف میری پانچ پشتوں کو نصیب رہا ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ امتحان وفا کا وقت ہے۔ مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خود غرض، تن آساں، بندۂ

زر اور نمک حرام نہ ہو گا، اگر میں اس زمانہ میں محض اپنی جاگیر اور اعزاز کے خیال سے مالک اور ملت و ملک کی خدمت گذاری سے روگردانی کروں۔ یہ تو بہت مبارک ہوا کہ اب دیوانہ کو کوئی محبت جیب و دامن کی فکر سے بھی آزاد ہو رہا ہے۔ میں اس کو اپنے لئے نہ کوئی پابندی سمجھتا ہوں نہ سزا بلکہ یہ تو میرے لئے پروانۂ آزادی ہے، پابندی بھی ایک سزا ہوتی ہے اور میں کسی سزا کا مستحق نہیں ہوں۔

کسی شاعر نے میرے ہی لئے کہا ہے ؎

وفا خطا تھی خطا میں نے زندگی بھر کی
اَب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

میں آج اپنی پانچ پشتوں کے کھائے ہوئے نمک کو حلال کر رہا ہوں اور نہایت مسرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ؎

بیا جاناں تماشہ کن کہ در انبوہِ جاں بازاں
بصد سامان رسوائی سرِ بازار می رقصم
تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خوں خوار می رقصم

انشاء اللہ زمانہ خود بتا دے گا کہ میں کیا ہوں اور میں نے کس طرح اقتدار شاہی کا تحفظ کیا ہے۔

اس خصوص میں ایک اور تقریر میں فرمایا:۔

میرے آشیانے پر بجلی چمک رہی ہے اس کو جل جانے دو، تمہارے لئے یہ مبارک فال ہے، یہی ابر تمہارے گلشنِ حیات پر برسیں گے اور بہت جلد اس میں بہار آئے گی، میں اپنے اجڑے ہوئے آشیانہ کی خاکستر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اٹھاؤں گا۔ ہوائیں چل رہی ہیں۔ ابر پھٹیں گے، آفتابِ امید چمکے گا اور دنیا دیکھے گی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور باطل کے پہاڑ

دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ (حوالہ: بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں، مرتبہ نذیرالدین احمد (ص ۲۷۴ تا ۲۷۹) ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، حیدر آباد (انڈیا)

جب جاگیر سے دست برداری کر لی تو ایک قریبی شخصیت نے پوچھا یہ کیا کیا؟ تو مسکراتے ہوئے نواب صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا:

آ گئے تھے برق کی زد میں تمام اہلِ چمن
ہم نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

"جب بہادر یار جنگ کی شہرت کا سورج اوج پر اور خطابت کا سمندر موج پر تھا تو انہیں ایک روز نظام دکن کی طرف سے دو فرمان ملے۔ جن کے عنوان عطا اور سزا تھے۔ بہادر یار جنگ نے طبیعت مشکل پسند اور حق پسند پائی تھی اس لئے سزا والے فرمان کی رسید لکھ دی، خطاب واپس ہوا اور جاگیر ضبط ہوئی، فقر میں اضافہ ہوا، عزت اور توقیر بڑھ گئی۔

وہ آنکھ جو جذبوں کے سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتی کہ جب ظلمتیں، سحر کے جلووں کے درمیان حائل ہونا چاہتے ہیں تو قانونِ قدرت کے مطابق سحر کے جلوے پوری آب و تاب سے ظلمتوں پر چھا جاتے ہیں اور حادثے جب ظرف و نظر کا امتحان لیتے ہیں تو مردانِ حُر کے حوصلے پست نہیں ہو جاتے۔ یہ مشکلات ان کے دل کا حوصلہ بڑھانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں، جاگیر و خطاب کے چھین لئے جانے کی دھمکی اور شہر بدر کر دیئے جانے کی بابت اس عظیم انسان نے جواباً کیا کہا تھا۔

"مجھے دھمکایا جا رہا ہے کہ میری جاگیرات و خطابات چھین لئے جائیں گے۔ مجھے ڈرایا جا رہا ہے کہ شہر بدر کر دیا جائے گا، جہاں تک جاگیرات کا تعلق ہے میں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ نہ جان میری ہے اور نہ مال میرا۔ سب اللہ کا ہے۔ اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

رہا خطاب کا سوال، جب میں پیدا ہوا تھا میرا نام ماں باپ نے محمد بہادر خاں رکھا اور آپ کی عنایت سے ۱۸ سال سے نواب بہادر یار جنگ کے خطاب سے پکارا جا رہا ہوں اور محمدؐ کی وابستگی سے محروم کر دیا گیا ہوں، بڑا اچھا ہوا کہ وہ محبوب و متبرکؐ نام پھر سے میرے ساتھ ہے ("آوازِ دوست" مختار مسعود) "جال پھینکے گئے، دام بچھائے گئے، اقبال کا شاہین کوہساروں کی بلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز رہا۔ قصر سلطانی کی گنبد کا کبوتر نہ بن سکا۔ آزمائشوں میں عشق فائز المرام ہوا؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ولیعہد کو خطاب کی سرفرازی

۱۹۴۳ء

یکم جنوری ۴۳ء کو اعلیٰ حضرت حضور نظام کے لخت جگر (نواب اعظم جاہ ولیعہد حکومتِ آصفیہ) کو نائٹ آف دی گرانڈ کراس آف دی موسٹ ایکسلنٹ آرڈر آف دی برٹش امپائر؎ برطانیہ کے حکمراں نے اپنی سالگرہ کے موقعہ پر اس خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اس خطاب کی سرفرازی کے دوہی دن بعد ایک بیان شائع ہوا اور ساتھ ہی ولیعہد کے نام ایک خط بھی مبارکباد کا روانہ کیا، اس خط میں اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔

"یہ موروثی وابستۂ دامنِ دولت اجازت چاہتا ہے کہ خواجہ حافظؔ کے ایک شعر میں اپنے مسلکِ زندگی کی وضاحت اپنے آقازادہ پر کرے۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔

تو بندگی کن واز خواجہ التماس مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

قائد ملت کے ۲۶ رجنوری ۱۹۴۳ء کے بیان نے حیدر آباد سے دلّی اور دلّی سے لندن تک سیاسی اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی، حکومت برطانیہ نے اس بیان کو اپنی توہین متصور کیا جس کے جواب میں قائد ملت کو مزید ایک وضاحتی بیان جاری کرنا پڑا جو پہلے بیان سے زیادہ واضح اور سخت تھا۔

"حیدر آباد کی وفادارانہ دوستی کے بدلہ میں وہ جن طریقوں سے حیدر آباد کو خوش کرنا چاہتی ہے وہ کافی نہیں ہیں، حیدر آبادی حکومتِ برطانیہ کے ساتھ اپنی تاریخی دوستی کا صرف ایک معاوضہ سمجھتے ہیں کہ حکومت برطانیہ حیدر آباد کے معاہدات کا احترام کرے اور اسکی آزادی کو تسلیم کرے، میں نے اس حقیقت کو بار بار دہرایا ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کی تاریخ کا ہر باب حیدر آباد کی دوستی کا رہینِ منّت ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں ہم حکومتِ برطانیہ سے اپنے ساتھ صرف اس برتاؤ کی توقع کرتے ہیں جس کا اس نے اپنے بدترین دشمنوں سے وعدہ کیا ہے۔ حکومتِ برطانیہ کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگانے والوں، مساعی جنگ میں رکاوٹیں پیدا کرنے والوں، ریل کی پٹریاں اُکھاڑنے والوں ڈاک کے ڈبّے جلانے والوں اور حکومتی محکمہ جات پر بم پھینکنے والوں سے جنگ کے ختم ہوتے ہی مقبوضاتی مرتبہ کا وعدہ کر رہی ہے اور اس مقبوضاتی مرتبہ کو اس کا وزیر ہند سب سے بڑی آزادی کہہ رہا ہے کیا اس حکومت برطانیہ سے ہم اپنی دوستی کے بدلے میں یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ حیدر آباد کے معاہداتی حقوق کے تحفظ اور اس کی آزادیِ کامل کا غیر مبہم الفاظ میں ہم کو یقین دلائے، شہزادہ والاشان کی خطاب یابی پر میرے بیان کا اس کے سوا کوئی مفہوم نہ تھا لیکن افسوس کہ آج کی دنیا حق وصداقت کو برداشت نہیں کر سکتی اور میرے بیان کو غلط مفہوم میں

لیا گیا۔"

پہلے بیان میں نواب صاحب نے صرف اس قدر فرمایا تھا کہ "پرنس کے واسطے یہ خطاب وجہ ناز نہیں، یہ تو محکومی کی دلیل ہے۔" لیکن دوسرے وضاحتی بیان میں سیاسی مسلک کو بروقت پیش کر کے طوق غلامی سے آزادی کی بات صاف صاف بیان فرمادی۔ اَب اُن بیانات کا اثر طبع نازک پر کتنا گراں گذرا۔

سیاسی اضطراب نے نظام والی ریاست کو حالت پینک سے جگایا کونسل کی میٹنگ ہوئی۔ گرگسن کا خیال تھا کہ بہادر یار جنگ پر مقدمہ چلایا جائے، اسی دوران ریزیڈنٹ کی خفگی نے اس مسئلہ کو سختی سے حل کرنے کے لئے دہلی سے ہدایت حاصل کی۔

۲۲ر جنوری ۴۳ء کو سَر ہنری کریگ سیاسی مشیر حکومت ہند نے سزا کے طور پر یہ تجویز پیش کی کہ :-

(۱) بہادر یار جنگ کو سزا کے طور پر ایک سال کے لئے نظام کے پاس حاضر ہونے کی اجازت نہیں رہے گی۔ (جسے حیدرآبادی زبان میں دیوڑی بند ہونا کہتے تھے۔)

(۲) کسی بھی جلسہ میں وہ ایک سال تک کوئی تقریر نہ کریں۔

(۳) ایک اور تجویز یہ تھی کہ انہیں جاگیر میں قید کر دیا جائے۔

تیسری تجویز پر عمل آوری آسان نہ تھی اس لئے تیسری تجویز سے دست برداری حاصل کر لی گئی۔ بہادر یار جنگ کی آہنی شخصیت اور عوام میں ان کی غیر معمولی مقبولیت سے نظام پوری طرح واقف تھے، بالآخر ایک نرم فرمان کے ذریعے حکومت برطانیہ کے خرمن ناز پر جو بجلی گری تھی اس کا مداوے الم کرنے مندرجہ بالا دو تجاویز کو منظور کر لیا گیا، اور ۲۲ر مارچ ۱۹۴۳ء کو نظام والی ریاست نے زبان بندی کے سلسلے میں

اپنا فرمان شائع کیا۔ اپنی زبان بندی پر نواب صاحب نے اعلان فرما دیا تھا کہ "یہ خاموشی بھی اس وقت تک ہے جب تک کہ .... ملت کا مفاد اس سے متاثر نہ ہو رہا ہو۔"

زبان بندی کے دَور کے ختم پر پندرھویں جلسہ سالانہ مجلس اتحاد المسلمین منعقدہ ورنگل ۴۴ ۲ر مئی ۱۹۴۴ کو ولیعہد کے خطاب کے مسئلہ پر قائد ملت نے پھر ایک بار بڑی وضاحت سے معاہداتی موقف کی روشنی میں ریاست حیدرآباد کی آزادی کے مسئلہ پر اپنے سیاسی موقف کی پوری جرأت کے ساتھ وضاحت فرمائی:۔

"شہزادہ والاشان ولیعہد بہادر سلطنتِ آصفیہ کی خطاب یابی پر میں نے جو بیان دیا تھا اور جس پر نمائندۂ تاج اس قدر چراغ پا ہوئے، میں آج بھی بلاخوف لومۃ لائم اس بات کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ حیدرآباد کے باشندوں کو حکومتِ برطانیہ سے یہ بجا شکایت ہے کہ وہ حیدرآباد کی دوستی اور اس کے احسان کا صحیح صلہ حیدرآباد کو نہیں دے رہے ہیں اور جو طریقے حیدرآباد کو خوش کرنے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں، حیدرآبادی نہ ان سے مطمئن ہو سکتے ہیں نہ خوش۔ اب حیدرآباد کا شعورِ عامہ اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ حکومت برطانیہ ان کھلونوں سے حیدرآبادیوں کے دل نہیں لُبھا سکتی۔ اس سے اس مطالبہ کا حق رکھتا ہے کہ جلد سے جلد اعلان کرے کہ حیدرآباد از روئے معاہدات آزاد ہے اور بعد از اختتامِ جنگ اس کو کامل اختیار ہوگا کہ ہندوستانی حکومت کے ساتھ جس قسم کے تعلقات چاہے بذریعہ معاہدات قائم کرے، نیز جو معاہدات اس وقت تک حیدرآباد نے حکومتِ برطانیہ کے ساتھ کئے ہیں جنگ کے ختم ہوتے ہی بعجلت ممکنہ ان کی نظر ثانی اور تجدید کی جائے گی اور حیدرآباد کو حق ہوگا کہ برطانیہ کے ساتھ اپنی دوستی اور تحالف کو زیادہ مضبوطی سے باقی رکھتے ہوئے دنیا کی دوسری آزاد حکومتوں سے سفارتی تعلقات پیدا کرے۔

(۳) صاف اور غیر مبہم اعلان کرے کہ تاریخ کے مختلف اَدوار میں حیدر آباد کے جو علاقے حکومتِ برطانیہ نے جاگیر، اخراجات، ترتیب فوج یا پٹہ کے طور پر حاصل کئے ہیں وہ ہندوستان کو مقبوضاتی مرتبہ ملتے ہی حیدر آباد کو واپس کر دیئے جائیں گے تاکہ حیدر آباد اپنی اصلی حالت پر عود کر سکے اور ساحلِ سمندر تک وسیع ہو کر اپنے ملک کی خوشحالی کو بڑھا سکے۔

میں سب سے زیادہ زمانہ کی اس کجروی سے نالاں ہوں کہ سچی بات کو عقل کی ترازو میں تولنے کی بجائے جذبات کے ہتوڑے سے توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

قائد ملّت کی زبان بندی پر عوامی احساسات و جذبات حد درجہ مشتعل تھے، دکن کے جوان فکر شاعر نظرِ حیدر آبادی مرحوم کے منظوم احساسات، زبانِ زدِ خاص و عام تھے۔

کیا کہا! تو اور پابندی، خدارا رحم کر
دیکھ سینوں میں دھڑکتے دل مچلتے اشکِ تر

قلبِ عالمگیرؒ کی دھڑکن نہاں رکھتے ہیں ہم
سطوتِ ٹیپو کی تیغ خوں فشاں رکھتے ہیں ہم

آج بھی دل مچلتا ہے وہ جوشِ انقلاب
جس نے پیری سے بدل ڈالا تھا قوموں کا شباب

دے ہمارے ہاتھ میں ذوقِ جنوں کا ساز دے
اے امیرِ کارداں آواز دے آواز دے

پورے ایک سال کی زباں بندی کے بعد

؎ خاموشی ٹوٹ گئی، نطق کے عنوان جاگے

وزارت کا جال

۱۹۴۳ء

خطاب و جاگیر واپس کر کے وہ اپنا ذہنی بوجھ اتار چکے تھے مگر نواب میر عثمان علی والی ریاست حیدرآباد کو اپنی مجرمانہ طرزِ فکر کے باعث یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ جاگیر و خطاب کی زنجیروں سے رہا ہو کر یہ میرے لئے اور بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں اس لئے انہیں وزیر بنا دیا جائے تو وزارت کی یہ بیڑی انہیں پابہ وفا بنائے رکھے گی۔ چنانچہ قائدِ ملت کو ۱۹۴۴ء تک ۳ مرتبہ وزارت کا خود والی ریاست نظام کی جانب سے پیش کش کیا گیا لیکن اس مردِ حر نے صاف صاف کہہ دیا:-

"میں کرسی وزارت پر بیٹھ کر مہماتِ سلطنت پر غور کرنے کے لئے نہیں بلکہ گرد کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ میرا مقام صرف دامنِ کوہ اور وسعتِ صحرا ہے، میں وہ مزدور ہوں جو راستہ تیار کرتا ہے کہ ملت کی گاڑی آسانی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے اور میرے لئے یہی فخر کافی ہے کہ میں وابستہ دامنِ محمدیہ سے ہوں۔" (حوالہ: بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں۔ مرتبہ نذیرالدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، حیدرآباد)

جاگیر اور خطاب کی واپسی

ایک اور سیاسی چال

۱۹۴۴ء میں پھر نظام نے یہ طے کیا کہ نواب صاحب کا خطاب و جاگیر وغیرہ واگذاشت کر دی جائے جو بعنوان " نذر پیش کردہ بہادر یار جنگ قبول کردہ محفوظ در خاندان او (یعنی برائے او) کا ذکر ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۴۳ء کو نظام گزٹ میں شائع ہوا۔

۱۹۴۴ء میں سر سعید الملک نواب صاحب چھتاری صدر اعظم تھے انہیں نظام نے اس خصوص میں کہا " سرکار نے فرمایا کہ سالگرہ کے موقعہ پر بہادر یار جنگ کی جاگیر واپس کر دی جائے، ریزیڈنٹ سے کہنا کہ میری بھی یہی رائے ہے "۔ (حوالہ: یادِ ایام حصہ سوم از نواب صاحب چھتاری ص ۱۶۱۔ ۷ مارچ ۱۹۴۴ء)

۱۶ مارچ ۱۹۴۴ء کو نواب صاحب چھتاری نے اس خصوص میں ریزیڈنٹ سے ملاقات کی، " ریزیڈنٹ سے بہادر یار جنگ کی واپسی جاگیر کے متعلق گفتگو کی "۔ (یاد ایام ص ۱۶۲)

یہ اعلان صرف یہ جاننے کے لئے کیا گیا تھا کہ اس اعلان کے بعد بہادر یار جنگ کا سیاسی رویہ تبدیل ہوتا ہے یا نہیں۔ قائدِ ملت کو واپسی جاگیر و خطاب سے کوئی دلچسپی باقی نہ تھی جب نظام نے دیکھا کہ اس فرماں عطا کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے تو منشار فرماں جاری ہو چکا تھا جس کی تعمیل بھی فرمادوا پر واجب تھی۔

بالآخر یکم رجب ۲۳ جون ۱۹۴۴ء کا دن آگیا جس دن والی ریاست کی سالگرہ تھی، خطابات سے نوازے جانے والے نوازے گئے مگر قائدِ ملت کی نہ تو جاگیر بحال کی گئی اور نہ ہی خطاب اور اس خصوص میں کوئی فرمان بھی جاری نہیں کیا گیا۔

البتہ ۳ رجب ۱۳۶۳ھ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء سالگرہ کے تیسرے دن والی ریاست کی ایما پر (چونکہ نظام کی مرضی اور منشا کے بغیر نظام کے

مطلوب سازشی اتنا بڑا اقدام کرنے کی جرأت تو بڑی بات ہے، سوچنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔) ریاستی سیاست اور درباری سازش نے، ہاشم علی خاں رکن عدالت العالیہ کے گھر پر ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں دو کے سوا باقی سب ہی اس سازش میں شریک افراد تھے، اعلاء حکمۃ الحق کا جو خمیازہ علامہ جمال الدین افغانی کو ترکی میں بھگتنا پڑا، وہی بہادر یار جنگ کے لئے (ہاشم علی خاں کے گھر) حیدرآباد میں مقدر تھا۔

جمال الدین افغانی کو زہر آلود خلال کے ذریعے ختم کیا گیا اور بہادر یار جنگ کو دعوت طعام میں کھانے سے قبل حقہ میں زہر دیا گیا، بہادر خاں کی آواز سے خسروی دبدبۂ شہنشاہی پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، اعیان مملکت اور عمائدین سلطنت پر غشی طاری ہو جاتی تھی، ان کی سیاسی بصیرت اور آواز حق سے شاہی کاخ و ایوان کی بنیادیں ہل گئیں تھیں۔ بالآخر نظام نے سازش کا ایک جال بچھایا اور طے پایا کہ اس کا راستہ روک دینا چاہیئے، اس کا گلا گھونٹ دینا چاہیئے۔ وہ مرد مومن ان حربوں سے واقف تھا، نظام کی سانس کے ہلکے سے ہلکے زیر و بم کا نفسیاتی پس منظر بھی نواب صاحب کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہا۔ وہ مزاج باغباں سے خوب واقف تھے، لیکن وہ اپنی زندگی کی پرواہ کئے بغیر امتحانوں اور آزمائشوں سے گذرتے رہے۔

بہادر یار جنگ ریاست حیدرآباد کے والی اور ریاست کے عوام کیلئے شمع راہ وفا تھے مگر نظام نے انہیں راہ کا پتھر سمجھا، کیا خبر تھی کہ شرادوں میں تُلے گی شبنم۔ انہوں نے نظام کی راہ وفا کی دھوپ میں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور سہ

یوں جاں دی وفا میں کہ قاتل تمام عمر
دل کی عدالتوں میں سزا ڈھونڈتا رہا۔

جب یہ خبر عام ہوئی کہ فرشتہ اجل نے فرمان قضا سنا دیا ہے، یقین کرنے کو کوئی تیار نہ تھا، بات تھی ہی کچھ ایسی ۔ ہر شخص کے ذہن میں بس ایک ہی سوال تھا ہمارے قائد کو کس نے اندھیروں کے حوالہ کر دیا ۔

۴ رجب ۱۳۶۳ھ م ۲۶ رجون ۱۹۴۴ء جس دن تدفین عمل میں آئی اس دن والی ریاست بیت الامت آئے اور پون گھنٹہ نعش کے قریب رہے اور اپنے تاثرات کا اظہار فرماتے رہے جسے صحیفہ نگار فوری نوٹ کرتے رہے ۔ دوسرے دن اخبارات مقامی میں "ارشاد شاہانہ" کے زیر عنوان یہ تاثرات شائع ہوئے ۔

"ارشاد شاہانہ"

ان کی خدمات ان کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھیں گی، ان کا بدل نہیں مل سکتا، حضور اقدس نے فرمایا کہ یہ بڑا نازک زمانہ ہے ، یہ وقت ان کی خدمات کا تھا، جو کام انہوں نے قوم و مذہب کے لئے انجام دیئے وہ ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رکھیں گے ، انسان کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے ان کا بدل نہیں مل سکتا ۔ سیکڑوں برس صبح و شام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے ۔ جو اپنی صفات اور خدمات کی وجہ سے قوم میں ہر دل عزیز ہو جاتا ہے ، تین برس پہلے بھی ان کی صحت خراب ہو گئی تھی ، میں نے ان کو زیادہ محنت نہ کرنے کی نصیحت کی تھی انہیں اس وقت حلق کا مرض تھا ۔

یاد تازہ رکھو :- بندگان عالی نے ارشاد فرمایا کہ اب تم لوگوں کا یہ ایک ہی کام ہے کہ بہادر یار جنگ کی خدمات کی قدر کرو اور ان کی یاد تازہ رکھو ۔ میت کا چہرہ دیکھ کر فرمایا کہ بیماری کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے ، اگر چھ مہینے بھی بیمار پڑتے تو گھل نہیں سکتے تھے ۔ ان کی صفات سب کو معلوم ہیں اور سب پر ظاہر ہے ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ۔ یہ

وقت آہ وزاری کا نہیں صبر کا ہے۔ مرتے سب ہیں لیکن ایسی موت جو وقت سے پہلے ہوتی ہے، بیشک جانکاہ ہوتی ہے، موت سب کے لئے ہوتی ہے امیر وغریب شاہ وگدا کسی کو اس سے مفر نہیں دنیا میں انسان باقی نہیں رہتا لیکن اس کے اوصاف باقی رہتے ہیں۔

ان کے کام کو پورا کرو:۔ جو چیز انہوں نے چھوڑی ہے اس کو زندہ رکھو جس کام کو انہوں نے شروع کیا تھا اس کو پورا کرو، انہوں نے اپنے مذہب وملت کی بڑی خدمت کی، بڑا کام کر گیا۔

انقلاب کو گذر جانا چاہیئے تھا: یہ بھی ارشاد شاہانہ ہوا کہ یہ زمانہ بڑا نازک ہے اس انقلاب کو گذر جانا چاہیئے تھا، مولوی ہاشم علی خاں صاحب رکن ہائیکورٹ بھی تھے جن کے مکان میں قائدِ ملت کی روح پرواز ہوئی، ان سے بندگان عالی نے تفصیلات دریافت فرمائیں، استفسار ہوا کہ نماز جنازہ کہاں ہوگی، پون گھنٹہ تک ذات شاہانہ میت کے پاس رہے۔

نظام والی ریاست کے ارشاد شاہانہ میں بہادر یار جنگ کی عظمت کا اعتراف کہ سیکڑوں برس صبح وشام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے"

اور مادہ تاریخ رحلت بہادر یار جنگ مرحوم کے زیرِ عنوان اپنے تاثرات میں نظم اور نثر میں ان کی موروثی جاں نثاری اور ان کے خدمات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ جاگیر اور خطاب کی واپسی کا ذکر ملتا ہے ان تاثرات سے نظام کی بہادر یار جنگ سے محبت ان کی وفاداری اور موروثی جان نثاری پر یقین اور ان کے جدا ہونے پر گہرے رنج اور ملال کے احساسات ملتے ہیں، قبل اس کے کہ اس خصوص میں اس حقیقت کا

جائزہ لیا جائے کہ ؎

کس کا خنجر کس کا سینہ، سائے تک مبہم غیاث
یہ روایت آنکھ والوں نے کبھی لکھی نہیں،

پہلے ہم مادہ تاریخ کو بھی پڑھ لیں اور پھر ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ ؎

کتنی تحریریں سجی ہیں وقت کی دیوار پر
کون کہہ سکتا ہے کیا مٹ جائے کیا باقی رہے،

مادہ تاریخِ رحلت بہادر یار جنگ مرحوم

(بانی مجلس اتحاد المسلمین دکن)

گرفتہ بخششے از دست قادر (خدا) | برائے حفظِ حقِ قوم نادر
بگفتہ کارِ اُو در گوشِ عثمان | بہادر بود و خود در جنگ ماہر (در صفت) (تجربہ کار)
(جانباز) سنہ ۱۳۶۳ ہجری)

نوٹ :- ہر چہ خدمات بے لوثانہ اُو برائے قوم و ملت خویش انجام دادہ بود ضرور قابلِ ستایش وہم ایں امر بہ شکلِ یادگار اُو در قلوبِ آں ہا خواہد ماند بہ تشکر و امتنان علاوہ موردی جان نثاریٔ اُو برائے ملک و مالک۔

خدا اُو را غریق رحمت بکناد

دیگر ما دہم پرنس آف برار بغرض تعزیت بہ خانۂ او رفتہ بودیم مگر بہ کسلمندیٔ مزاج جو نبر پرنس متعذّر بود۔

نکتہ : مسئلہ بحالیٔ خطاب وجاگیر وغیرہ زیرِ غور بود خدارا منظور

نہ بود کہ آں تازہ بکند لہذا بہ اختتامِ حیاتِ اُو راہم داخلِ دفتر کرد۔ (بہ خدا اُو) واین چہ راز است مانمی گوئیم کہ در این چہ مصلحت پوشیدہ بود بہ ہر حال مضٰی مامضٰی (علم این تجویز مرحوم می داشت)

(منقول از صبح دکن مؤرخہ ۲۲ امرداد)

صدر اعظم مملکت اسلامیہ آصفیہ (سر سعید الملک نواب صاحب چھتاری) کی زبانی بہادر یار جنگ کی شہادت کے بارے میں والی ریاست اور ریزیڈنٹ کے حقیقی تاثرات قلبی سے آگاہی ہوتی ہے۔

۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو میرے یہاں مسٹر راما مورتی کا ڈنر تھا۔ "مدارس" کے گورنر کے مشیر تھے، دریائے سنگھبدرا میں بند لگا کر نہر نکالنے کا مسئلہ اور مدراس و حیدرآباد کے درمیان پانی کی تقسیم کا مسئلہ زیر بحث تھا، جس کا تصفیہ بخیر وخوبی ہو گیا، حیدرآباد کے نمائندے نواب علی نواز جنگ تھے جو انجنیر ہونے کے اعتبار سے بڑے بلند پایہ ماہر فن تھے۔

ڈنر کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ بہادر یار جنگ، ہاشم علی خاں کے یہاں کھانے پر گئے تھے، کھانے کے بعد حقہ آیا جوں ہی اُس کا کش لیا دل کی حرکت بند ہو گئی۔ مجھے ان کے انتقال کا افسوس ہوا یہ اچھے معاملہ فہم تھے، حیدرآباد میں عموماً اور وہاں کے مسلمانوں پر خصوصاً ان کا بہت اثر تھا۔ میں صبح کو ان کے مکان پر تعزیت کے واسطے گیا۔ اسی وقت سرکار بھی تشریف لائے، تجہیز و تکفین میں شریک ہوا، بہت بڑا مجمع تھا۔

پھر اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوا، مجھے زین یار جنگ سے سرکار کے خیالات معلوم ہو چکے تھے۔ سرکار نے فرمایا کہ بتائیے تمہاری رائے ان کی موت کے متعلق کیا ہے، میں نے کہا کہ ان کے انتقال سے سرکار کا ایک بڑا خادم اٹھ گیا لیکن خدا کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ فرمایا ان کے عروج سے ضرور فتنہ کا اندیشہ تھا بعدہٗ اور کچھ مرحوم کے متعلق فرماتے

رہے ۳۰ر جون کو جب میں ریزیڈنٹ سے ملا تو ریزیڈنٹ نے بھی بہادر یار جنگ کے انتقال کے متعلق وہی خیالات ظاہر کئے کہ جو نظام کے تھے انہوں نے کہا ذاتی طور سے مجھے افسوس ہے لیکن یہاں کے انٹرسٹ کے پیشِ نظر یہ بُرا نہ ہوا۔

(حوالہ: یاد ایام از نواب احمد سعید چھتاری ص ۱۶۶، ۱۶۷)

والی ریاست کا یہ خیال کہ" ان کے عروج سے ضرور فتنہ کا اندیشہ تھا" اور ریزیڈنٹ کا یہ خیال کہ ذاتی طور پر مجھے افسوس ہے لیکن یہاں کے انٹرسٹ کے پیش نظر یہ بُرا نہ ہوا۔ اصلی مجرم کی نشاندہی کیلئے ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے، اصولِ قانون شہادت کی روشنی میں، واقعات کی صداقت کے ضمن میں "کسی قضے سے آدمی کا ذہنی اتفاق اس کو شریک جرم بناتا ہے"۔

"سیاسی قتل جو حکمراں طبقے کی طرف سے منظم کیا گیا ہو ایسی صورت میں دستاویزی شہادت کا تصور امر محال ہے، قرائنی شہادت قیاسی بھی ہو سکتی ہے اور قطعی ..... بھی، قرائنی شہادت کے انحصار میں طرز عمل کے ارادی علامات شامل ہیں اور سنگین معاملات میں خفیف قیاس کافی ہے"۔(قانونِ شہادت)

اصلاحات کے دور سے ۲۵ر جون ۱۹۴۴ء تک کے واقعات میں نظربندی، ملک بدر کرنے کی تجویز، معاش داروں پر تحدید کے ذریعے جاگیر و خطاب کی واپسی، زبان بندی، نقل و حرکت پر مکمل نظر اور ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کے تعلق سے اس باب میں سلسلہ وار جو واقعات پیش ہوئے ہیں۔

اصول قانون کی شہادت کی روشنی میں واقعات متذکرہ کو اگر قیاس کی بنیاد پر پیش کیا جائے تو قیاس کی تعریف اور اس ظن سے بھی حقیقت بے نقاب ہوتی ہے۔

رومی قانون دانوں نے قیاس کی تعریف یہ کی ہے کہ" وہ اندازہ جو یقینی علامات سے کیا جاتا ہے اس ظن سے جو شہادت سے ذہن میں پیدا

ہوتا ہے، وہ صداقت کی خفی لیکن معقول علامت ہوتا ہے، جس کو عقلار کی رائے بے نقاب کر دیتی ہے۔" (اصول قانونِ شہادت از ڈبلیو۔ اے۔ بسٹ)

"قیاسی شہادت اور وہ قیاس جو اس سے پیدا ہوتا ہے اپنی شہادتی وقعت کے لئے قانون صریح کے رہین منت نہیں ہیں، ایک واقعے کا دوسرے واقعے سے نتیجہ نکالتے وقت (یہ فرض کرتے ہوئے کہ نتیجہ صحیح نکالا گیا ہے) عدالتیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتی ہیں کہ تہذیب قانون کے تحت اس طرح تعقل کرتی ہیں جس طرح کہ کسی ذہین آدمی کا ذہن ایسے ہی حالات میں خود اپنے طور پر کرتا ہے جس کی قوت کلیۃً فطرت کے طریقے، ذہن انسانی کی ساخت، انسانی عمل کے سوتوں اور معاشرے کے رواجات وعادات کے تجربے و مشاہدے پر موقوف ہوتی ہے۔" (قانونِ شہادت، از ڈبلیو۔ اے۔ بسٹ، مترجم ڈاکٹر سیادت علی خاں)

"قدرتی عقل پر مبنی قیاس قانونی، قانونی عقل پر مبنی قیاس سے زیادہ قوی و مضبوط ہوتا ہے، کسی دریا میں موج کا ہونا اس کے قابل جہاز رانی ہونے کی قیاسی شہادت ہے۔"— "

بہت سے قیاسات علم پر مبنی ہوتے ہیں مثلاً کسی شخص کے متعلق قیاس ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے قیاسی شہادت تقریباً ہر واقعے کو ثابت کرنے پیش ہو سکتی ہے لیکن اس سے کام لینے کی ضرورت بہ نسبت دیوانی کارروائیوں کے فوجداری کارروائیوں میں زیادہ ہوتی ہے، نہایت مذموم و شدید جرائم اکثر مخفی طور پر کئے جاتے ہیں اور سیاہ کاریوں کی نمایاں شہادت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ قیاسی شہادت کی ایک زنجیر سے بھی ویسا ہی یقین آفریں ثبوت فراہم ہوتا ہے جیسا کہ عینی شہود کی گواہی سے۔"

اصل عنصر ارادہ ہوتا ہے، یہ سب جرائم چوں کہ نفسیاتی نوعیت کے ہوتے ہیں ان کو قیاسی شہادت سے ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جو واقعات نفس جرم کی بنیاد ہوتے ہیں ان کو قیاسی شہادت کے ذریعے سے ثابت

کرنا چاہیئے۔ بنیاد نفس جرم ایک وقت ظاہر ہو جائے تو اس کے ثبوت کو مکمل کرنے کے لئے قیاسی شہادت قابل ادخال ہوتی ہے۔

نازک ترین سوالات مقدمات زہر خورانی میں پیدا ہوتے ہیں، زہر خورانی کی شہادتیں یا تو جسمانی ہوتی ہیں یا اخلاقی، اس امر کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ تمام واقعات و حالات جو دراصل گذرے ہیں وہ کاملاً ایک دوسرے سے متوافق تھے، کیوں کہ فی الواقع وہ ایسے تھے۔

قیاسی شہادت کی وضاحت ایک مقنن نے یوں کی ہے کہ "وہ شہادت جو ملزم کے عمل یا موقف سابق سے حاصل ہوتی ہے اس عنوان کے تحت ارتکاب جرم کے وجوہ ہائے تحریک ارتکاب کے ذرائع و مواقع، تیاریاں اور اقدام اس کے ارتکاب کے ارادے کا اعلان اور دھمکیاں آتے ہیں۔

ارتکاب جرم کے ارادے کا اعلان اور اس کے ارتکاب کی دھمکیاں جس سے مجرمانہ ارادے کا اظہار ہوتا ہے، تجربہ شاہد ہے کہ مجرمانہ دھمکیاں دیر سویر اکثر پوری ہوتی ہیں۔

دھمکیوں کی اکثر پرواہ نہیں کی جاتی اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بہت سے جری اشخاص کا محض دشمن کے الفاظ کی اسی حقارت کی بنا پر اپنی حفاظت نہ کرنے کی وجہ سے موت کے گھاٹ اترنا مشہور بات ہے"۔ فوجداری مقدمات میں مجرم بنانے والی قیاسی شہادت تین عام عنوانات میں منقسم ہوتی ہے۔

(۱) مادی شہادت یا شہادت اشیاء۔

(۲) وہ شہادت جو ملزم کے عمل یا موقف سابق سے حاصل ہوتی ہے اس عنوان کے تحت ارتکاب جرم کے وجوہائے تحریک ارتکاب و مواقع، تیاریاں اور اقدام، اس کے ارتکاب کے ارادے کا اعلان اور دھمکیاں آتے ہیں۔

(۳) شہادت جو ملزم کے عمل مابعد سے ہم تک پہنچتی ہے اس عنوان کے

تحت شہادت کو جعلی بنانا، انصاف سے گریز کرنا، عہدداران انصاف کو ملا لینے کی کوشش کرنا، خاموش طرزِ عمل یا خواہش اخفا۔

ارتکاب جرم کے وجوہائے تحریک کے ضمن میں شبہ ہوتا ہے کہ اس جرم کے ارتکاب میں اس کا حصّہ ہے تو اس کی وجہ تحریک کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے وقیع ہونے کی بابت کوئی شک نہیں ہو سکتا۔، تمام قسم کی تیاریوں ہیں جن کا مقصد مجرم پر شبہ نہ ہونے دینا ہوتا ہے خاص توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔

تیاریوں اور سابقہ اقدامات پر مبنی قیاس اس خاص جرم کے ارتکاب کا ارادہ ملزم کے ذہن میں قائم ہو چکا تھا اور اس وقت تک باقی رہا جب تک اس کی تکمیل کی قوت اور موقعہ حاصل ہوا۔"

(قرائنی شہادت اپنی ماہیت میں اتنی ہی اصل ہوتی ہے جتنی کہ بلا واسطہ شہادت، علاوہ ازیں واقعات کو بلا واسطہ گواہی سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے اور قرائن سے بھی۔

قیاسی شہادت بلا واسطہ شہادت سے کمتر درجے کی ہوتی ہے کیوں کہ وہ بلا واسطہ شہادت کا ایک بدل ہوتی ہے مگر اس امر کو جو بصورت دیگر ثابت ہی نہیں کیا جاسکتا تھا ثابت کرنے کا ایک بالواسطہ طریقہ ہوتی ہے، اسی لئے قابل اعتبار بلا واسطہ شہادت کا کوئی جز اس واقعے کی قابلِ اعتبار قیاسی شہادت کے ایک مساوی جز سے ہمیشہ بہتر ہوتی ہے اور امور ثابت شدہ اور امر تنقیح طلب سے بہت ہی قریب"۔

"تاریخی قیاس جس کے آئینہ ... پر اخلاقی شہادت کی منتشر شعاعیں مرتکز ہوتی ہیں ناقابلِ انکار ہوتا ہے۔

قانونی فکر کا ایک اور اہم اور مرکزی نقطہ وجدانی اور حسی علم ہے اور ساتھ ہی قدرتی عقل و انصاف کے مسلمہ اصولوں کو بھی قانون

نظر انداز نہیں کرتا۔ لیکن وجدانی اور حسّی علم کے تعلق سے اصول قانون شہادت بھی اس اہم موضوع کے دو مجبور پہلو پیش کرتا ہے۔

"تمام امور جو وجدانی یا حسّی علم کے موضوع ہیں یا تو ثابت نہیں کئے جا سکتے یا ثابت نہیں کئے گئے"۔

اصول قانون شہادت میں اس کے ذیلی عنوانات اور اس کے متعلقات کے قطع نظر" قدرتی عقل وانصاف کے عالمی طور پر مسلمہ اصولوں کے پسِ منظر میں قانون کی مصنوعی عقل ومصلحت کے یہ طابع ہوتے ہیں"۔

"تاریخی صداقت کی تحقیق میں اور ان واقعات کی تحقیق میں جو عدالتوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں فرق ہوتا ہے۔

مخصوص خطرات اس کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ان کے مقابلے کے لئے مخصوص تحفظات وضع کئے جائیں، حالانکہ قدرتی شہادت میں اصل واقعے کا تعلق وجدان پر چھوڑ دیا جاتا ہے"۔

ان سارے اصول ہائے قانونِ شہادت کی وضاحت کے باوجود خود اصول قانونِ شہادت کے مصنف کو تاریخ دستورِ انگلستان کے حوالے سے استفادہ کرنا پڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جس میں حقیقت کو زندہ دفن کر دیئے جانے کے بعد بھی اس کے وجود کو مقبروں کی شکل میں وہ محفوظ سمجھتا ہے۔

"سچ کی ضمانتیں جدا جدا ہیں۔ آئندہ نسلوں کو ایسی عدالت کہا جاتا ہے جس کے روبرو ماضی کے غلط فیصلہ جات سے مرافعہ کیا جاتا ہے۔

ماضی کی روایتوں اور تاریخوں کی جو مرورِ زمانہ سے ہم تک پہنچتی ہیں سچائی کی ضمانتیں ہوا کرتی ہیں، جن کا کئی ماخذوں سے پتہ چلتا ہے۔ سب سے بڑھ کر حالات کے مستقبل نتائج ہوتے ہیں جو مقبروں کی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور باقی رہتے ہیں"۔ (حوالہ: تاریخِ دستورِ

انگلستان، از HOLM جلد ۲ ص ۱۰۶) مشمولہ اصول قانون شہادت)

اور ایسا ہی مرافعہ ان صفحات میں والی ریاست میر عثمان علی خاں کے خلاف بہادر یار جنگ کی شہادت کے سلسلے میں پہلی بار حق کی عدالت میں پیش ہوا ہے۔ تاریخ کے صفحات پر لکھی ہوئی ہر سطر صداقت کی آئینہ دار نہیں ہوتی، وقت کے تقاضوں کے ہاتھوں مجبور مؤرخ، ایمان کی دولت سے محرومی کے باعث صداقت سے دوری، صداقت شعار انسانوں سے کی گئی ناانصافیوں اور مظالم کی داستانیں یا تو حذف کر دیتا ہے یا ان کی صورت کو اس انداز میں بدل دیتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو تاریخ کے صفحات پر منوانے کے قابل نہیں رہتے۔

حصولِ اقتدار کی چاہ یا نشہ اقتدار نے شاہوں کو اقتدار کے حصول یا اقتدار پر اختیار کی صورتوں میں ہمیشہ معصوموں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کی کھلے عام اجازت دی، حصولِ اقتدار کی چاہ میں اورنگ زیب نے اپنے ضعیف العمر باپ شاہ جہاں کو قید کیا تھا اور قید ہی میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

سلطان قلی قطب بانی سلطنت قطب شاہیہ نے ننانوے[99] برس کی عمر پائی، جب ان کا سن ننانوے برس کا ہوا تو ولی عہد یار قلی جمشید اپنے باپ کی مدت سلطنت اور طویل العمری سے عاجز آ گیا اور ۱۵۴۳ء کو سلطان قلی قطب کو جب کہ وہ قلعہ کی جامع مسجد میں نماز عصر پڑھ رہے تھے جوں ہی سجدے کیلئے سر جھکایا میر محمد ہمدانی قلعدار کے ذریعے سلطان قلی کا سر قلم کروا دیا۔

جلال الدین خلجی بڑا نیک بادشاہ تھا، اُسے علاء الدین نے جو اس کا بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی، مکر و فریب سے قتل کر ڈالا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عوام اپنے محبوب بادشاہ کے خون ناحق کا انتقام لیتے مگر ایسا نہیں ہوا یہ بات ایک حقیقت ہے کہ بچوں کی طرح عوام کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا، عوام

یا خوف سے نہیں بولتے یا نوالہ دے کر ان کا مُنھ بند کر دیا جاتا ہے۔
علاء الدین کرڑا سے جہاں خلجی کا قتل ہوا، دلی تک اس خزانے کی رقم جو دولت آباد سے لوٹ کر لائے تھے، یہ سونے چاندی کے سکے لٹاتا چلا گیا رعایا نوازی کے اس عمل نے جلال الدین خلجی کے ساتھ ساتھ اس کی یادوں کو بھی دفن کر دیا اور کسی نے اُف تک نہ کی۔
شاہی کے دَور میں سارے اختیارات کے خزائن ارضی بادشاہوں کے قبضے میں ہوتے ہوئے بادشاہوں کے مزاج، شک، انا اور نفرت کی میراث کو سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں کہ یہی ان کا مقدر ہوتا ہے۔

ے ہم کو نفرت کی میراث سونپی گئی
ہم امیں تھے امانت سنبھالے رہے
طوق زخموں کا گردن میں ڈالے رہے

شاہ اور شاہزادے شک اور سازش کے پروردہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاہوں کو چلتی ہوا پر بھی شک ہوتا ہے۔ یہ اَب کیوں چلی اور اِسی وقت کیوں چلی اور چلی تو اتنی زور سے کیوں چلی۔
بادشاہ ہر لمحہ اپنی انا کی دنیا میں اپنے وجود کا خود سے ثبوت طلب کرتا ہے، شاہ کی خوابیدہ تمنا جاگ اُٹھتی ہے، اس کے ارد گرد اس کی سلطنت میں ہر ایک کو وہ کٹھ پتلی کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے وہ کٹھ پتلی جو ڈور کے کنارے پر ہر اشارے پر رقص کرتی رہے۔
بہادر یار جنگ کے بارے میں نظام کا یہ خیال " مجھے اندیشہ ہے کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب کہ اُن کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میرے خیال میں ان کی مثال آئینہ خانہ میں ایک سانڈ کی سی ہے۔"
(حوالہ: فرماں روائے دکن کا خط قائداعظم کے نام
مؤرخہ ۲۶ رمئی ۱۹۴۱ء)

اور بہادر یار جنگ کی شہادت کے بعد نواب صاحب چھتاری صدر اعظم حکومت آصفیہ سے یہ کہنا کہ "ان کے عروج سے ضرور فتنہ کا اندیشہ تھا" یہ جملے نظام کے جذبۂ نفرت و انتقام کے آئینہ دار ہیں (یادِ ایّام جلد سوم)

سازشی درباریوں نے نظام کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ بہادر یار جنگ نظام کو تخت سے ہٹا کر خود حکمراں بننا چاہتے ہیں اس طرح وہ مسولینی کی طرح ایک انقلاب کے ذریعے نظام کو تخت سے محروم کرنے کی فکر میں ہیں اور یہ بات نظام کے دماغ میں بیٹھ گئی کیوں کہ دروغ گوئی، سفلہ نوازی سازشی ذہن، شکی مزاجی اور امور مملکت سے زیادہ ارباب نشاط سے تعلق و دلچسپی کے باعث نظام صرف ایک بہادر یار جنگ کی شخصیت سے بے حد خائف تھے، اس مرد حر کی جرأت و بے باکی، ان کی قلوب پر حکومت، ان کے کردار کی عظمت کے قد کے آگے نظام کی پستی، نظام کو کھائی جا رہی تھی وہ بھٹک کر نشۂ اقتدار کی راہوں میں، عقل سے انتظام لینے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہے تھے۔ وہ نظام جس کی رعایا اپنے بادشاہ کی پرستش کرتی تھی۔ جسے "خداوند" کہا جاتا تھا۔ اور معصوم بچے ہر روز درس شروع ہونے سے قبل خالق کائنات سے یہ دعا مانگتے تھے کہ یہ ریاست تا ابد قائم رہے اور میر عثمان علی خاں کو بصد اجلال اللہ سلامت رکھے، وہ نظام یہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ بہادر یار جنگ کھلے عام یہ اعلان کریں کہ

ہم دکن کے بادشاہ ہیں

وہ نہیں تو ہم نہیں، ہم نہیں تو وہ نہیں۔

بس جسٹس ہاشم علی خاں کے گھر دعوت ہوئی، دعوت میں عداوت کا اہتمام ہوا اور نظام والی ریاست کی ایما کے بغیر بہادر یار جنگ کی شہادت کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ ؎

کئی ذہن رسا پردے کے پیچھے کام کرتے ہیں؛ وہی قاتل نہیں جو لیکے خنجر سامنے آئے

دکن کے مسلمانوں کے اور خدا کے درمیان نظام کی کنگ کوٹھی ہمیشہ حائل رہی نظام کو سلطنتِ آصفیہ کے پرچم کی حفاظت منظور تھی اور بہادر یار جنگ عبدِ نظام نہیں عبدِ اللہ تھے۔ ؎

فتنہ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

نظام نے بڑے سلیقے سے انتقام لیا اور عداوت کی میراث کی امانت کا حق ادا کیا ؎

اس سلیقے کی عداوت کہیں دیکھی نہ سنی
تو زمانے کا عدو، دوست زمانہ تیرا

شاہ خوف کے پروردہ ہوتے ہیں تب ہی تو ؎

سانپ ڈرتا ہے تو ڈستا ہے سپیرے ہی کا ہاتھ
اور یہ انسان بھی تیرے خوف کا پروردہ ہے

تاریخ کے صفحات پر کیا کچھ نہیں ملتا۔ شاہوں نے اکثر نیک نفس انسان کی توقیر کو اپنی تذلیل جانا، ہر دور میں شاہوں کے روبرو چند ایسی قابل عظمت ہستیاں رہی ہیں جن کو وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے اپنا محکوم و مسخر دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ایسی عظیم ہستیوں کو کبھی بھی دولت اور اقتدار کی لالچ سے یا اقتدار کے مقتدر ہاتھوں کے ذریعے بے اختیار نہ کیا جاسکا، ان کے حوصلوں اور ولولوں اور ان کے ایمان کو خریدا نہ جاسکا اور ان عظیم ہستیوں کی عزت نفس نے اس خریدی کے سودے کو قبول نہ کیا تو سازشوں ظلم و استبداد کے سہارے اس آواز کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا گیا جو حق کی آواز تھی، تاریخ کے خاموش صفحات سے جن مجاہد مظلومین کے کرب کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، وہ ہر دور میں اپنے جانشیں پیدا کرتی رہی ہیں اور ان کا خون ہتھیلی پر چراغ حق کا دیا جلاتا رہا ہے۔

؎ لے کے نکلے گی ہر ایک بوند ہتھیلی پہ چراغ

اور جس چراغ حق کی روشنی سے حق پرستوں کو دار و رسن کا راستہ ملتا رہا ہے اور ملتا رہے گا۔

تاریخ کے ہر دور میں قاتل فکر، مفکرین قوم، عمائدین و مجاہدین کا پیچھا کرتی رہی ہے۔ اور ہوس پرور آگ کے شعلوں میں عظمتوں کے میناروں کو جھونک دیا جاتا رہا ہے ؎

سب سے منصور کی تقلید نہیں ہو سکتی
اس قدر سخت ہے یہ مرحلہ دار کہ بس

وہ مرد حر تھا۔ دکن کا بے تاج ٹیپو، جس کی حکومت دلوں پر تھی جو اعلاء کلمۃ الحق کے لئے راہ کی آزمائشوں سے بے نیاز تھا، اسے شاہی آبرو کی شکنوں اور راہ کی صعوبتوں کی پرواہ نہ تھی اور نہ ہی راہ صداقت میں جان سے جانے کا ڈر، وہ ہر خطرے سے مقابلے کیلئے تیار تھا لیکن راہِ حق سے منہ موڑنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ راہ حق میں مر مٹنے کو ہی وہ ماحصلِ زندگی سمجھتا تھا "آپ کو یقین نہ کرنے کا اختیار ہے لیکن گواہ رہیئے کہ بہادر خاں کے ہاتھ ہتھکڑیوں کے اور پاؤں بیڑیوں کے، گردن طوق کے اور سینہ گولیوں کا منتظر ہے"۔ (ارشاد قائد ملت)

"وہ آنکھ جو جذبوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتی کہ جب ظلمتیں، سحر کے جلوؤں کے درمیان حائل ہونا چاہتے ہیں تو قانون قدرت کے مطابق سحر کے جلوے پوری آب و تاب سے ظلمتوں پر چھا جاتے ہیں اور حادثے جب ظرف و نظر کا امتحان لیتے ہیں تو مردانِ حر کے حوصلے پست نہیں ہو جاتے۔ یہ مشکلات ان کے دل کا حوصلہ بڑھانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں"

(آواز دوست از مختار مسعود)

آزمائش کی بابت اس مرد حر نے جواباً کیا کہا تھا جب کہ مال و منال

اور جاگیر اور منصب سے یہ مردِ حق سبکدوش ہو چکا تھا اور اب جان کی باری تھی۔

"مجھے دھمکایا جارہا ہے، مجھے ڈرایا جارہا ہے۔ میں بتادینا چاہتا ہوں کہ نہ جان میری ہے اور نہ مال میرا، سب اللہ کا ہے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ط"

پروردگار کے فضل سے جنوبی ہند سے دین کے دو سپاہی راہِ حق کے میدان میں العظمۃ للہ کا پیام لے کر ابھرے۔ ان میں ایک سلطان المجاہدین ابوالفتح ٹیپو سلطان تھے اور دوسرا مجاہد ___________ محمد بہادر خاں

مگر جنوبی ہند ہی کی ریاست کے حکمراں نے سامراجیوں کا ساتھ دے کر ٹیپو سلطان کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ اور ٹیپو سلطان شہید ہوئے، اس طرح آصف جاہی حکمرانوں نے دکن کے مسلمانوں کے سروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیچا کر دیا اور دکن کی تاریخ اس غدارِ قوم آصفی حکمراں کے باعث داغدار ہوئی۔ اور دور آصف جاہی کے آخری فرماں روا نواب میر عثمان علی خاں نے خونِ ٹیپو کی آبرو نواب بہادر یار جنگ کو برطانوی سامراج اور اپنے درباری سازشیوں کی مدد سے ۲۵ رجون ۴۴ء کی شام پراسرار طریقے پر جامِ شہادت سے ہمکنار کر دیا۔

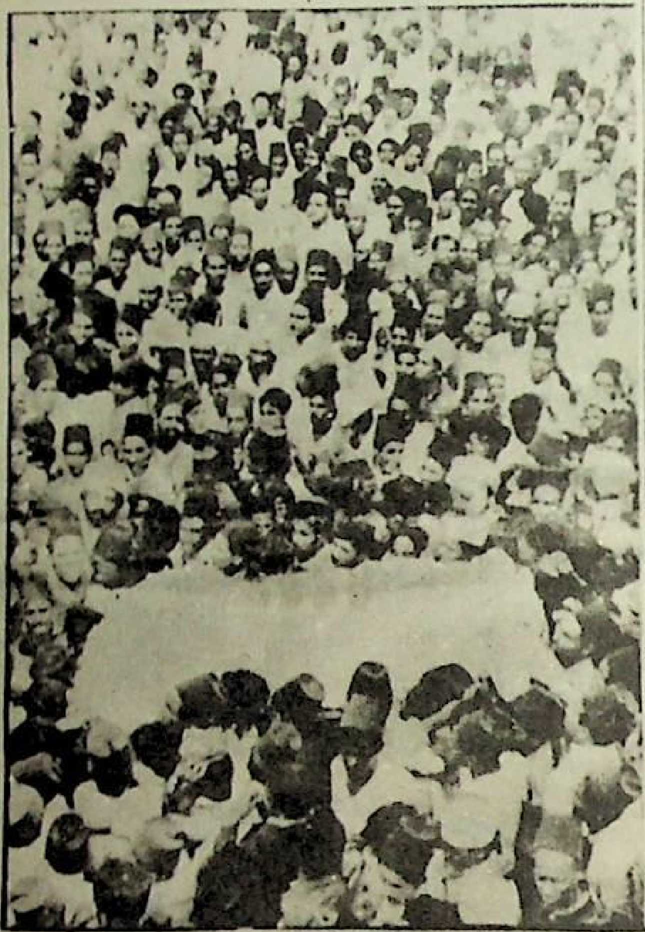
دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کے چہرے اُتر گئے اور ان کے قلوب ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مدفن بن گئے۔

نظام کی جفا کار ظلمت نوازیوں نے بیسویں صدی کے آخری مجاہدِ اسلام کو قبر کے نادیدہ اندھیروں کی نذر کر دیا کہ ؎ یہ رسمِ وفا سبطِ پیمبر سے چلی ہے۔

ذوقِ نظر بہ لذتِ کاوش نہ می رسد ؂ داغم ازیں کہ دل نتواں کرد دیدہ را

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَھُمْ یُرْزَقُوْنَ۔

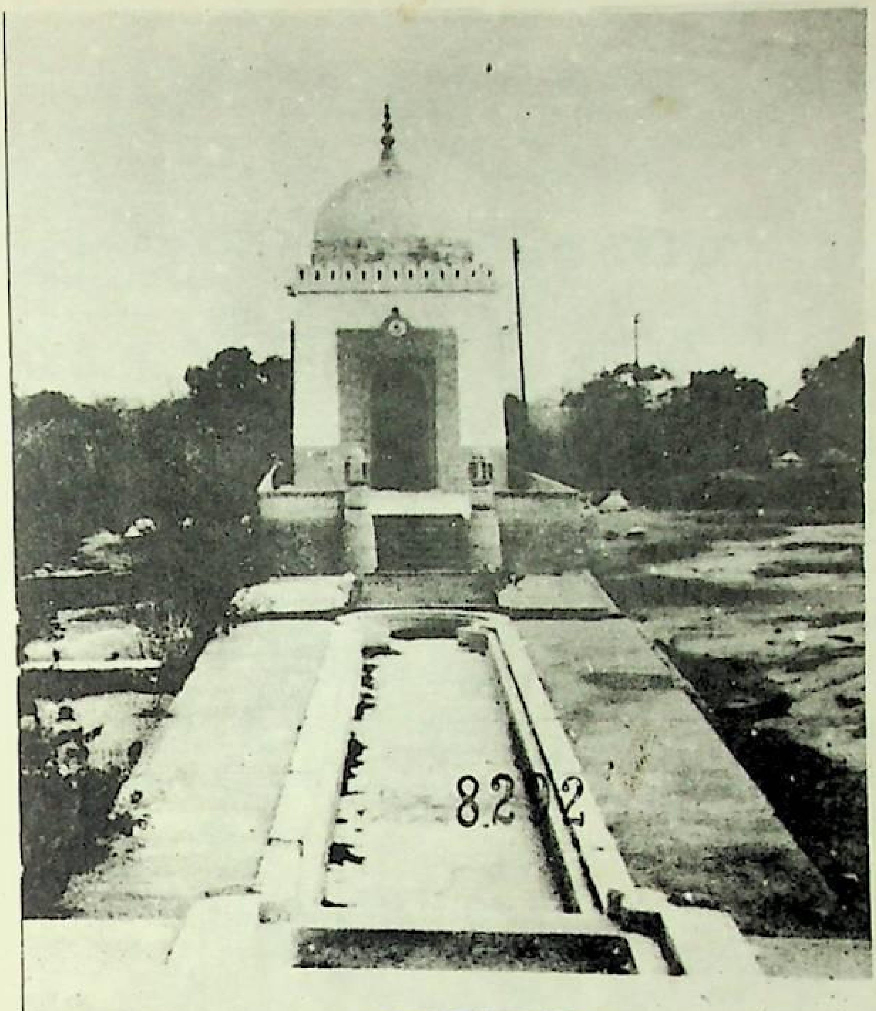
ترجمہ: جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے ان کو مُردہ مت سمجھو بلکہ وہ اپنے پروردگار کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق عطا کیا جاتا ہے۔ (القرآن)



نواب بہادر یار جنگ کی میت کا جلوس

جلوسِ جنازہ

لپکے نکلیں گی ہر ایک بوند ہتھیلی پہ چراغ



آخری آرام گاہ

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے